سالنامہ ۲۰۱۱ء

اُردو ادب میں عالمی معیار کا تحقیقی و تخلیقی مجلہ
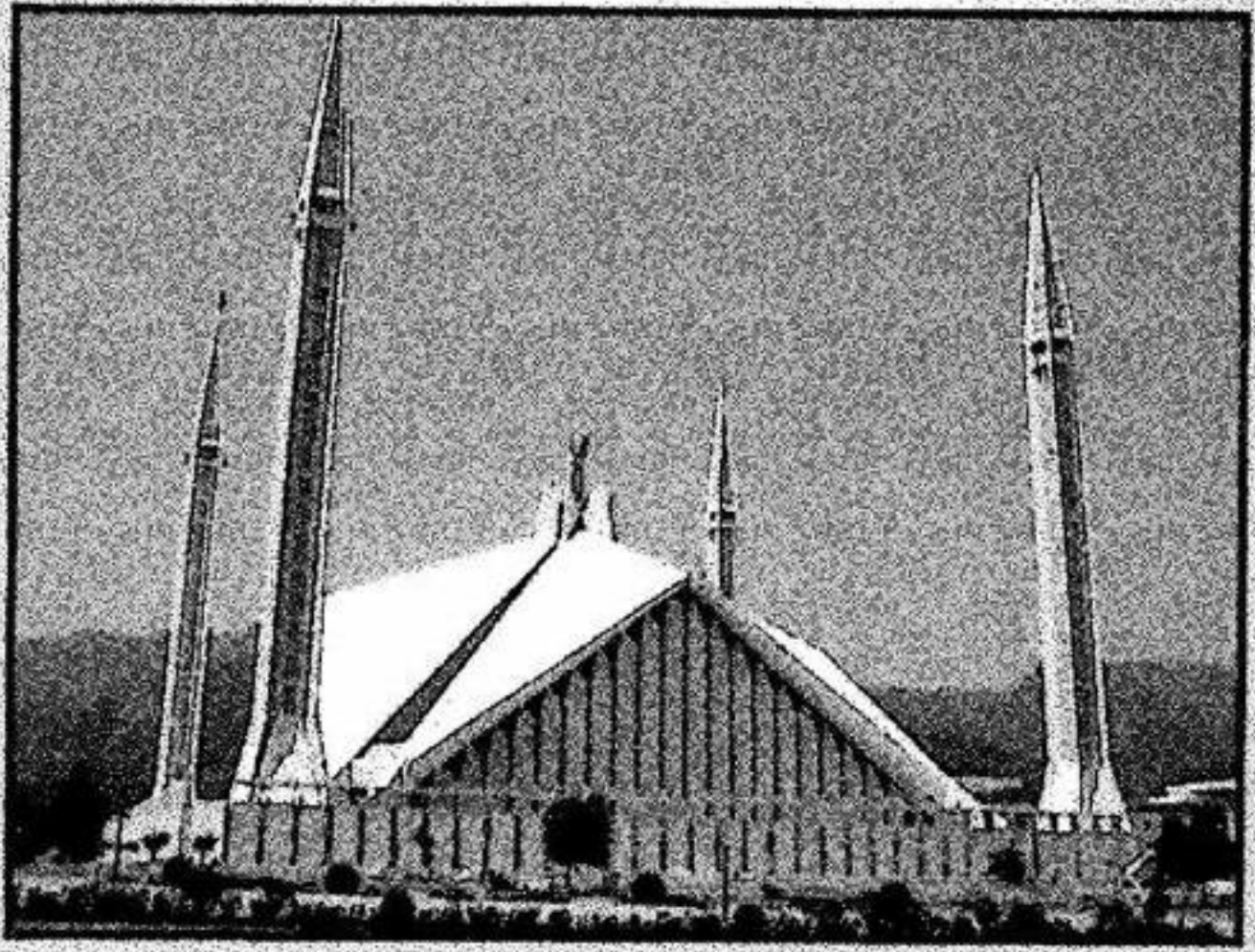
الاقرباؔ

اسلام آباد

الاقربا فاؤنڈیشن اسلام آباد

سہ ماہی **الاقرباء** اسلام آباد

(تہذیب و معاشرت، علم و ادب اور تعلیم و ثقافت کی اعلیٰ قدروں کا نقیب)

جلد نمبر ۱۴ شمارہ نمبر ۱ ، ۲ جنوری۔ مارچ/اپریل۔ جون ۲۰۱۱ء

الاقرباء فاؤنڈیشن، اسلام آباد

مکان نمبر ۴۶۴، سٹریٹ نمبر ۵۸، آئی ۸/۳، اسلام آباد (پاکستان)

Ph.051-4442686 Fax 051-2221670

website www.alaqreba.com

E-mail alaqreba@hotmail.com

بیرون ملک معاونین خصوصی

بیرسٹر سلیم قریشی

2-A Barclay Chamber, Barclay Road, Leytonstone
London, E-11. 3 DG (U.K.)
Phone (0208)5582289, Fax (0208)5583849
Email: Qureshi@ss/life .co.uk

پروفیسر محمد اویس جعفری

3202, 140th street, SE
Mill Creek WA 98012- 4677 (USA)
Phone: (001) 425-385-8666
E-mail: Jafreyomi@gmail.com

زرِ تعاون

فی شمارہ / سالنامہ	۲۰۰ روپے / ۴۰۰ روپے
سالانہ (مع محصول ڈاک)	۸۰۰ روپے
بیرون ملک فی شمارہ (مع محصول ڈاک)	۹ / ڈالر ۷ / پاؤنڈ
بیرون ملک سالانہ (مع محصول ڈاک)	۳۶ / ڈالر ۲۸ / پاؤنڈ

کوائف نامہ

شمارہ جنوری۔ مارچ / اپریل۔ جون ۲۰۱۱ء
طابع ضیاء پرنٹرز، اسلام آباد
ناشر سیّد ناصر الدین

تصویر سرورق

فیصل مسجد، اسلام آباد

مندرجات

نمبر شمار	عنوان	مصنف	صفحہ
۱	جنوبی ایشیا میں ادبی میلوں کی یلغار	اداریہ	۷

مضامین و مقالات

نمبر شمار	عنوان	مصنف	صفحہ
۲	شبلی نعمانی کی شاعری میں تُرک اور تُرکی	پروفیسر ڈاکٹر خلیل طوقار	۱۱
۳	سرسیّد اپنے مکاتیب کے آئینے میں	پروفیسر ڈاکٹر محمد زاہد	۲۸
۴	برصغیر میں گنگا جمنی تہذیب کے محرّکاتی عوامل	پروفیسر ڈاکٹر نسیم ۔ اے ہائنز	۳۴
۵	شاعرِ تصوف و معرفت ۔ حضرت خواجہ میر دردؒ	محمد انور معین زبیری مجدّدی	۴۷
۶	سید علی غمگین کا فارسی خط غالب کے نام	پرتو روہیلہ	۷۷
۷	عرشی امرتسری و علامہ اقبال کے مباحث اور عرشی کی تاریخ گوئی	سید انتخاب علی کمال	۹۳
۸	ثقافت اور مسلمانوں کا ثقافتی ورثہ	پروفیسر پروین صادق	۹۹
۹	خسرو شریں مقال	عقیل دانش	۱۱۲
۱۰	جون ایلیا ۔ تنہائیوں کا رسن بستہ شاعر	عابدہ تقی	۱۱۸
۱۱	اردو شاعری میں ایہام گوئی	فضہ پروین	۱۲۷

اقبالیات

نمبر شمار	عنوان	مصنف	صفحہ
۱۲	علامہ اقبالؒ کی نفسیات	ڈاکٹر راہی فدائی	۱۳۶
۱۳	اقبال اور مغربی مفکر نطشے	سیّدہ نغمہ زیدی	۱۴۴
۱۴	علامہ اقبال کی شخصی نظموں کا تسلسل:	محمد فیصل مقبول عجز	۱۵۴

تعلیم و تعلّم

۱۵ ہمارا تعلیمی محاذ اور موجودہ صورتحال — پروفیسر ڈاکٹر محمد معز الدین — ۱۶۷

آئینہ تاریخ

۱۶ سلطنت عثمانیہ کے بانی عثمان خاں کا خواب اور مورخین — محمد طارق غازی — ۱۷۲

۱۷ ہند آریائی تہذیب کا تاریخی پس منظر اور دیومالائی شخصیات — شفق ہاشمی — ۱۸۴

گوشۂ فیض احمد فیض

۱۸ فیض احمد فیض کی شاعری میں کرب ذات کا احساس — ڈاکٹر یاسمین سلطانہ — ۱۹۷

۱۹ نقش فریادی۔۔ جذباتیت ورومانیت کا مجموعہ — رضیہ مشکور — ۲۱۴

ادب اور مذہب

۲۰ اسلام اور شعروشاعری — سید محمد سلیمان — ۲۲۰

۲۱ فقر کیا ہے۔۔ ایک مختصر جائزہ — محمد اویس الحسن خاں — ۲۳۰

سفرنامہ۔ انشائیہ۔ افسانہ۔ کہانی۔ طنزومزاح

۲۲ الوداع اے شہر دلبر الوداع (سفرنامۂ حج) — پروفیسر ڈاکٹر عاصی کرنالی — ۲۳۶

۲۳ خوش رہنے کی ذمہ داری کے زاویے (انشائیہ) — سیّد مشکور حسین یاد — ۲۴۲

۲۴	کیسا آدمی تھا وہ (افسانہ)	سلیم زاہد صدیقی	۲۴۹
۲۵	کرب (کہانی)	طارق بن عمر	۲۵۷
۲۶	اردو کا ب قاعدہ (طنز و مزاح)	سلیم زاہد صدیقی	۲۶۳

گوشۂ رفتگاں

۲۷	ڈاکٹر عاصی کرنالی ۔۔ پیکرِ اخلاق و محبت	پروفیسر شارق جاوید	۲۷۵
۲۸	صحرا میں تاج محل	پروفیسر طارق پرویز	۲۸۶
۲۹	میرا اہم سفر	ثمر بانو ہاشمی	۲۸۸
۳۰	میرے ابو کیسے ہیں!	بینش بتول	۲۸۹
۳۱	ڈاکٹر وزیر آغا ۔۔ ذاتی تعلق کی ایک جہت	پروفیسر غلام جیلانی اصغر	۲۹۰
۳۲	ڈاکٹر وزیر آغا سے پہلی ملاقات	ڈاکٹر انور سدید	۳۰۰
۳۳	ہمدم دیرینہ ۔ محمود اختر سعید	بیرسٹر سلیم قریشی	۳۰۶
۳۴	ایک غم گسار دوست کا سفرِ آخرت	پروفیسر اقبال گل	۳۱۵
۳۵	اظہار عقیدت (تاریخ ہائے وفات)	سید انتخاب علی کمال	۳۱۷
۳۶	حمد و نعت		۳۲۰

حمد و نعت

حضرت حسان بن ثابتؓ ۔ سر سیّد احمد خانؒ ۔ محمد ادریس جعفری ۔ عقیل دانش
محمد طارق غازی ۔ شفق ہاشمی ۔ سلمان غازی ۔ سید محمد حسن زیدی ۔ عظمت کمال ۔
شارق جاوید ۔ ڈاکٹر مظہر حامد ۔ جاوید بدایونی ۔ زہیر کنجاہی ۔ حبیب اللہ بخاری

۳۷	غزل		۳۳۲

غزل

محمد طارق غازی ۔ امین راحت چغتائی ۔ سیّد مشکور حسین یاد ۔ محشر زیدی ۔ مضطر
اکبر آبادی ۔ خالد حسن قادری ۔ صابر عظیم آبادی ۔ حسن عسکری کاظمی ۔ محمود رحیم ۔

کرامت بخاری۔ شفق ہاشمی۔ ظفر اکبر آبادی۔ عقیل دانش۔ انور جہاں برنی۔
سید صفدر حسین جعفری۔ ڈاکٹر مظہر حامد۔ زہیر کنجاہی۔ سلیم زاہد صدیقی۔ انوار فیروز۔ صوفیہ انجم تاج۔

۳۸ **نظم** ۳۴۸
اقبال گل۔ شفق ہاشمی۔ کرامت بخاری۔ صوفیہ انجم تاج۔ امین راحت چغتائی

۳۹ **رباعی۔ قطعہ** ۳۵۲
صابر عظیم آبادی۔ شفق ہاشمی۔

۴۰ **نقد و نظر** ۳۵۴
سید منصور عاقل۔ پروفیسر اقبال گل۔ نعیم فاطمہ علوی

۴۱ **مراسلات** ۳۶۵
محمد طارق غازی۔ عقیل دانش۔ ڈاکٹر انور سدید۔ بیگم عارفہ صلاح الدین۔ رضیہ مشکور۔ نغمہ زیدی۔ امین راحت چغتائی۔ محمد فیصل عجز۔ عبدالوہاب خان سلیم۔ احتشام الحق تھانوی۔ کرامت بخاری۔ خواجہ مشتاق حسین۔ شجاع طلعت۔ پروفیسر زہیر کنجاہی۔ ڈاکٹر حامد ہاشمی۔ طاہر نقوی۔ مشتاق احمد چوہان۔ قاسم محمود احمد۔

خبرنامہ الاقرباء فاؤنڈیشن

۴۲	احوال و کوائف	شہلا احمد	۳۸۹
۴۳	برطانیہ کی سیاحت۔ تہذیبوں کے درمیان فاصلے (سفرنامہ)	نعیم فاطمہ علوی	۳۹۵
۴۴	گھریلو ٹوٹکے	بیگم طیبہ آفتاب	۴۰۳

اداریہ

جنوبی ایشیا میں ادبی میلوں کی یلغار

جسے بین الاقوامی ذرائع ابلاغ نے 9/11 کے سانحہ کا نام دیا وہ نقطۂ آغاز تھا ایک ایسے عالمی خلفشار کا جس نے تہذیبی و معاشرتی، مذہبی و سیاسی اور فکری و نظریاتی محرکات کو بے رحم عسکریت کے سپرد کر دیا۔ قرائن و آثار ثابت کر چکے ہیں کہ پس منظر تہذیبی تصادم اور تعصب و منافرت کے متعفن رویوں سے بُری طرح آلودہ ہے۔ ایوبی فتوحات اور صلیبی عہد نے جس سفّاک انتقامی جذبے کو جنم دیا تھا وہ 9/11 کے بعد آتش فشاں بن کر پھٹ پڑا ہے اور مہلک ترین اسلحہ سے لیس مغرب بزعمِ خویش ارفع و اعلیٰ طاقتی مرکز بن جانے کے نشہ میں مشرق، بالخصوص ایک ایسے نظریۂ حیات اور دینِ امن کے خلاف صف آراء ہو چکا ہے جس کی ابدی حقانیت اور عالمگیر صداقت سے وہ خائف بھی ہے اور غضب ناک بھی۔

چنانچہ اس خوف اور غیض و غضب کا اظہار کہیں برملا ہے اور کہیں پس پردہ۔ جہاں رزم آرائی ہے وہیں بزم آرائی بھی ہے۔ بزم آرائی بین السطور حکمتِ عملی کا حصّہ ہے جو طویل مُدتی ہونے کے باوجود مستحکم و پائیدار نتائج حاصل کرنے کا ذریعہ ہوتا ہے بہر حال

بہر رنگے کو خواہی جامہ می پوش   من اندازِ قدت را می شناسم

ادب و ثقافت ایسی بزم آرائی کے لیے موثر ترین اور بظاہر مہذب و پسندیدہ مواقع مہیا کرتے ہیں۔ ادبی تقاریب ہوں یا انھیں ادبی میلے (Festivals) کہا جائے کسی بھی معاشرے کی ذہنی و فکری نشو و نما میں اہم کردار ادا کرتے ہیں اور ادب وہ ذریعۂ اظہار ہے جو تہذیبوں اور ادیان کو فروغ بھی دیتا ہے اور مسمار بھی کرتا ہے۔ ہندوستان میں بین الاقوامی ادبی میلوں کا آغاز ۲۰۰۶ء میں ہوا اور اس کے بعد سے ۲۰۱۱ء تک پانچ دن تک مسلسل جاری رہنے والے یہ میلے ہر سال ۲۱ سے ۲۵ جنوری تک دہلی کے متصل شہر جے پور میں منعقد ہوتے رہے جو

راجستھان کی ایک ریاست تھی۔ ایک غیر سرکاری تنظیم ''جے پور وراثت فاؤنڈیشن'' کے زیر اہتمام ان میلوں کا آغاز ہوا۔ سالِ رواں کے میلے کو جنوبی ایشیا کا سب سے بڑا کتابی میلہ قرار دیا گیا جس کے قومی اور بین الاقوامی شرکاء میں ترک مصنف اُرحان پاموک جسے اپنے ہم وطن ترکوں کے آرمینیا کے عوام پر ''مظالم'' بے نقاب کرنے پر نوبل انعام عطا کیا گیا جبکہ رُسوائے زمانہ شاتمِ رسولؐ سلمان رُشدی ۲۰۰۷ء کے میلے میں شریک تھا ایسے لوگوں کی شرکت کے پسِ پردہ مقاصد کسی تبصرے کے محتاج نہیں۔ ہندوستان میں ان میلوں کی تاریخ بتاتی ہے کہ بین الاقوامی شراکت و تعاون سے ان میلوں کی وسعت و معنویت میں تیزی سے اضافہ ہوتا رہا یعنی ۲۰۰۶ء کے میلے میں صرف ۱۸ اہلِ قلم شامل ہوئے تھے اور ناظرین و سامعین کی تعداد ۱۰۰ سے متجاوز نہ تھی جبکہ ۲۰۰۷ء اور ۲۰۰۸ء کے میلوں کے بعد ۲۰۰۹ء میں مقررین و مصنفین کی تعداد ۱۴۰ اور ناظرین و سامعین کی تعداد بارہ ہزار تک پہنچ گئی۔ ان مواقع پر جن اصنافِ ادب و ثقافت پر تقاریب منعقد کی گئیں ان میں شاعری۔ موسیقی۔ رقص۔ مباحثے۔ مذاکرے اور ورکشاپس وغیرہ شامل ہیں۔

سابق جے پور ریاست کے انیسویں صدی کے تاریخی ''ڈگی پیلیس'' میں منعقد ہونے والے سالِ رواں کے میلے کا نمایاں رجحان نسل پرستی اور سامراجیت کے حوالے سے مقالات و تقاریر کا ایک سلسلہ تھا۔ مسلم اکثریتی مقبوضہ کشمیر کے چودھویں صدی سے ابتک کے قیمتی ادبی ورثے کا عالمی منظرنامے سے اوجھل ہو جانا ایک المیے سے کم نہیں جس کا ایک سبب عالمی زبانوں بشمول انگریزی زبان میں تراجم کا فقدان ہے۔ غنی کاشمیری جیسی عظیم ہستیاں تاریخ کی گرد میں روپوش ہو کر رہ گئی۔ غنی کے بارے میں جس کی وفات (۱۶۶۱ء) صرف ۳۹ سال کی عمر میں ہوئی اور جو ہندوستان کی فارسی شاعری میں خاص طرز کا موجد اور مثالیہ نگاری میں یکتا تھا مولانا شبلی نعمانی لکھتے ہیں:

''مثالیہ مضامین پہلے بھی خال خال پائے جاتے تھے لیکن کلیم، مرزا صائب اور غنی نے گویا اس کو ایک خاص فن بنا دیا۔''

یہاں غنی کاشمیری کے دو خوبصورت اشعار کا حوالہ بے محل نہ ہوگا۔

آسودگی بگوشۂ ہستی ندیدہ ایم جاں دادہ ایم و کنجِ مزارے خریدہ ایم

در عالمِ مثال مثالت بنودہ است ہر چند کز دریچۂ آئینہ دیدہ ایم

ہندوستان کے ان میلوں میں ایسے پاکستانی فنکار اور ایسی شخصیات بھی شریک تھیں جو اپنی شناخت آپ ہیں۔ ان ناموں میں شامل چند یہ ہیں۔ مونی محسن۔ کاملہ شمسی۔ شاہ بانو بلگرامی۔ ندیم اسلم۔ محمد حنیف۔ دانیال معین الدین۔ سلیمہ ہاشمی۔ علی سیٹھی۔ اسماء جہانگیر۔ شوکت شورو اور قوالوں میں عبداللہ منظور نیازی۔ حضرت میاں میرؒ کے روضہ پر قوالی پیش کرنے والے قوال اور سلمان احمد (جنون گروپ) شریک تھے۔ مقامی ادب وثقافت اور عقیدہ و مذہب پر یلغار کا یہ سلسلہ ۲۰۱۰ء میں اپنے اصل ہدف یعنی پاکستان پہنچ گیا لیکن یہاں اہتمام وانصرام مغربی اداروں نے اپنے ہاتھ میں رکھا۔ چنانچہ ۲۰ اور ۲۱ مارچ ۲۰۱۰ء کے ادبی میلے (Literature. Festival) کے حوصلہ افزا انعقاد کے بعد جس میں پاکستان۔ برطانیہ۔ امریکہ اور انڈیا سے تیس اہلِ قلم اور فنکارروں نے شرکت کی۔ برٹش کونسل اور آکسفورڈ یونیورسٹی پریس کے کارپردازوں نے جناب اسلم فرخی کی معیت میں ۵ اور ۶ فروری ۲۰۱۱ء کو دوسرے ادبی میلے کے انعقاد کا اعلان فرمایا اور کراچی شہر سے میلوں دور بلکہ پبلک ٹرانسپورٹ کی حدود سے بھی خاصے فاصلے پر کارلٹن ہوٹل کو میلے کے پروگراموں کے لیے منتخب کیا۔ بہرحال میلے کے انعقاد کا جو مقصد بتایا گیا وہ یہ تھا کہ ملک کے ابھرتے ہوئے فنکاروں ادیبوں اور شاعروں کو عالمی منظرنامے پر متعارف کرایا جائے گا۔ اس سلسلہ میں آکسفورڈ یونیورسٹی پریس کی امینہ سیّد صاحبہ برٹش کونسل کے سید مشہود رضوی صاحب نے بلند بانگ تقاریر بھی فرمائیں چنانچہ میلے کے رنگارنگ پرورگراموں میں مذاکرے اور مباحثے۔ تخلیقی ادب نگاری، ورک شاپس اور کتابوں کی رونمائی میں پاکستان۔ برطانیہ۔ امریکا اور انڈیا کے مشاہیر ادب وفن نے حصہ لیا۔

نمایاں شخصیات میں کرن آرمسٹرونگ نمایاں ترتھیں جو اپنی تصانیف مثلاً دردمندانہ زندگی کی طرف بارہ قدم (Twelve steps to a compessinate life) تاریخ معبود (A History of God) اور تقابلی مذاہب (Comparative Religions) نیز

دیگر کتب کے لیے عالمگیر شہرت رکھتی ہیں ان کے علاوہ افسانہ نگار دانیال معین الدین۔ ناول نگار کاملہ شمسی۔ احمد رشید جن کی تصانیف ''طالبان'' اور ''عسکریت پسند اسلام (Militant Islam) وسط ایشیا میں تیل اور بنیاد پرستی ، (Oil and fundamentalism in Central Asia) شہرت یا رسوائی کے نقطۂ عروج کو پہنچ چکی ہیں۔ میلے کا ہمیشہ کی طرح مقبول ترین روایتی پروگرام مشاعرہ تھا بہر حال ادب و شعر کے دیگر ناموں میں امجد اسلام امجد، انتظار حسین، زہرہ نگاہ، افتخار عارف، حسن منظر، زاہدہ حنا، اسد محمد خاں اور کشور ناہید کے اسماء بھی شامل تھے۔ انتظار حسین نے اس میلے میں بچے کی بات یہ کی کہ ''پاکستان کے منظر نامے پر اُبھرنے والی دو طاقتیں ہیں، خواتین اور مُلاّ'' اب نہیں معلوم کہ مُلاّ اکا استعارہ اسلام کی نمائندگی کرتا ہے یا کچھ اور کیونکہ مُلاّ ہمارے معاشرے کا کوئی نیا کردار نہیں حکیم الامت حضرت علامہ نے تو ہمیشہ اس کردار کو اس کی غلو پسندی اور اسلام کے حقیقی سیاق و سباق کے حشو و زوائد کے زمرہ میں رکھا ہے۔ اس میلے کے ایک اجتماع میں جس میں مغربی لادینیت کے تناظر میں اسلام کو رمز و کنایہ کی زبان میں عسکریت پسند ٹھہرایا جا رہا تھا وہاں ایک حق پرست آواز بھی بلند ہوئی تھی کہ ''ہم یہ سننے کے لیے بھی گوش بر آواز ہیں کہ ہمارا دین امن کا دین ہے۔'' لیکن جن مقرروں کو ''آزادیٔ تقریر'' عطیہ کی گئی ان میں یہ تلقین کرنے والی مصنفہ آرمسٹرونگ بھی تھیں کہ پاکستانیوں کو ''ہمدردی کا برتاؤ'' (Compassionate behaviour) اختیار کرنا چاہیئے۔ کیا یہ الزام تراشی کا ایک بالواسطہ انداز نہیں تھا؟ یہی نہیں بلکہ احمد راشد نے طنز و استہزاء کا تند و تیز نشتر چلاتے ہوئے کہا کہ حکومت پاکستان کو سابق گورنر سلمان تاثیر کے قاتل کے خلاف مقدمے میں استغاثہ کا موقف پیش کرنے کے لیے کوئی وکیل تک میسر نہیں آیا۔ ہُود بھائی نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ ایک طوفان (Tsunami) ہماری طرف بڑھ رہا ہے اور پاکستان عدم اطمینان و اضطراب کا ایک کھولتا ہوا لاوا بن چکا ہے۔ (Pakistan- a seething Mass of discontent) خدا کرے ان شواہد کے باوجود ہمارا یہ گمان درست نہ ہو کہ:

''کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں''

پروفیسر ڈاکٹر خلیل طوقار (استنبول یونیورسٹی، ترکی)

شبلی نعمانی کی شاعری میں تُرک اور تُرکی

محمد شبلی نعمانی برصغیر کے ایک اور درخشاں نام، ترکوں کے ایک اور بڑے دوست اور عالمِ اسلام کے ایک بہت مخلص خدمت گزار! دراصل یہ عظیم شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں لیکن پھر بھی یہاں برسبیلِ یاددہانی اُن کی سوانح کی کچھ جھلکیاں پیش کی جاتی ہیں۔

محمد شبلی نعمانی، مئی ۱۸۵۷ء میں ضلع اعظم گڑھ کے نواح میں موضع بندول میں پیدا ہوئے۔ وہ نسلاً راجپوت تھے۔ اُنھوں نے ابتدائی تعلیم اپنے والد شیخ حبیب اللہ کی نگرانی میں حاصل کی۔ اُن کے والد ایک کامیاب وکیل تھے اور ایک زمیندار اور تجارت پیشہ خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ محمد شبلی نے کچھ عرصہ اعظم گڑھ کے عربی مدرسہ میں تعلیم حاصل کی اور پھر غازی پور میں مولانا محمد فاروق چڑیا کوٹی سے فلسفہ وادب کی کچھ کتابیں پڑھیں۔ چونکہ شبلی صاحب ابتدائی عمر میں سخت حنفی تھے لہٰذا اُن کے استاد محمد فاروق نے اُن کا لقب نعمانی رکھا۔ پھر کچھ عرصے کے لیے دیوبند میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد رامپور میں مولانا عبدالحق خیر آبادی سے معقولات، مولوی ارشاد حسین سے حدیث وفقہ، لاہور میں مولانا فیض الحسن سہار نپوری سے عربی ادب کے کچھ نمونے، سہارنپور میں مولانا احمد علی سہارنپوری سے حدیث اور ''سخن ترمذی'' کے اسباق پڑھے۔ ۱۸۷۶ء میں اپنے والد کے ساتھ حج کرنے گئے۔ حج سے واپسی کے بعد اہل حدیث کی رد میں دو رسالے قلمبند کیے۔ ۱۸۸۰ء میں اپنے والد کے اصرار پر وکالت کا امتحان پاس کیا۔ چونکہ وکالت کا پیشہ اُن کے لیے موزوں نہ تھا لہٰذا وہ اُسے ترک کر کے فروری ۱۸۸۱ء میں کلکٹرِ ضلع کی کچہری میں نقل نویس بنے۔ کچھ عرصے تجارت سے سروکار رکھنے کے بعد ۱۸۸۳ء میں علی گڑھ میں فارسی اور عربی کے استاد مقرر ہوئے اور سولہ سال تک اِسی خدمت سے منسلک رہے۔ علی گڑھ کے قیام کے دوران وہ سرسید، حالی اور پروفیسر آرنلڈ سے مستفید ہوئے۔ اُنہی دِنوں میں اسلام کی عظیم شخصیتوں کی مستند

سوانح عمریاں لکھنے لگے اور اُنھوں نے اس سلسلے کی دو کتابیں: ''المامون'' اور ''سیرۃ النعمان'' علی گڑھ ہی میں مرقوم کیں۔ مئی ۱۸۹۲ء میں روانہ ہو کر استنبول، شام، مصر جیسے مختلف اسلامی ممالک کا سفر چھ ماہ تک کیا اور ۱۸۹۴ء میں اپنے اِس سفر سے متعلق ''سفرنامہ مصر و روم و شام'' شائع کرادیا۔ ۱۸۹۴ء میں حکومت کی طرف سے اُنھیں شمس العلماء کا خطاب ملا۔

۱۸۹۶ء میں نواب وقار الملک کے عہدِ وزارت میں کچھ عرصہ دکن میں قیام کیا۔ مئی ۱۸۹۸ء میں علی گڑھ سے الگ ہو کر اعظم گڑھ گئے اور اِن دِنوں میں ''الفاروق'' کو لکھا۔ ۱۹۰۱ء میں حیدر آباد پہنچے اور وہاں محکمہ تعلیم سے منسلک ہوئے اور سلسلہ کتب آصفیہ میں ''الغزالی''، ''سوانح مولانا روم''، ''علم الکلام''، ''الکلام''، ''موازنہ انیس و دبیر'' شائع کرائیں اور ۱۹۰۳ء میں انجمنِ ترقی اردو کے پہلے سیکرٹری مقرر ہوئے۔ اُنھوں نے ندوۃ العلماء سے بھی کافی تعاون کیا لیکن چونکہ اُن کے اور اہلِ ندوہ کے مابین فکری اور ذہنی بُعد تھا اور مختلف باتوں پر اُن کی مخالفت ہو رہی تھی اِس لیے اُنھیں جولائی ۱۹۱۳ء میں ندوۃ سے الگ ہونا پڑا۔

لکھنو سے واپسی کے بعد اُنھوں نے اعظم گڑھ میں قیام کیا اور اپنی تمام تر کوششیں ''سیرت النبیؐ'' کی تکمیل پر مبذول کیں۔ اُنھوں نے ایک بڑی خدمت یہ بھی کی کہ مصنفوں کی ایک جماعت کو ترتیب دے کر 'دارالمصنفین' قائم کیا اور اپنا بیش بہا کتب خانہ اور کچھ جائداد اِس جماعت کے لیے وقف کر دی۔

شبلی نعمانی کو معدے کی شکایتیں تھیں اور اُنھوں نے اِس مرض کی وجہ سے ۱۸ نومبر ۱۹۱۴ء مطابق ذالحج ۱۳۳۲ء انتقال کیا اور شبلی منزل میں اُنھیں دفنا دیا گیا۔ (۱)

جس طرح کہ مندرجہ بالا سطور سے آشکار ہے، شبلی نعمانی عالم تھے، فاضل تھے، مصنف اور شاعر بھی تھے۔ اُن کے اِن خصائص سے متعلق مختلف مآخذ میں کافی معلومات موجود ہیں جن کی تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں ہے۔ یہاں ہمارا مقصد اُن کی شاعری میں ترکوں اور ترکی کے بارے میں اُن کے خیالات کا کچھ کھوج لگانا ہے۔

شبلی نعمانی کی کلیات میں ترکوں کے بارے میں جو نظمیں ملتی ہیں اُن میں اوّلین نظموں میں سے ایک ''تمہید قصیدہ مدح سلطان عبدالحمید خان'' کے عنوان سے ہے۔ ہر چند اُس عہد میں ترکی میں ہونے والے واقعات سے متعلق معلومات پیش کرنے کی ضرورت نہیں رہی ہے لیکن پھر بھی یہاں آ کر اِس نظم کو پیش کرنے سے قبل عبدالحمید ثانی کے بارے میں کچھ بتانے کو لازم وملزوم سمجھتا ہوں۔ اِس کا سبب یہ ہوا کہ شبلی نعمانی کے بارے میں لکھتے ہوئے حسبِ معمول اُس وقت کی یادوں کو جلا بخشنے کے لیے اُس زمانے کی معروف تحریک ''تحریک خلافت'' سے متعلق قاضی محمد عدیل عباسی صاحب کی تصنیف کا مطالعہ کر رہا تھا تو اُن کی تصنیف میں سلطان عبدالحمید ثانی کے بارے میں یہ پیراگراف میری نظر سے گزرا۔ وہ پیراگراف کچھ یوں تھا:

''یہی حال سلطان عبدالحمید کا تھا۔ انگریزوں نے اُس کو غلام بنایا۔ ترکی کا ایک ایک ذرہ رہن کر دیا۔ فوج میں عیسائی بھر گئے تو جدید طریقہ حرب کو نظر انداز کر کے عسکریت کا خاتمہ کر دیا۔ درّہ دانیال کے قلعوں پر سے توپیں اور اسلحے ہٹا دیے۔ سب سے بڑا زمیندار بن بیٹھا۔ اصلاحات کی مخالفت کی۔ جس کسی نے اصلاح کی جانب توجہ دلائی اُسے روباہ صفت سلطان نے خاموشی سے قتل کرا دیا۔ مدحت کامل پاشا جیسے دانشور مصلح کے خون کے دھبّے سلطان عبدالحمید کے دامن پر ہیں۔ اور ایک مدحت کامل پاشا کیا کتنے ہی معصوم محبانِ وطن آقایانِ فرنگ کے اشارے سے اِس سلطان کے جور وستم کا نشانہ بنے۔ اُس کا دامن ہی نہیں اُس کا پورا جامہ معصوم بہی خواہانِ ملک وقوم کے خون سے رنگا ہوا تھا۔ اور یہ سب کیوں ہو رہا تھا؟ صرف اِس لیے کہ انگریز نہیں چاہتا تھا کہ ترکی میں کوئی اصلاح ہو، وہ چاہتا تھا کہ حکومت روز بروز زوال کی جانب رجوع کرتی جائے۔ اُسے تو اسلامی مرکزیت کا خاتمہ کرنا تھا اور عبدالحمید سب سے بڑا انگریز کا آلہ کار تھا۔ لیکن اُسے انگریز نے محافظِ اسلام مشہور کر دیا تھا اور بات اچھے اچھے لوگوں کے دلوں میں اتر گئی اور آج بھی ایسے لوگوں کی کمی نہیں جو اُسے عزت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔'' (۲)

اِس پیراگراف کو پڑھتے ہی مَیں چونک اُٹھا کہ یا یہ شخص جس کے بارے میں مذکورہ بالا سطور مرقوم کی گئیں وہ ہمارے سلطان عبدالحمید ثانی نہیں تھے یا اِن سطور کے راقم اُسی پروپیگنڈا کے شکار ہوئے تھے جو اِس سے دس پندرہ سال قبل تک ترکی میں بھی جاری تھا۔ درحقیقت اتحاد و ترقی پارٹی کے طرفداروں اور اُن مغربی طاقتوں کے منفی پروپیگنڈا نے اُن کے خلاف اِس قدر زبردست کارروائی چلائی تھی کہ اُن کے اثرات نے ابھی تک تاریخ کے مطلع کو ابرآلود رکھا ہوا تھا۔ دس پندرہ سال سے اُن کے اور اُن کے عہد کے بارے میں جو غیر جانبدار تحقیقات جاری ہیں اُن کے ذریعے یہ مطلع صاف ہونے لگا ہے کہ اُنھوں نے کیا عظیم الشان سیاست چلائی تھی اور اپنے ملک وملت کو تمام خطرات سے محفوظ رکھا تھا اور اتحادِ اسلام کے لیے کیا کیا کوششیں کی تھیں۔

اب سوچئے کہ ایک سلطان جو برسرِ اقتدار آتے ہی، نہ چاہنے کے باوجود ۱۲ اپریل ۱۸۷۷ء میں معروف مدحت پاشا، داماں محمود پاشا، ردیف پاشا کے اصرار سے اپنی سخت مخالفت کے باوجود روس کے خلاف جنگ کا اعلان کرنے پر مجبور ہو جس کے نتیجے میں مشرق میں ارضِ روم تک اور مغرب میں بلغاریہ سے لے کر استنبول کے نزدیک تک روسی فوج پہنچی تھی اور آخر کار سربیا، بلغاریہ، رومانیا کو آزادی اور بوسنیا اور البانیا کو نیم خودمختاری دی گئی۔ اُنہیں سلطان نے اِس درد ناک شکست کے بعد ہی اپنی فوج اور ملک کو سنبھال کر اپنی زیرک اور دُور اندیش پالیسیوں کے ذریعے آرمینین قوم پرستوں کی ترکی کے مختلف علاقوں میں بغاوتوں، جنگی پشت پناہی یورپ کی عظیم طاقتیں اُن میں بالخصوص برطانیہ موجود تھا، کی آگ کو بجھا دیا تھا۔ پھر یونان کی طرف سے عثمانی سرحدوں پر اچانک حملہ ہوا تو اُن کی دُور اندیشی اور قابلیت کی بنا پر یونانیوں کو شکست دی تھی۔ اُنھوں نے اِس طرح سے حکومتی اور اصلاحی تدابیر کی تھیں کہ اُن کے عہدِ حکومت کے خاتمہ تک یعنی تینتیس سال تک عثمانی سلطنت کو محفوظ رکھا اور اُسے نئی شکستوں سے بچایا۔ اتحاد و ترقی پارٹی نے یورپ سے مدد لے کر اور ارمنین، یونان، بلغاریا کے قوم پرستوں کی مدد سے جو کہ مملکتِ عثمانیہ کی تقسیم پر تلے ہوئے تھے، کامیاب ہو کر برسرِ اقتدار آئی اور سطان عبدالحمید کو ۲۷ اپریل ۱۹۰۹ء میں

خلع کر دیا گیا اور اتحاد و ترقی کے لیڈر جن میں طلعت پاشا اور انور پاشا اول اول تھے وہ ۱۹۰۹ء سے لے کر ۱۹۱۸ء تک اپنے نہہ (۹) سالہ اقتدار میں اِس عظیم ملک کو ٹکڑے ٹکڑے ہونے سے نہیں بچا سکے تھے۔ (۳) اوپر سے اُنھوں نے اپنے مخالفوں کو نیست و نابود کرنے کے لیے جو اقدامات کیے تھے اُن کی وجہ سے خود اتحاد و ترقی کے حامی اور کارکن بھی سہمے ہوئے تھے اور سلطان عبدالحمید کے عہد کو حسرت سے یاد کرنے لگے تھے۔ اُن میں سے ایک معروف مفکر اور شاعر سلیمان نظیف تھے وہ عبدالحمید کے دَورِ سلطنت کو یاد کر کے لکھتے ہیں۔ جس کا مفہوم کچھ یوں ہے:

"اے میرے بادشاہ کبھی یاد نہیں آئی تھی یہ بات لیکن اب ہم مدد مانگنے کے لیے تیرے حضور میں آ کر حاضر ہوئے ہیں اگر فریاد کریں تو اب کی حکومت قتل کرتی ہے ہم حسرت بھری نظروں سے آپ کی حکومت کی تلاش کرتے ہیں"

ترک تو ترک اجنبی سیاستدان بھی عبدالحمید ثانی کی اہلیت اور سیاسی دُور اندیشی کے معترف تھے۔ معروف جرمن سیاستدان اور جرمنی کے اتحاد کے بانی Bismarck نے اُن کے بارے میں کہا تھا: "اگر ساری دنیا میں سو گرام عقل ہے تو اِس کا نوے (۹۰) فی صد عبدالحمید خاں کے دماغ میں، پانچ فی صد میرے دماغ میں پانچ فی صد دنیا کے باقی سیاستدانوں میں ہے۔"

اِس لیے عبدالحمید ثانی کے حق میں بات کرنے والے اُس زمانے کے لوگ بچے تو نہیں تھے جو بہ آسانی کسی زیرک پروپیگنڈا کے زیرِ اثر رہیں۔ شبلی بھی شاید اُن لوگوں میں سے تھے جو عبدالحمید ثانی کے حق میں تھے۔ اِسی لیے اُنھوں نے مندرجہ ذیل قصیدہ لکھنا شروع کیا۔ یہ بس ایک تمہید ہے لیکن پھر بھی ہم عبدالحمید ثانی کے بارے میں ہونے کے سبب اُسے یہاں درج کرنا مناسب سمجھتے ہیں:

تمہید قصیدہ مدحِ سلطان عبدالحمید خان

۱۸۷۹ء

پھر بہار آئی ہے شاداب ہیں پھر دشت و چمن — بن گیا رشکِ گلستانِ ارم پھر گلشن

شعلہ زن پھر چمنستاں میں ہوئی آتشِ گل
پھر صبا چلتی ہے گلشن میں بچا کر دامن

آگ پانی میں لگا دی ہے کسی نے شاید
حوض میں عکسِ گل و لالہ ہے یا جلوہ فگن

باغ میں بادِ بہاری کی جو آمد کی ہے دھوم
بہرِ تسلیم ہر ایک شاخ کی خم ہے گردن

مسند آرائے تجمل جو ہوا شاہدِ گل
مرغِ گلشن یہ صدا دیتے ہیں الملک لمن

مستیاں کرتی ہوئی پھرتی ہے گلشن میں نسیم
جھومتے آتے ہیں بادل طرفِ صحنِ چمن

کوندتی برق ہے گھنگھور گھٹا چھائی ہے
بوندیاں پڑتی ہیں چلتی ہیں ہوائیں سَن سَن

شاخیں انگڑائیاں لیتی ہیں صبا ہے بدمست
وجد میں تال لگاتا ہے ہر اک برگِ سمن

ہلکے ہلکے وہ نسیمِ سحری کے جھونکے
نوعروسانِ سمن کا وہ نرالا جوبن

نرگسِ مست کی ہیں محوِ تماشا آنکھیں
وا کیا غنچۂ گل نے بھی تبسم سے دہن

سر نکالے ہیں حبابوں نے تہِ آب سے کیوں
نظر آتی نہ تھی پانی میں مگر سیرِ چمن

بسکہ ہر ذرہ ہے احساں طلبِ بادِ بہار
گرد بھی ہاتھ میں تھامے ہے صبا کا دامن

بادۂ عیش سے مخمور ہے ازبسکہ ہر ایک
باغ ازبسکہ ہے آسائش و راحت کا وطن

چونکتے ہیں جو کبھی خواب سے اطفالِ بہار
تھپکیاں دیتی ہے سونے کے لیے بادِ چمن

یہ تمہیدِ قصیدۂ بہاریہ کے انداز میں شروع ہوا ہے۔ لگتا ہے کہ کسی نہ کسی وجہ سے یہ نا تمام رہا ہے۔ شاید یہ قصیدہ جنگ یونان میں عثمانیوں کی فتح یابی کی خبریں ہندوستان پہنچنے کے بعد لکھا گیا ہوگا۔ لیکن اِس کا باقی حصہ ناموجود ہے۔ اگر اِس خوبصورت بہاریہ کے بعد مدح وثناء کا حصہ بھی آ جاتا تو اِس سے یہ پتا چلتا کہ سلطان عبدالحمید ثانی کے بارے میں شبلی مرحوم کے کیا خیالات تھے۔ افسوس ہے کہ نہیں ہے۔

اِس تمہید قصیدہ کے علاوہ بلکہ تاریخی لحاظ اِس سے بھی قبل کی ایک اور نظم "دیگر ترکوں کے فتوحات" کے عنوان سے ہے۔ اِس نظم ناتمام کے بابت سید سلیمان ندوی صاحب نے یہ عبارت لکھی ہے:

"یہ نظم غالباً جنگ روم وروس، یا جنگ روم و یونان کے زمانے میں ۱۸۷۸ء میں لکھی گئی ہوگی۔ یہ علی گڑھ جانے سے پہلے کا کلام ہے۔ مولانا کے بعض اعزہ کے پرانے کاغذات سے ہاتھ آئی ہے۔"

اگر اِس نظم کی دی ہوئی تاریخ صحیح ہے تو یہ نظم جنگ یونان سے متعلق نہیں جنگِ ۹۳ھ یعنی جنگِ روس سے متعلق ہونی چاہیے۔ چونکہ جنگِ یونان ۱۷ اپریل ۱۸۹۷ء میں شروع ہوئی تھی اور ایک ماہ جاری رہ کر عثمانی فوج کی فتح یابی سے ختم ہوئی تھی لہٰذا یا اس نظم کا تعلق جنگِ روس سے ہے جو ۱۸۷۷ء میں شروع ہوئی تھی یا اِس نظم سے متعلق سید سلیمان ندوی صاحب کا تخمینہ صحیح نہیں ہے۔ اِس نظم میں ترکوں کی فتح یابی کا ذکر دیکھ کر یوں محسوس ہوتا ہے کہ یہ نظم جنگِ یونان کے دوران یعنی ۱۸۹۷ء میں لکھی گئی ہو لیکن ساتھ ساتھ یہ بات بھی ذہن میں آتی ہے کہ نظم جنگِ روس کے بالکل شروع میں قلمبند ہونے لگی تھی لیکن عثمانیوں کی شکست کی خبریں ملنے کی وجہ سے ناتمام رہی تھی۔ بہرصورت اِس مختصر نظم سے شبلی صاحب کے دل کا جوش وخروش اور ترکوں کے ظفریاب ہونے سے اُن کی مسرت سامنے آتی ہے اور لگتا ہے کہ وہ بھی ترک بن کر ترکوں کی خوشی میں خوشی منا رہے تھے۔ خیر وہ بھی اُمتِ مسلمہ کے اتحاد کے دلدادہ تھے اِس لیے یہ کوئی عجیب وغریب بات نہیں ہے۔ وہ نظم یوں ہے:

''دیگر ترکوں کے فتوحات''

گزری دلِ سپہر سے نوکِ سنانِ تُرک | اور حلقہ نجوم سے تیرِ کمانِ تُرک
گردانِ نامدار میں گردن کشانِ ترک | شیرانِ کارزار میں زور آورانِ ترک
لرزے ہیں اُن کے رعب سے دشتِ مصاف ہے | خوں اُن کی تیغ کیں سے دلِ کوہ کاف ہے

شبلی مرحوم کی اِس سے بعد کی نظمیں جنگِ بلقان اور طرابلس کے بارے میں ہیں۔ جیسا کہ معلوم ہے جنگِ طرابلس ۲۹ ستمبر ۱۹۱۱ء میں شروع ہوئی تھی اور ۱۸ اکتوبر ۱۹۱۲ء کو جنگِ بلقان کے شروع ہونے سے دس دن بعد ختم ہوئی تھی۔ ایک ایسا زمانہ جس میں عبدالحمید ثانی کے اقتدار سے دُور کیے جانے کے بعد ابھی تک عثمانی سیاست کے میدان میں سیاسی جنگ جاری تھی اور اتحاد وترقی پارٹی کی انتقامی کارروائیوں کی زد میں رہ کر عثمانی سلطنت کا شیرازہ بکھر رہا تھا اٹلی نے موقع سے فائدہ اٹھا کر طرابلس اور بن غازی پر حملہ کر دیا۔ جبکہ اتحاد وترقی پارٹی نے عثمانی فوج کو اپنے

تسلط میں لینے کی غرض سے اکثر فوجیوں کو ریٹائر کر دیا تھا اور عبدالحمید کے زمانے کے بڑے بڑے فوجی عہدہ دار اپنے عہدوں سے الگ کئے گئے تھے اِس صورتحال میں ترکی فوج وطن سے کوسوں دُور ایک علاقے تک کیسے پہنچ سکتی؟ علاوہ بریں اُس وقت مصر پر انگریزوں کا قبضہ تھا اور وہ راستے میں حائل تھے۔ پھر بھی کچھ ترکی جوان فوجی جن مین انور بے، مصطفیٰ کمال (اتاترک) بھی شامل تھے بھیس بدل کر وہاں پہنچ گئے اور طرابلس کے عرب قبائل کو منظم کر کے اٹلی کے سامنے مقابلہ کرنے لگے۔ طرابلس میں جنگ جاری تھی کہ ۱۸ اکتوبر ۱۹۱۲ء کو بلقان میں جنگ شروع ہوئی۔ بلقان کی عثمانی سلطنت سے نئے آزادی یافتہ ممالک اکھٹے ہو کر عثمانیوں کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر ترکوں کو یورپ سے نکالنے کے لیے ''ترکی کے مریض'' کا گلہ دبانے کی کوشش کرنے لگے تھے۔ کم از کم طرابلس مین تو اٹلی کی فوج قتل عام نہیں کرتی تھی لیکن بلقان کے جو ممالک تھے جن میں یونان، بلغاریہ، مونٹینیگرو اور رومانیہ بھی شامل تھے، مسلمانوں کے خون کے پیاسے تھے اور اُن کے سامنے جو بھی آئے چاہے مرد، چاہے عورت، چاہے بوڑھا، چاہے بچہ اُن سب کو قتل کرنے سے گریز نہیں کرتے تھے۔ اِس جنگ کے دوران لاکھوں بے چارے مسلمان خود اپنے کرسچن ہمسایوں اور دوستوں کے ہاتھوں مارے گئے اور اُن کے گھربار اُن سے چھین لئے گئے۔ لاکھوں اناطولیہ کی طرف ہجرت کر کے آنے لگے۔ راقم حروف کے ننہیالی بھی اُس وقت بلغاریہ میں رہتے تھے۔ میری نانی بتاتی ہیں کہ وہ لوگ کھاتے پیتے گھرانے سے تعلق رکھتے تھے اور ان کے دادا عثمانیوں کے سرکاری ملازم تھے۔ اُنھیں دنوں میں وہ ایک دن کسی اور شہر سے باہر کسی کام کے سلسلے میں گئے اور جب گھر واپس آئے تو گھربار لٹا ہوا تھا۔ وہ اپنی بیوی اور بچی کی تلاش میں اصطبل کی طرف بڑھے تو اصطبل میں اپنی بچی کی رونے کی آواز سنی اور بھاگ کر اندر داخل ہوئے تو اُنھیں اپنی بیوی نیم برہنہ پھانسی دی ہوئی حالت میں ملی جن کی بلغار فوجیوں نے آبرو ریزی کرنے کے بعد اصطبل میں پھانسی بھی دی تھی۔ اُن کی بچی تو بمشکل دو تین سال کی تھی۔ وہ اپنی اہلیہ کو کہیں دفنانے کے بعد اپنی بیٹی کو لے کر گھوڑے پر سوار ہوئے اور وہاں اپنا سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر ازمیر

تک پہنچ گئے۔ اُن کی بیٹی جو ہماری پرنانی ہیں، وہ یونانیوں کے ازمیر پر قبضہ کے بعد اپنے بچوں سمیت اناطولیہ کے اندرونی علاقوں میں جا کر ترکی کی بہت ساری خواتین کی طرح مہم پر جنگ کرنے والے فوجیوں کو اسلحہ اور موادِ جنگ لے کر جارہی تھیں۔ انہیں دنوں میں ایک دفع اسلحہ لے کر جاتے ہوئے اُن کی دیورانی تھک کر کچھ سانس لینے کے لیے پیچھے رہ گئیں۔ وہ خواتین کارواں کی صورت میں آگے بڑھ رہی تھیں تو کچھ وقت گزرنے کے بعد جب وہ اُن کے پیچھے نہیں پہنچیں تو پرنانی نے واپس جا کر دیکھا تو دو یونانی فوجی اُن کو برہنہ کر کے اُن کی چھاتیوں کو اُن کے سینے سے چھُریوں سے الگ کر رہے تھے تو اُنھوں نے اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی چھری سے اُن یونانیوں پر وار کیا اور اُن دونوں کو قتل کر دیا۔ پرنانی کی گردن اور جسم میں جگہ جگہ اُن دو یونانی فوجیوں کی سنگینوں کی وجہ سے بنے زخم کے نشان تھے لیکن اللہ کی مہربانی سے وہ زندہ رہی تھیں اور کچھ سنبھلنے کے بعد پھر سے محاذِ جنگ کی طرف اسلحہ لے جانے والے کارروانوں میں شامل ہوگئی تھیں۔ خیر بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی لیکن یہ زمانہ ایک ایسا زمانہ تھا اور اس طرح کی دہشت انگیز دل دھلانے والی خبریں ہندوستان پہنچ رہی تھیں تو کیا یہ ممکن تھا کہ وہاں کے مسلمان آنکھیں اور کان بند کر کے برداشت کر لیں۔ ہاں کچھ لوگ تو تھے اور اپنے مفاد اور اپنی قوم کی بہتری خاموش ہونے میں دیکھ کر اِن واقعات سے چشم پوشی کر رہے تھے لیکن اکثر لوگ برداشت نہیں کر سکے اور اپنا تن من اور سب کچھ قربان کر کے اپنے ترک بھائیوں کی مدد کے لیے شب و روز کام کرنے لگے۔ شبلی نعمانی کا دل بھی اِن واقعات کی آتش سوزاں میں جل رہا تھا جس کا بیان وہ ''شہر آشوبِ اسلام'' نامی نظم میں کرتے ہیں۔ یہ طویل نظم اُن تمام باتوں کی گواہ ہے جن کا ذکر اوپر آیا ہے۔ اِس میں دکھ درد بھی ہے، غم والم بھی ہے اور ربّ ذوالجلال کے حضور میں شکایت بھی کہ مسلمانوں کے سروں کے اوپر اُمڈنے والی یہ مصیبت کی گھٹائیں کیوں نہیں ہٹتیں؟

شہر آشوبِ اسلام

حکومت پر زوال آیا تو پھر نام و نشاں کب تک
چراغِ کشتۂ محفل سے اُٹھے گا دھواں کب تک

قبائے سلطنت کے گر فلک نے کر دیے پرزے
فضائے آسمانی میں اُڑیں گی دھجیاں کب تک

مراکش جا چکا، فارس گیا، اب دیکھنا یہ ہے
کہ جیتا ہے یہ ٹرکی کا مریضِ سخت جاں کب تک

یہ سیلابِ بلا بلقان سے جو بڑھتا آتا ہے
اُسے روکے گا مظلوموں کی آہوں کا دھواں کب تک

یہ سب ہیں رقصِ بسمل کا تماشا دیکھنے والے
یہ صبر اُن کو دکھائے گا شہیدِ نیم جاں کب تک

یہ وہ ہیں نالۂ مظلوم کی لے جن کو بھاتی ہے
یہ راگ اِن کو سنائے گا یتیمِ ناتواں کب تک

کوئی پوچھے کہ اے تہذیبِ انسانی کے استادو
یہ ظلم آرائیاں تا کے یہ حشر انگیزیاں کب تک

یہ جوشِ انگیزیٔ طوفانِ بیداد و بلا تا کے؟
یہ لطف اندوزیٔ ہنگامہ آہ و فغاں کب تک

یہ مانا تم کو تلواروں کی تیزی آزمانی ہے
ہماری گردنوں پر ہو گا اِس کا امتحاں کب تک

نگارستانِ خوں کی سیر گر تم نے نہیں دیکھی
تو ہم دکھلائیں تم کو زخمہائے خوں چکاں کب تک

یہ مانا گرمیٔ محفل کے ساماں چاہئیں تم کو
دکھائیں ہم تمھیں ہنگامہ آہ و فغاں کب تک

یہ مانا قصۂ غم سے تمہارا جی بہلتا ہے
سنائیں تم کو اپنے دردِ دل کی داستاں کب تک

یہ مانا تم کو شکوہ ہے فلک سے خشک سالی کا
ہم اپنے خون سے سینچیں تمہاری کھیتیاں کب تک

عروسِ بخت کی خاطر تمہیں درکار ہے افشاں
ہمارے ذرہ ہائے خاک ہوں گے زر فشاں کب تک

کہاں تک لو گے ہم سے انتقامِ فتحِ ایوبی
دکھاؤ گے ہمیں جنگِ صلیبی کا سماں کب تک

سمجھ کر یہ کہ دھندلے سے نشانِ رفتگاں ہیں ہم
مٹاؤ گے ہمارا اِس طرح نام و نشاں کب تک

زوالِ دولتِ عثماں، زوالِ شرع و ملت ہے
عزیزو! فکرِ فرزند و عیال و خان و ماں کب تک

خدارا تم یہ سمجھو بھی کہ یہ تیاریاں کیا ہیں؟
نہ سمجھے اب تو پھر سمجھو گے تم یہ چیستاں کب تک

پرستارانِ خاکِ کعبہ دنیا سے اگر اُٹھے
تو پھر یہ احترامِ سجدہ گاہِ قدسیاں کب تک

جو گونج اُٹھے گا عالم شورِ ناقوسِ کلیسا سے
تو پھر یہ نغمۂ توحید گلبانگِ اذاں کب تک

بکھرتے جاتے ہیں شیرازۂ اوراقِ اسلامی
چلیں گی تند بادِ کفر کی یہ آندھیاں کب تک

کہیں اُڑ کر نہ دامانِ حرم کو بھی یہ چھو آئے
غبارِ کفر کی یہ بے محابا شوخیاں کب تک

حرم کی سمت بھی صید افگنوں کی جب نگاہیں ہیں
تو پھر سمجھو کہ مرغانِ حرم کے آشیاں کب تک

جو ہجرت کر کے بھی جائیں تو شبلی اب کہاں جائیں
کہ اب امن و امانِ شام و نجد و قیرواں کب تک

اِس نظم سے یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ ہندوستانی مسلمان بے قراری کے عالم میں اپنے ہم مذہب ترک بھائیوں کی امداد کی خاطر سب کچھ کرنے پر تیار تھے۔ اُن کی کوششوں میں سے ایک جنگِ بلقان کے دوران ترکی کو طبی وفد کا جانا تھا۔ اِس وفد کی سربراہی تحریک آزادی کے معروف رہنما ڈاکٹر مختار احمد انصاری (۱۸۸۰ء۔۱۹۱۶ء) کر رہے تھے۔ اِس وفد نے اِس جنگ کے دوران محاذِ جنگ اور آس پاس کے علاقوں میں ترکی فوجی اور جنگ کے آسیب دیدہ لوگوں کو طبی امداد فراہم کی اور جنگ کے خاتمے پر یہ وفد ترکی میں ناقابلِ فراموش یادیں چھوڑ کر اپنے وطن واپس لوٹا۔ ہندوستان میں اِس وفد کا استقبال جوش و خروش سے ہوا جہاں شبلی نعمانی مرحوم بھی شامل تھے اور اُنھوں نے اپنی مندرجہ ذیل نظم پڑھی۔ یہ بھی شبلی صاحب کی پُر شکوہ نظموں میں سے ایک ہے جس میں وفد کی کارروائیوں سے حاصل ہونے والی خوشی اور فخر کے احساسات نمایاں ہیں۔

ڈاکٹر انصاری کی قیادت میں ہندوستانی طبی وفد جو جنگ بلقان میں ٹرکی بھیجا گیا تھا۔ اُس کی واپسی کے وقت بمبئی میں یہ نظم پڑھی گئی۔

ادا کرتے ہیں ہم شکرِ جناب حضرت باری
کہ آئے خیریت سے ممبرانِ وفدِ انصاری

ہزاروں کوس جا کر بھائیوں کی تم نے خدمت کی
یہی تھا دردِ اسلامی یہی تھی رسمِ غم خواری

فراقِ ملک و ترکِ خانماں و دوری منزل
خدا کے فضل سے تم نے یہ کڑیاں جھیل لیں ساری

تمہارے روکنے کے واسطے ہنگامہ آرا تھے
صدائے نالہائے درد جوشِ گریہ و زاری

نگاہِ حسرت آلودِ عزیزاں کی سناں بازی
فغانِ سینہ ریشانِ محبت کی شرر باری

مگر اک جذبہ اسلام نے سب کو شکستیں دیں
کہ سب کو چھوڑ کر پہنچے وہاں با ایں گرانباری

جو سچ پوچھو تو تم انصاری بھی ہو اور مہاجر بھی
کہ سب اہلِ وطن کو چھوڑ کر پہنچے پئے یاری

کسی کو خواب میں بھی یہ سعادت مل نہیں سکتی
مریضوں کے لیے وہ آپ کی شب ہائے بیداری

جو سچ پوچھو تو زیبا ہے تمھیں دعوائے آفاقی
کہ تم نے کی ہے ترکانِ مجاہد کی پرستاری

تمہارا ناز اُٹھائیں اہلِ ملت جس قدر کم ہے
کہ تم نے غازیانِ دیں کی کی ہے ناز برداری

تمہارے سامنے موتی کی لڑیاں پوت سے کم ہیں
کہ دیکھ آئے ہو تم ترکی یتیموں کی گہرباری

تمہیں کچھ جاں نوازی ہائے اسلامی کو سمجھو گے
کہ تم دیکھ آئے ہو نصرانیوں کا طرزِ خونخواری

☆☆☆

مسلمانوں کے تم نے طالع واژوں بھی دیکھے ہیں
نئے سب انقلابِ گردشِ گردوں بھی دیکھے ہیں

تمہارا دردِ دل سمجھیں گے کیا ہندوستاں والے
کہ تم نے وہ مظالم[1] ہائے روز افزوں بھی دیکھے ہیں

یتیموں کے سنے ہیں نالہ ہائے جاں گداز ہم نے
زنانِ بے نوا کے چہرہ محزوں بھی دیکھے ہیں

گھروں کو لوٹنے کے بعد زندوں کو جلا دینا
بلادِ مغربی کے یہ نئے قانوں بھی دیکھے ہیں

مسلمانوں کا قتل عام اور ترکوں کی بربادی
نتائج ہائے امید کلیڈ سٹوں بھی دیکھے ہیں

تمہیں نے غازیوں کے زخم پر ٹانکے لگائے ہیں
شہیدانِ وطن کے جامۂ پرخوں بھی دیکھے ہیں

تمہاری چشمِ عبرت گیر خود ہم سے یہ کہتی ہے
کہ ہم نے وہ مصائب[2] ہائے گوناگوں بھی دیکھے ہیں

---

۱ - ۲ ''مظالم ہائے روز افزوں''، اور مصائب ہائے گوناں گوں' اس لیے محلِ نظر نہیں کہ شبلی جیسے صاحبانِ علم و عرفان کے زبان و قلم سے ادا ہونے والا (بوجوہ) ایک ایک لفظ سند بن جاتا ہے ایسی مثالیں اساتذہ شعر کے ہاں نایاب نہیں (ادارہ)

نگار آرائیاں دیکھی ہیں چشم گوہر افشاں کی — شہیدانِ وطن کے عارضِ گلگوں بھی دیکھے ہیں

تمہیں سے کچھ پتہ ملتا ہے شیدایانِ ملت کا — کہ تم نے شاہد اسلام کے مفتوں بھی دیکھے ہیں

جنونِ جوشِ اسلامی کوئی سمجھا تو تم سمجھے — کہ تم نے لیلئ اسلام کے مجنوں بھی دیکھے ہیں

سہارا ہے اگر امید کا اب بھی کوئی باقی — تو تم نے وہ رموزِ قوت مکنوں بھی دیکھے ہیں

عجب کیا ہے یہ بیڑا غرق ہو کر پھر اُچھل آئے — کہ ہم نے انقلاب چرخ گرداں یوں بھی دیکھے ہیں

دعائے کہنہ سالاں ہے اگر مقبول یزدانی — تو اب دست دعا ہے اور یہ ہے شبلی نعمانی

دعائے کہنہ سالاں ہے اگر مقبول یزدانی
تو اب دست دعا ہے اور یہ ہے شبلی نعمانی

جنگِ بلقان کے دوران جب ہندوستانی مسلمانوں کے دل اپنے بھائیوں کے درد والم میں سوزاں، بے چین و بے قرار کچھ نہ کچھ کرنے کی سعی میں لگے ہوئے تھے تو ہندوستان کے کچھ اربابِ مصلحت ایسے تھے کہ اس تحریک کو کسی نہ کسی طرح سے آہستہ کر کے شاید اِسے مسلمانانِ ہند کے خلاف ایک اسلحہ کی صورت میں استعمال ہونے سے روکنا چاہتے تھے۔ اُن لوگوں میں سے ایک سر آغا خان تھے۔ خیر! ہر چند راقم کا دل بھی شبلی اور اُس زمانے کے بہت سارے مسلمانوں کی طرح اس بات کو ماننے پر تیار نہیں لیکن ہوسکتا ہے کہ اُن کو اِس طرح کا بیان دینے پر کچھ اسباب مجبور کرتے ہوں۔ لیکن خدا جانے۔ شبلی صاحب نے اُن کے اِس بیان کے خلاف جس میں ترکوں کو مشورہ دیا جاتا تھا کہ وہ اپنے ملک کے یورپی علاقوں سے دست بردار ہو جائے تا کہ وہ یورپ کی بڑی طاقتوں کی ہمدردی حاصل کر سکے، طنزیہ انداز میں مندرجہ ذیل دو نظموں کو لکھا تھا۔ اِن نظموں میں سے پہلی فارسی اور دوسری اردو میں ہے۔ ان دو نظموں کو یکے بعد دیگرے ذیل میں پیش کیا جاتا ہے لیکن چونکہ فارسی کی نظم کا مضمون تقریباً اردو نظم جیسا ہے اِس لیے فارسی نظم کا اردو ترجمہ نہیں دیا جائے گا۔ ''کلیاتِ شبلی'' میں یہ دو نظمیں سید سلیمان ندوی کی ذیل کی مختصر تشریح کے بعد یوں موجود ہیں۔

سر آغا خاں کا خطاب ترکوں سے

جنگِ بلقان کے زمانہ میں سر آغا خاں نے ایک مضمون لکھا تھا جسمیں ترکوں کو یہ صلاح دی تھی کہ اُن کے لیے بہتر یہ ہے کہ وہ سرزمینِ یورپ کو چھوڑ کر ایشیا چلے جائیں تا کہ وہ دولِ یورپ کے حملوں سے محفوظ رہیں۔ اس مضمون سے مسلمانوں میں بہت غصہ پیدا ہوا تھا اور اُن کے وقار کو بہت صدمہ پہنچا۔ ذیل میں اُس کا طنزیہ جواب ہے:

(۱)

گفت با ترک حضرتِ آغا — آنچہ گویم بگوش در گیرید
بگذارید خاکِ یورپ را — دل ازیں مرز بوم برگیرید
ایشیا مسکنِ قدیمِ شما است — بازآں خاک را مقر گیرید
دل بصیدِ رمیدہ نتواں بست — یک شکار شکستہ پر گیرید
اسپ گر زیرِ راں نمی آید — بگذارید و مادہ خر گیرید
کار پیشینۂ شما کشت است — مرغزارے و گاؤ نر گیرید
بانگِ توپ و تفنگ دردِ سر است — ناوک و خنجر و سپر گیرید
نوبتِ ریل و تلغراف گذاشت — قاصد و پیک و نامہ بر گیرید
کارِ دنیا کسے تمام نکرد — ہرچہ گیرید، مختصر گیرید

(۲)

ترک سے حضرتِ آغا نے یہ ارشاد کیا — کیوں ہو بے فائدہ یورپ میں گرفتِ دائم
ایشیا میں اگر آجاؤ تو پھر تا بہ ابد — پاؤں پھیلا کے پڑے چین سے سوؤ گے چہ غم؟
نظر آجائے گی بے کاری آلات جدید — جب کہ تم وادیٔ تاتار میں رکھو گے قدم
ریل یا تار کی پھر ہوگی نہ حاجت تم کو — ڈاک پہنچانے کو آجائیں گے مرغانِ حرم
خود ہی کہہ دو گے کہ بیکار ہیں سب تیر و تفنگ — نظر آئے گا جو تیر افگنیوں کا عالم

سلک بحری کی ادا دل سے اتر جائے گی
دیکھ لوگے کو کمندوں کا وہ پیچ اور وہ خم

فائدہ کیا ہے کہ تم ریل کا احسان اُٹھاؤ؟
آپ کا اسپ سبک سیر ہے کس بات میں کم؟

آپ صحرا میں چلائیں گے جو خشکی کا جہاز
پھر نہ کچھ بھاپ کی حاجت ہے نہ طوفان کا غم

لطف جو بانگِ جرس میں ہے وہ سیٹی میں نہیں
زین کو کہہ نہیں سکتا کوئی ہم پایۂ بم

لمپ کی شعلہ فشانی میں کہاں وہ انداز؟
شمع کی بزم طرازی کا جو کچھ ہے عالم

فیصلہ بیٹھ کے چوپال میں کر دے گا جو پنچ
ہوگا یورپ کے قوانین سے بڑھ کر محکم

اور مانا بھی کہ فردوسِ بریں ہے یورپ
حضرتِ خواجۂ شیراز یہ کرتے ہیں رقم

پدرم روضۂ رضواں بدوگندم بفروخت
ناخلاف باشم اگر من بہ جوے نفروشم

بالکل آغا خان کی طرح انگلستان کے کچھ اربابِ مصلحت بھی بلقان کی جنگ کے دوران ترکوں کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کر رہے تھے جس پر یقین کرنا شبلی نعمانی جیسے لوگوں کے لیے ناممکن تھا۔ شبلی مرحوم اس کا بیان اپنی ایک نظم میں یوں کر کے اُن کے عزائم کو فاش کرتے ہیں:

ہستیِ مسلم کی رہائی
(جنگِ بلقان میں وزرائے برطانیہ کے دعوئے اسلام دوستی کی تردید)

وہ کہتے ہیں کہ ہم کو پاس ہے احساسِ مسلم کا
مگر اس کا اثر جو کچھ ہے، بس ہندوستاں تک ہے

مگر ہم کیا کریں اس کو کہ عالمگیریٔ ملّت
عراق و فارس و نجد و حجاز و قیرواں تک ہے

منافق ہے جو کہتا ہے کہ میں ترکی سے یکسو ہوں
یہ وہ الفاظ ہیں جن کی جہانگیری زباں تک ہے

ہمارا جوشِ اسلامی انھیں باور نہیں کرتا
یہ اندازِ تغافل جلوہ گاہِ امتحاں تک

پڑا سوتا ہے کوئی گنبدِ خضرائے یثرب میں
کہ جس کا بندۂ فرماں زمیں سے آسماں تک ہے

کوئی جا کر یہ کہہ دے ہم گنہگاروں کی جانب سے
کہ اب مسلم کی ہستی تیرے الطافِ نہاں تک ہے

اُنہیں دنوں میں پہلی جنگِ بلقان کے خاتمہ کے فوراً بعد بلقانی ممالک کو ترکی سے حاصل شدہ علاقوں کی وجہ سے اُن کی آپس میں جنگ شروع ہوئی تو ترکی فوج نے بھی موقع سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے اُن پر حملہ کیا اڈریانوپل سے کچھ آگے تک کے علاقوں کی بازیابی ممکن ہوئی۔ اس پر

ہندوستانی مسلمانوں کی خوشی کی حد و بندی ہی نہیں رہی۔ وہ اس طرح خوش تھے جس طرح ترک فوجیوں کے ساتھ وہ بھی اڈریانوپل پر اپنا جھنڈا لہرا رہے تھے۔ شبلی نعمانی نے بھی اس کا اظہار اپنی نظم ''ترکوں سے خطاب'' میں پُر جوش انداز میں کیا تھا۔

ترکوں سے خطاب

جنگِ بلقان میں فتح اڈریانوپل پر مبارک باد، ۸ دسمبر ۱۹۱۲ء

اے ترک، اے مجسمۂ کبریائے حق — اے وہ کہ جس پہ عالمِ ہستی کو ناز ہے
پشت و پناہِ ملّتِ ختم الامم ہے تو — تو آج زورِ بازوئے شاہِ حجاز ہے
رنگیں ہے تیری تیغ سے ہر صفحۂ وجود — مغرب تراہی عرصہ گہ[1] ترک تاز ہے
تو نے دکھا دیا کہ تری تیغ جانستاں — اب بھی فنائے ہستی دشمن کا راز ہے
رنگیں جو ہے مرقّعِ عالم کا ہر ورق — شمشیر تیری خامۂ رنگین طراز ہے

المختصر، شبلی نعمانی مرحوم عالم اسلام اور اتحاد مسلمین کے فدوی تھے اور اپنے ترک بھائیوں سے بے پناہ محبت کرتے تھے۔ ان جیسے لوگ نہ ہوتے تو اب ہم لوگ ان کی مانند بننے پر مجبور ہوتے اور اس طرح آرام وسکون کے ساتھ اپنے اپنے گھروں میں نہ ہوتے۔ آخر میں ان کی ایک مختصر نظم کو بھی یہاں درج کرنا چاہتا ہوں جسے پڑھتے ہوئے میرا دل ایک جذبے میں آجاتا ہے جس کا بیان نہیں کیا جاسکتا۔ اس زمانے میں دنیا بھر کے مسلمانوں کی تعداد کے نہ بڑھنے کے سوال پر دیا گیا منہ توڑ جواب ہے۔ لیجئے وہ جواب:

---

۱ ''عرصہ گہ'' کی ترکیب محلِ نظر ہے۔ ہوسکتا ہے کہ علامہ شبلی نعمانی نے رزم گہ نظم کیا ہو اور سہوِ کتابت کے نتیجہ میں ''عرصہ گہ'' چھپ گیا ہو۔ واللہ عالم بالصواب ! (ادارہ)

دنیا میں مسلمانوں کی تعداد کیوں نہیں بڑھتی

کیا پوچھتے ہو یہ کہ رسولِ عرب کی قوم　　کیوں گھٹ رہی ہے آج عدد میں ظہور میں
سن لو وہ گنجہائے گراں مایہ دفن ہیں　　بلقان کی ہیں خاک میں کچھ کانپور میں

حوالے اور حواشی

۱) محمد فرمان، ''محمد شبلی نعمانی''، تاریخِ ادبیات مسلمانانِ پاکستان و ہند، لاہور ۱۹۷۲ء، جلد ۹، ص ۱۷۳۔۱۸۰۔

۲) قاضی محمد عدیل عباسی، تحریک خلافت، نئی دہلی ۱۹۹۷ء، ص ۲۸

2) Azmi Ozcan, Pan-islamizm: osmanli Devleti-Hindistan Muslumlalri ve Ingiltere (1877-1914), Istanbul 1992.

۳) سید سلیمان ندوی، کلیات شبلی، کراچی ۱۹۸۵ء ص ۶۴۔

۴) کلیات شبلی، ص ۱۷۴۔

(۵) کلیات شبلی، ص ۹۷۔۹۹۔

۶) کلیات شبلی، ص ۹۹۔۱۰۲۔

۷) کلیات شبلی، ص ۱۰۲۔۱۰۴۔

۸) کلیات شبلی، ص ۱۰۵۔

(۹) کلیات شبلی، ص ۱۰۴۔۱۰۵

(۱۰) کلیات شبلی، ص ۱۳۳

پروفیسر ڈاکٹر محمد زاہد۔ (علی گڑھ مسلم یونیورسٹی۔ انڈیا)

سرسید اپنے مکاتیب کے آئینے میں

ہماری زندگی کا ہر شعبہ سرسید کے احسان سے گراں بار ہے لیکن جو شے بقول علامہ شبلی ان کی بدولت ذرّے سے آفتاب بن گئی وہ اردو ادب ہے۔ مولانا حالی نے سرسید کو اردو نثر کا مورث اعلیٰ قرار دیا اور فرمایا کہ بیس برس کے اندر انہوں نے اردو لٹریچر کا رخ پھیر دیا۔ مولانا کے اس بیان میں سرِ مُو مبالغہ نہیں۔ یہ انہی کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ اردو شاعری جو عشق و عاشقی کے دائرے میں اسیر تھی، اس حصار سے باہر نکل کر اعلیٰ احساسات و جذبات کے اظہار کا ذریعہ بنی اور اس میں اقبال جیسا مفکر شاعر پیدا ہوا۔ شاعری کے میدان میں تو ان کی کوششیں رہنمائی تک محدود رہیں لیکن نثر نگار وہ خود تھے چنانچہ اُنھوں نے جو کچھ کہا وہ کر دکھایا اور ایک دن تہذیب الاخلاق میں اس کا ذکر بھی کیا۔ فرمایا۔

''جہاں تک ہم سے ہو سکا ہم نے اردو زبان کے علم و ادب کی ترقی میں اپنے ان ناچیز پرچوں کے ذریعہ سے کوشش کی۔ مضمون کے ادا کا ایک سیدھا اور صاف طریقہ اختیار کیا۔ رنگین عبارت سے جو تشبیہات و استعارات خیالی سے بھری ہوتی ہے اور جس کی شوکت صرف لفظوں ہی لفظوں میں رہتی ہے اور دل پر اس کا کچھ اثر نہیں ہوتا، پرہیز کیا۔ اس میں کوشش کی کہ جو کچھ لطف ہو مضمون کے ادا میں ہو جو اپنے دل میں ہو وہی دوسرے کے دل میں پڑے تا کہ دل سے نکلے اور دل میں بیٹھے۔''

اپنی بے حد مصروف زندگی کے باوجود انھوں نے لگا تار لکھا کیونکہ ان کے اپنے الفاظ میں ''لکھنے پڑھنے میں میرا جتنا جی لگتا ہے اتنا کسی اور کام میں نہیں لگتا'' ہزارہا صفحے ان سے یادگار ہیں اور ہمارے ادب کا انمول ذخیرہ ہیں۔ ان کی تصانیف کا تنقیدی جائزہ لیجئے تو اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی تصانیف میں جو خصوصیت سب سے نمایاں ہے وہ ''عقلیت'' ہے ہر تصنیف میں غور و فکر کی

کارفرمائی ہے۔ ہر جگہ دل پر دماغ غالب ہے انھوں نے زمانہ ہی ایسا پایا تھا کہ دلائل و براہین کے بغیر کوئی بات قابل قبول نہیں تھی انھوں نے درست فرمایا کہ فلسفے کا دور رخصت ہوگیا۔ اب خیال کی تیلیوں کو باندھنے کے لیے نیا ڈورا چاہیے۔ یہ سائنس کا زمانہ ہے جو کہو لیبارٹری (Laboratory) میں وہ سچ کر دکھاؤ۔ غرض سرسید نے جو کچھ کیا وہ زمانے کے تقاضے سے کیا جو لکھا وہ ضرورتاً لکھا اور انداز بھی وہ اختیار کیا جس کی ضرورت تھی۔ سچ یہ ہے کہ سرسید اپنے زمانے کی آواز تھے۔

شدید جذباتی کیفیات جیسے بے پناہ چاہت، زہرہ گداز غم، زہرآگیں نفرت خوفناک غصہ یہ وہ چیزیں ہیں جن سے سرسید کی تصانیف نا آشنا ہیں۔ انھوں نیا ستدلال کا راستہ اختیار کیا اور اس راستے میں ان چیزوں کی گنجائش ہی نہ تھی۔ ولیم میور کے 'لائف آف محمدؐ' نے انھیں تڑپا دیا تھا۔ سرورؐ کائنات کی شان میں گستاخی نے انھیں بے قرار کر دیا تھا۔ اس کا دندان شکن جواب انھوں نے ولیم میور کے گھر یعنی انگلستان میں بیٹھ کر لکھا لیکن قلم اٹھایا تو متانت و شائستگی کا دامن نہ چھوڑا۔ یہاں جذبات کے بے قابو ہو جانے کا پورا موقع تھا لیکن سرسید نے استدلالی انداز نہ اپنایا ہوتا تو ولیم میور قائل نہ ہوتے اور اپنی تحقیقی کوتاہی کا اعتراف نہ کرتے۔

جذبات کا بے محابا اظہار بلکہ جذبات کا بے قابو ہو کر بہہ نکلنا بقول ورڈز ورتھ لوازم شعری میں داخل ہے لیکن اس سے تخلیقی نثر میں بھی آب و تاب پیدا ہوتی ہے ایسا نہیں کہ سرسید اس طرح کی نثر لکھنے پر قادر نہیں تھے۔ امید کی خوشی، سراب حیات، گزرا ہوا زمانہ اور چند لکچر اس کا ثبوت ہیں۔ علاوہ ازیں مکاتیب سرسید میں اس کی بہت سی مثالیں مل جاتی ہیں۔ دراصل ان خطوط کی طرف ابھی پوری توجہ نہیں کی جا سکی۔ اقبال کے بارے میں درست کہا جاتا ہے کہ وہ زندہ ہیں تو اپنی شاعری کی بدولت اور ان کے خطوط صرف اس لیے پڑھے جاتے ہیں کہ وہ ایک بڑے شاعر کے خطوط ہیں۔ سرسید کے خطوط کو یہ کہہ کر زیادہ توجہ کا مستحق نہیں سمجھا جاتا کہ یہ ضرورتاً لکھے گئے خطوط ہیں اور عام طور پر رعنائی و دلکشی سے محروم ہیں۔ اس لیے دل ان کے مطالعے پر مائل نہیں

ہوتا لیکن یہ غلط فہمی ہے۔ مثالوں سے میں اس دعوے کا ثبوت فراہم کرنے کی کوشش کروں گا۔ لندن سے محسن الملک کے نام ایک خط میں اس دلی کیفیت کا ذکر کرتے ہیں:

''تبدیل وضع کے باب میں جو کچھ آپ نے لکھا ہے وہ بہت بجا ہے بشرطیکہ میرا جادو تو بہ توبہ میرا معجزہ نعوذ باللہ، میری کرامت لاحول ولا قوۃ الا باللہ، میری حماقت بھی تم پر اثر نہ کرے گی۔ ذرا صبر کرو۔ تین مہینے خیر سے گزر جاویں جب الہ آباد اسٹیشن پر گلے ملو گے اور چھاتی سے چھاتی لگے گی اس وقت پوچھیں گے کہ جان من (معاف کیجئے بے خودی میں یہ لفظ نکل گیا) قبلۂ من اب کیا ارشاد ہوتا ہے۔''

سید زین العابدین سرسید کے بے تکلف دوست تھے بلکہ سچ تو یہ ہے کہ دونوں کو ایک دوسرے سے بے پناہ عشق تھا۔ انھیں لکھتے ہیں:

''مکرمی زینو بھیا! ابھی تمھارا خط پہنچا کچھ شبہ نہیں کہ تم کو مجھ سے جدا ہونے کا ایسا ہی رنج ہے جیسا کہ تم نے لکھا مگر تم تو اس رنج کو کسی قدر لکھ بھی سکے مگر مجھ کو تمھارے چلے جانے سے جو رنج ہے وہ لکھا بھی نہیں جا سکتا۔ زبان کھجلاتی ہے اور کوئی یہاں نہیں کہ اس کو برا کہوں۔ دل میں غصہ آتا ہے اور کوئی یہاں نہیں ہے جس پر غصہ نکالوں۔ ہاتھ کھجلاتے ہیں اور کوئی یہاں نہیں ہے جن کو ماروں۔ حقیقت میں تمہارے جانے سے مکان کو سُونا نہیں ہوا بلکہ دل سُونا ہو گیا۔ صبح اٹھ کر خدا یاد نہیں آتا مگر تم یاد آتے ہو: 'اے کہ ہرگز فرامشت نہ کنم' کا نقشہ ہو گیا ہے۔''

ایسے خطوط کی تعداد بھی کم نہیں جن میں شدید رنج و غم کی کیفیات کا بیان ہوا ہے۔ بیٹی کی موت، سید حامد کا انتقال، سید محمود کے خلل دماغ کے سلسلے میں جو خطوط لکھے گئے انھیں بطور مثال پیش کیا جا سکتا ہے۔ مسلمانوں کی بربادی پر وہ بے حد دکھی تھے۔ اس سلسلے میں نواب محسن الملک کو لکھتے ہیں۔

''افسوس کہ مسلمان ہندوستان کے ڈوبے جاتے ہیں اور کوئی ان کا نکالنے والا نہیں۔ ہائے افسوس امرت تھوکتے ہیں اور زہر نگلتے ہیں۔ ہائے افسوس ہاتھ پکڑنے والے کا ہاتھ جھٹک

دیتے ہیں اور مگر مچھ کے منھ میں ہاتھ دیتے ہیں۔ اے بھائی مہدی کچھ کرو اور یقین جانو کہ مسلمانوں کے ہونٹوں تک پانی آ گیا ہے اور اب ڈوبنے میں بہت ہی کم وقت باقی ہے۔"

سرسید کی اصلاحی کوششوں کو بہت سے مسلمانوں نے ناپسند کیا۔ ان کے خلاف مضامین لکھے گئے، فتوے لگائے گئے قتل کے منصوبے بنائے گے مگر ان کے پائے ثبات کو تزلزل نہ ہوا۔ اس مخالفت کا جن خطوط میں ذکر کیا گیا وہاں کہیں تو طنز کی زہرناکی نظر آتی ہے کہیں ظرافت۔ ایک خط میں لکھتے ہیں کہ "ہمارا حال تو اس بڑھیا کا سا ہو گیا ہے کہ کسی دن اسے کوئی نہ ستاتا تو پوچھتی تھی کیا آج محلے کے سارے لونڈے مر گئے" شدید دلی جذبات کا اظہار کرتے ہوئے ایک خط میں محسن الملک کو لکھتے ہیں۔

"مجھ کو کہاں تک بچاؤ گے میں تو ہدف تیر ہائے ملامت ہو گیا ہوں۔ روز بروز ہوتا جاؤں گا۔ شاید بعد میرے کوئی زمانہ آوے جب لوگ میری دل سوزی کی قدر کریں۔

سرسید شفقت و محبت کا پیکر تھے تو غیض و غضب میں بھی کسی سے کم نہ تھے۔ بپھرتے تو شیر ببر کی سی کیفیت ہو جاتی تھی۔ انھوں نے تعلیم کا پودا لگایا تو سب سے زیادہ تعاون سید محمود کا حاصل رہا۔ اس دن سے جب انھوں نے مسلمانوں کو قعر مزلّت سے نکالنے کا ارادہ کیا اور جدید تعلیم کا نسخۂ کیمیا ان کے ہاتھ آیا۔ عمر کے دورِ آخر تک سید محمود ہر طرح ان کے معاون و مدگار رہے یہ ایک الگ موضوع ہے اور مزید تحقیق کا مستحق لیکن یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ بیٹے کی محبت میں نہیں بلکہ قوم کی بھلائی کے خیال سے انھوں نے سید محمود کو اپنا جانشین بنانے کا فیصلہ کیا۔ اس سلسلے میں ٹرسٹی شب بل تو ان کے اثر ورسوخ کی بنا پر پاس ہو گیا لیکن مخالفت کا طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ ان کے اپنے بھی بیگانے ہو گئے۔ مولوی سمیع اللہ خاں جو روز اوّل سے مدرسے کے نگراں رہے تھے مخالفت پر سب سے پہلے کمربستہ ہو گئے۔ نواب وقار الملک نے بھی ان کی ہمنوائی کی اس سلسلے میں سرسید کے جتنے خطوط ہیں وہ سخت غیض و غضب کے عالم میں لکھے گئے ہیں تفصیل کی گنجائش نہیں۔ بے حد اختصار کے ساتھ یہاں ایک دو عبارتیں پیش کی جاتی ہیں۔ لندن سے نواب محسن الملک کو لکھتے ہیں:

"مولوی س۔ خ کو اب بھی میں اپنے بھائی سے کم نہیں سمجھتا مگر جو ملال کہ میرے دل میں

ہوا وہ اب تک کم نہیں ہوا۔ پھوٹ جاوے وہ آنکھ جو کسی کو دیکھے اس نگاہ سے جو اس کے دل میں نہیں ہے۔ گل جاوے وہ زبان جو وہ کہے جو اس کے دل میں نہیں۔ ٹوٹ جاوے وہ ہاتھ جو وہ لکھے جو اس کے دل میں نہیں ہے۔ پس آپ نے جو لکھا ہے کہ میں مولوی س۔خ کو ضرور خط شرکت چندہ کے لیے لکھوں تو میں کیا لکھوں۔"

ایک دوسرا اقتباس دیکھیے:

"سب سے اول مجھے یہ بات صاف صاف کہہ دینی چاہئے کہ جانشینی کا معاملہ اب اس حد سے گزر گیا ہے کہ اس میں کچھ ترمیم ہو سکے۔ اب وہ کسی طرح ملتوی نہیں رہ سکتا۔ یا ادھر ہوگا یا اُدھر۔ اس میں فکر لا حاصل ہے مولوی س۔خ کا ایک ایک لفظ شرارت اور خبث طینت سے بھرا ہوا ہے۔ میں ان کا ذکر کرنا یا اُن کی نسبت کچھ کہنا نہیں چاہتا لیکن اگر آپ کا یہ خیال ہو کہ کسی طرح یہ سلسلۂ جانشینی سید محمود کو چھوڑ دیا جاوے تو اس خیال کو دور کر دیجیے۔ اگر دوٹ کثرت سے برخلاف اس کے فرض کرو، ہوں تو میں مدرسہ کو چھوڑ دوں گا۔ ایک کام کیا تھا، نہ چل سکا۔ آپ کا یہ خیال کہ آپ رخصت لیکر آویں اور اصلاح کریں بالکل غلط ہے۔"

غصّے سے زیادہ غم سے بے قابو ہونے کا ایک موقع اس سے پہلے پیش آچکا تھا ولیم میور کی کتاب دیکھ کر دل پر رنج و غم کی جو کیفیت گزری اس کا ذکر کرتے ہوئے ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

"ان دنوں ذرا میرے دل کو سوزش ہے ولیم میور صاحب نے جو کتاب آنحضرت صلی اللہ علیہ والہٖ وسلم کے حال میں لکھی ہے اس کو میں دیکھ رہا ہوں۔ اُس نے دل کو جلا دیا اور ان کی ناانصافیاں اور تعصبات دیکھ کر دل کباب ہوگیا اور مصمم ارداہ کرلیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیئر میں جیسا کہ پہلے سے ارادہ تھا کتاب لکھدی جائے اگر تمام روپیہ خرچ ہو جائے اور میں فقیر بھیک مانگنے کے لائق ہو جاؤں تو بلا سے۔ قیامت میں یہ تو کہہ کر پکارا جاؤں گا کہ اس فقیر مسکین احمد کو جو اپنے دادا محمد صلی اللہ علیہ والہ وسلم کے نام پر فقیر ہو کر مر گیا حاضر کرو۔" "مارا ہمیں تمغۂ شہنشاہی بس است"

سرسید رسولؐ اکرم کی امت میں ہونے پر فخر کرتے تھے۔ اور بے حد ناز اس پر تھا کہ وہ اُن کی اولاد میں ہیں۔

سرسید اگر شاعر ہوتے تو سب سے زیادہ توجہ نعت گوئی پر فرماتے کہ اظہار جذبات کی صورت اس سے زیادہ ہو ہی نہ سکتی تھی۔ ایسا نہیں کہ انھوں نے شعر نہ کہے ہوں۔ اس طرف توجہ کی مُہلت نہ ملی پھر بھی مختصر سا کلام اُن سے یادگار ہے اور اُس میں یہ نعتیہ اشعار خاص طور پر اہمیت رکھتے ہیں۔ اگر اِن چند شعروں کو وہ اپنے لیے ذریعۂ نجات خیال کرتے ہوں تو کیا عجب۔ ملاحظہ فرمائیں:

نعت

فلاطوں طفلکے باشد بہ یونانے کہ من دارم
مسیحا رشک می آرد ز درمانے کہ من دارم

زکفرمن چہ میخواہی، ز ایمانم چہ می پُرسی
ہماں یک جُرعہ عشق است ایمانے کہ من دارم

خدا دارم، دلے بریاں زعشق مصطفےٰ دارم
نہ دارد ہیچ کافر سازوسامانے کہ من دارم

زجبریلِ امیں قرآں بہ پیغامے نمی خوانم
ہمہ گفتار معشوق است قرآنے کہ من دارم

فلک یک مطلع خورشید دارد باہمہ شوکت
ہزاراں مطلعہا دارد گریبانے کہ من دارم

زِبُرہاں تابہ ایماں سنگ ہا دارد رہ واعظ
نہ دارد ہیچ واعظ ہم چو بُرہانے کہ من دارم

تلخیص و ترجمہ

محمد طارق علی

پروفیسر ڈاکٹر نسیم ۔ اے ہائنز (ہارورڈ یونیورسٹی ۔ امریکہ)

برّ ِصغیر میں گنگا جمنی تہذیب کے محرّکاتی عوامل

آج کا ترقی یافتہ جنوبی ایشیا وہ خطہ ارضی ہے جہاں پہلی بار آنے والے شخص کو برّصغیر میں جا بجا پھیلی اور سانس لیتی مختلف النوع تہذیبیں اور ان کی رنگارنگی مبہوت کر دیتی ہیں۔ خصوصاً یہاں کی صدیوں پرانی تہذیبوں اور بعد کے زمانوں میں آنے والی ترک اور ایرانی ثقافتوں کے وسیع ملاپ اور باہمی رچاؤ کا حسن ہر ایک کی توجہ کو اپنی جانب کھینچ لیتا ہے۔ برصغیر میں آمدہ بیرونی تہذیبوں کی مقامی ثقافت سے میل ملاپ کی تاریخ کافی پرانی ہے اور اس کے ڈانڈے البیرونی کے زمانے (۹۲۳ء) سے جا ملتے ہیں۔ گو زندگی کے مختلف شعبوں میں ان تہذیبوں کے بوقلموں میل ملاپ کی تمام تفاصیل تو دستیاب نہیں ہو سکیں لیکن اتنا ہمیں معلوم ہے کہ وسطِ ایشیا کے وسیع و عریض علاقوں میں خوں خوار چنگیز خاں (۱۱۶۷ء۔۱۲۲۷ء) کی پھیلائی ہوئی بربادیوں کے نتیجے میں لاتعداد بے خانماں لوگ پناہ کی تلاش میں جنوبی ایشیا کی طرف نکل پڑے جو اُس زمانے میں سیاسی لحاظ سے بہت مستحکم سمجھا جاتا تھا۔ یہ ہجرت یا نقل مکانی ایک طویل عرصے تک چلتی رہی۔ یوں آنے والی کئی صدیوں کے دوران وسط ایشیائی لوگ جنوب مشرق کی جانب لہر در لہر پہنچتے رہے۔ یہ اکیلے نہ تھے ان کی خوبصورت لسانی اور ثقافتی روایات ان کے ہمراہ تھیں۔ یہ تارکین وطن نئے علاقوں میں جا کر مقامی باشندوں سے باہم شیر و شکر ہو گئے۔ اگر چہ یہ میل ملاپ کبھی کبھار ہنگامی نوعیت کا بھی رہا تاہم مختلف زبانوں اور ثقافتوں کی باہمی آمیزش کی ایک مستقل صورت بہت ناگزیر تھی۔ ان علاقوں کے مقامی حکام بھی یہ چاہتے تھے کہ تارکین اور مقامی لوگ آپس میں خیر سگالی کے

جذبات استوار کریں اور انہیں مضبوط بنائیں تاکہ ان کی باہمی یگانگت بڑھے۔ اور اس کے لیے ایک مشترکہ ذریعہ اظہار اور باہمی قریبی مراسم اور تعلق کا ہونا بہت ضروری تھا۔ چنانچہ چودھویں صدی اور اس کے بعد کے زمانوں مین وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مقامی آبادیوں اور آبادکاروں کے باہمی میل جول اور تبادلۂ خیالات میں زیادہ تیزی آ گئی۔

اس مضمون میں یہ جائزہ لینے کی کوشش کی گئی ہے کہ گزشتہ صدیوں میں مختلف قومیتوں کے اس باہمی ربط وضبط اور ایک دوسرے کے خیالات سے مسلسل استفادے کی بدولت اس نئی تہذیب نے کیوں کر جنم لیا اور کس طرح پھلی پھولی جسے آج ''گنگا جمنی تہذیب'' کہا جاتا ہے۔ علاوہ ازیں اس مضمون میں ان پانچ بڑے عوامل کی نشان دہی کی گئی ہے جنھوں نے اس ''گنگا جمنی تہذیب'' کی تجسیم اور تشکیل کے زمانی عمل پر اپنے اَن مٹ نقوش چھوڑے۔

قدیم ترین عہد میں چھوٹے چھوٹے باہمی رابطوں کے لیے مختصر ذخیرۂ الفاظ کے ذریعے کام چلایا گیا لیکن پھر بعد میں وقت کے ساتھ ساتھ حکمرانوں، مفکروں، صوفی شعرا، موسیقاروں، فنکاروں اور عمارت سازوں نے بھی اس نئے تعلق میں دلچسپی لینی شروع کی اور یوں مقامی روایات سے ترک۔ فارسی میل ملاپ بڑھتا گیا جو بعد میں بالآخر ایک دائمی تعلق کی شکل اختیار کر گیا۔ آتے جاتے سالوں میں اس بڑھتے ہوئے مختلف النوع تہذیبی پھیلاؤ کا مطالعہ واقعی بہت دلچسپ ہے پھر اس تہذیب کی اُس ترقی یافتہ ہیئت اور شکل کا بہت توجہ سے جائزہ لینا ضروری ہے کہ جس کے تحت ادب اور موسیقی کی مختلف صنفیں ظہور پذیر ہوئیں اور اس سے بڑھ کر یہ دیکھنا بھی چاہیئے کہ برصغیر کے موجودہ اہم ممالک ہندوستان اور پاکستان میں مذہبی عقائد اور ان کی پیروی کو کیسے رواج ملا۔

تیرھویں صدی کے پہلے چوتھائی حصے میں برصغیر کی شمالی مغربی سرحد متواتر تغیر پذیر رہی۔ اس کی وجہ تھی سرحد کے دونوں اطراف کے حکمرانوں کی سیاسی اور علاقائی خواہشات! اس خطے میں کہ جہاں کی حکومتیں اکثر برسرپیکار رہتی تھیں، لوگ مختلف ثقافتوں اور تہذیبوں سے تعلق رکھتے تھے

لیکن انہی بقائے باہمی کے اصول کے تحت اکٹھے رہنا تھا انہیں ایک دوسرے سے رابطوں کی اشد ضرورت تھی۔ اور اس ضرورت نے انہیں سب سے پہلے ایک دوسرے کی زبانوں سے متعارف ہونے کا طریقہ سکھا دیا تھا۔ تو پھر یوں ہوا کہ فارسی۔ ترک اور عربی زبانوں کے بہت سے الفاظ مقامی لوگوں کی زبان میں شامل ہونے لگے۔ اسی اثنا میں درویش اور صوفی حضرات اپنے عقائد اور عملیات کے بارے میں ایک دوسرے کے ساتھ تبادلۂ خیال کرنے لگے تاہم تاریخ گواہ ہے کہ مختلف ثقافتوں کا ملاپ ہمیشہ ہی آسان اور پُرامن نہیں رہا بلکہ باہمی ہم آہنگی کے لیے اچھی خاصی جدوجہد بھی کرنی پڑی۔ برصغیر کے کچھ حکمرانوں کے علاوہ علماء، صوفی، شاعر اور موسیقار، یہ حضرات ایسے تھے کہ جنھوں نے مختلف قومیتوں کے درمیان باہمی یگانگت کے لیے بے شمار پُرامن کوششیں کیں۔ مثال کے طور پر اکبر بادشاہ (۱۶۰۵-۱۵۵۶ء) نے مختلف بڑے مذاہب کے نمایاں اصولوں کا انتخاب کیا اور ان کے آمیزے سے ایک نئے مذہب "دین الٰہی" کی تشکیل کی اور اپنی رعایا کے سب ہی لوگوں کو اس نے یہ "دین" اختیار کرنے کی ترغیب دی۔ تاہم اکبر کی موت کے ساتھ ہی دین الٰہی کا بھی خاتمہ ہوگیا۔ مذہبی اعتقادت کی بات اپنی جگہ یہاں اکبر کے ذکر سے بتانا یہ مقصود ہے کہ اس نے اپنی رعایا کے کثیرالنسل اور مختلف ثقافتوں سے تعلق رکھنے والے لوگوں میں ایک خاص نوعیت کا توازن اور ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش کی۔ حقیقت یہ ہے کہ گنگا جمنی تہذیب ہم خیال لوگوں کی تنظیم اور ان کی مشترکہ کاوشوں ہی کا نام ہے۔

ایک مختصر سے جائزے کے محدود دائرے میں رہتے ہوئے ان سب افراد کا جنھوں نے ایرانی اور مقامی ثقافتوں کو باہم شیر و شکر کرنے میں اپنا مخصوص کردار ادا کیا، فرداً فرداً ذکر کرنا تو ممکن نہیں، تاہم ایسی ہستیوں کا ذکر ضروری ہے جنھوں نے گنگا جمنی تہذیب کی تشکیل میں بنیادی کردار ادا کیا۔ ان بڑی شخصیات میں شامل تھے: مفکر شاعر حضرت امیر خسرو (وفات: ۱۳۲۶ء) مولانا داؤد (۱۴۷۵-۱۴۰۰)، شیخ میر عبدالواحد بلگرامی (وفات: ۱۶۰۸ء) موجودہ دور کے عظیم قوال نصرت فتح علی خاں (۱۹۹۷-۱۹۴۹ء) اور جدید ہندی کے شاعر ہرونش رائے بچن (۲۰۰۳-۱۹۰۷ء)۔

جیسا کہ پہلے کہا گیا ہے تیرھویں صدی کے آس پاس، ایرانی اور مقامی حکمرانوں کی باہمی چپقلش کی وجہ سے ان دوں خطوں کی سرحد ہمیشہ آگے پیچھے سرکتی رہی۔ اس غیر مستحکم صورت حال کی وجہ سے ایران اور اس کے پڑوسی مما لک پر منگولوں کے حملوں نے مزید بگاڑ پیدا کیا۔ نتیجۃً وسط ایشیا اور ایران سے تعلق رکھنے والے عالموں، مفکروں اور فن کاروں کی ایک بڑی تعداد پناہ کی تلاش میں نکل کھڑی ہوئی۔ بھکر میں ناصر الدین قباچہ کا دربار اور اس کے علاوہ ملتان اور اوچ اُن کے لیے محفوظ مقامات تھے۔ پھر اگلے چند برسوں میں یہ تارکینِ وطن دہلی میں التمش کے دربار کی سرپرستی میں چلے گئے۔ یہ سب کے سب مختلف ہنروں اور موسیقی سے لیس تھے۔ اس کے علاوہ ان کے پاس ان کے اپنے مذہبی عقائد، زبانیں اور ادبی وشعری روایات بھی تھیں۔ انہوں نے نئے دیس میں اپنے سرپرستوں کے درباروں میں اس ورثے کا خوب استعمال کیا۔ یہاں انھیں شمالی ہندوستان کی مقامی ثقافت کو دیکھنے اور سمجھنے کا بھی موقع ملا۔ اس تال میل کے نتیجے میں ایک نئی زبان ''اردو'' (لفظی مطلب لشکری) نے جنم لیا جو لسانی لحاظ سے بہت ہی مالا مال تھی۔ اس کے علاوہ موسیقی کے نئے آلات جیسے تین تارا (ستار) ایجاد ہوئے اور غنائی موسیقی میں ایک نئی صنف ''قوالی'' کے نام سے ''متعارف ہوئی ادب میں بھی نئی اصناف کا اضافہ ہوا جیسے صوفی مثنوی اور غزل۔

حضرت امیر خسرو وہ نابغۂ روزگار مصنف تھے جنھوں نے اس خطے کی ادبی رویات کو فارسی زبان کی ادبی ولسانی اقدار سے خوب خوب مالا مال کیا اور یوں ان زبانوں کو انہوں نے باہم قریب لاکر یگانگت کے رشتے مستحکم کیے۔ حضرت ابوالحسن امیر خسرو کے لیے یہ ادبی تال میل کوئی مشکل کام نہ تھا اُس لیے کہ وہ ۱۲۵۳ء میں ہندوستان ہی میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کا خاندان وسط ایشیا سے ہجرت کر کے یہاں آکر آباد ہوا تھا۔ ان کی ادبی شان کے کیا کہنے! وہ اپنی فارسی مثنویوں جیسے نہ سپہر، خالق باری وغیرہ کے لیے مشہور تھے لیکن ان کی شہرۂ آفاق شعر گوئی میں اور چیزیں بھی شامل تھیں جیسے دوہے، کہہ مکرنیاں، پہیلیاں وغیرہ جو انہوں نے اردو میں لکھیں اور سندِ قبولیت پائی۔

حضرت امیر خسرو وہ پہلے صاحب قلم تھے جنھوں نے فارسی کے ساتھ ساتھ مقامی بولیوں میں بھی لکھا اور اس کے پیچھے ایک دلچسپ قصہ ہے اور یہ کہ ایک بار وہ شاہی دربار سے واپس آرہے تھے تو ایک عورت نے جو ان کی گلی کی صفائی کیا کرتی تھی، ان سے کہا کہ وہ اس کے بیٹے کو فارسی اور ترک زبان سکھا دیں تا کہ اس تعلیم کی بنیاد پر اُسے بھی کوئی اچھی نوکری مل جائے تو کہتے ہیں کہ حضرت امیر خسرو نے روزمرہ زندگی میں مستعمل الفاظ کے عربی و فارسی مترادف الفاظ سکھانے کے لیے ایسے اشعار تحریر کیے جن میں انہوں نے ہم معنی الفاظ برتے۔ اس سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ حضرت امیر خسرو نے ان اشعار کے ذریعے کتنا اہم مختلف لفظی ذخیرہ تیار کیا جو کئی زبانوں پر مشتمل تھا۔ ان کے اشعار زباں زدِ عام ہوئے اور آج بھی لوگوں کو زبانی یاد ہیں اس لیے نہیں کہ ان کی نظموں کی بدولت مختلف زبانوں کے الفاظ سے روشناسی حاصل ہوتی ہے بلکہ اس لیے کہ اختصار کے باعث کسی خاص کوشش کے بغیر اشعار یاد ہو جاتے ہیں۔ اُن کے اشعار کی خوبی اور خوبصورتی یہ ہے کہ لوگ اپنے عقیدے اور سماجی حیثیت سے قطع نظر، ان کی شاعری سے خوب لطف اندوز ہوتے ہیں۔ فارسی اور ہندی کے خوب صورت امتزاج سے امیر خسرو نے اپنی نوعیت کی ایک بہت خوب صورت نظم لکھی۔ اس کا ایک مصرعہ فارسی میں اور دوسرا ہندی میں ہے مثال کے طور پر

زحالِ مسکیں مکن تغافل ــــــ دورائے نیناں ، بنائے بتیاں

ملی جلی ترکیب کا یہ انداز آج بھی مقبول ہے اور جوش و جذبہ سے بھر پور قوالیوں میں دیکھا جا سکتا ہے۔

حضرت امیر خسرو ایک عظیم زیرک شاعر تھے۔ انہوں نے نہ صرف عملاً فارسی اور مقامی بولیوں اور برصغیر کی ادبی روایات کے مابین باہمی قربت کی راہ ہموار کی بلکہ ایک نمایاں کام یہ بھی کیا کہ مختلف قومیتوں کے لوگوں کے درمیان یگانگت پیدا کی۔ یہ وہ کام تھا جو بعد میں آنے والے ادوار میں بھی بخوبی جاری و ساری رہا۔ یہ نابغۂ روزگار شخصیت ۱۳۲۶ء میں اس جہان فانی سے کوچ کر گئی لیکن جس کام کا انہوں نے آغاز کیا تھا وہ بعد میں بھی جاری رہا یعنی بیرونی قومیتوں کے

لوگوں اور مقامی آبادیوں کا باہمی میل ملاپ بخوبی بڑھتا گیا۔ ادھر نئے رنگ کا تحریری سلسلہ بھی رکا نہیں بلکہ ہمیں ۱۳۷۹ء میں ایک خوبصورت شعری تخلیق کا نادر تحفہ ''کندیان'' کے نام سے نظر آیا جو مولانا داؤد نے فارسی زبان کی ایک مقبول شعری صنف مثنوی کی شکل میں اودھی زبان میں لکھی۔ انہوں نے ایک عشقیہ داستان کو نظم کیا لیکن اس میں ادبی روایات کو نباہتے ہوئے روحانی اعتقاد اور رسوم کو بھی مدِ نظر رکھا۔ مولانا داؤد کا چشتی سلسلہ سے تعلق تھا اور وہ اپنے زمانے کے صوفی بزرگ شیخ زین الدین کے مرید تھے۔

مختلف ادوار سے گزر کر یہ تحریری سلسلہ اکبر اعظم کے زمانے میں نظر آیا اُس کے چار سو پندرہ منصب داروں میں سے ایک منصب دار عبدالواحد بلگرامی بھی تھے۔ اپنے پیشہ ورانہ امور کے علاوہ وہ قلم کے دھنی بھی تھے اور فارسی زبان میں لکھتے۔ ''حال شباہت'' اور ''کلماتِ قند'' ان کی بہت عمدہ تصنیفات تھیں لیکن ان کی ایک اور کتاب 'حقائق ہندی' ان کی خاص پہچان بنی اس لیے کہ اس کتاب نے مقامی ہندوستانی باشندوں اور بادشاہ کے فارسی اور عربی بولنے والے درباریوں کے درمیان باہمی پہچان کے رشتے استوار کرنے میں اہم رول ادا کیا۔ دربار اکبری کے وہ لوگ جو مقامی زبانوں یا بولیوں کو نہیں سمجھتے تھے، اس کتاب کی بدولت مختلف مروجہ مقامی الفاظ ان کے معنی اور مترادفات کو بخوبی سمجھنے لگے تو اس طرح اس کتاب نے دو قومیتوں کے درمیان دوستی اور یگانگت کے رشتوں کو لسانیات کے ذریعے فروغ دیا۔

عبدالواحد بلگرامی کا مذکورہ تحریری کام بہت شاندار اور یادگار نوعیت کا تھا۔ ان سے قبل کسی اہل قلم نے ایسی کوئی تصنیف پیش نہیں کی تھی کہ جو ہندوستان کی ثقافتی اور مذہبی لحاظ سے دو مختلف قومیتوں کے منصبی اعتقادات اور رسومات کی علامتی اہمیت کو تحریری تشریح کے ذریعے اجاگر کرتی ہو۔ بلگرامی وہ پہلے مصنف تھے کہ جنھوں نے اپنی تحریر کے ذریعے ہندوستان اور مسلمانوں کی باہمی مماثلتوں کو نمایاں کیا اور یوں ان کے اختلافی معاملات کو کم کرنے کی شعوری کوشش کی۔ اس کام کے ذریعے وہ اپنے طبقے میں سب سے منفرد اور الگ تھلگ نظر آنے لگے۔ تاہم حقیقت یہ

ہے کہ بلگرامی ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب کی تاریخ میں ایک بہت ہی اہم مقام رکھتے ہیں۔ ہندوستان کے مذہبی تقابلی موضوع پر ان کی کتاب غالباً ایک بنیادی تصنیف کا درجہ رکھتی ہے۔

''حقائق ہندی'' ایک بہت منضبط اور باسلیقہ ادبی نوعیت کا تحریری کارنامہ ہے ایک صوفیانہ اندازِ تحریر کہ جس سے بلگرامی بخوبی آشنا تھے، اس کتاب کا آغاز ''حمد'' سے ہوتا ہے جس میں رب جلالہٗ کی شان میں چند اشعار ہیں۔ جس کے بعد ''عرض مصنف'' کے عنوان سے دیباچہ ہے جس میں صاحبِ کتاب نے یہ لکھنے کی ضرورت/وجوہات بتائی ہیں۔ بلگرامی لکھتے ہیں کہ ایک ایسی ادبی دستاویز کی ضرورت ہے کہ جو مختلف ہندی الفاظ کے رمزیہ/متشابہ معانی کی تشریح کرے نہ کہ محض لغوی مطالب بتائے۔ ایک ماہر لسانیات کی طرح انہوں نے یہ بھی بتایا کہ ایک لفظ مختلف سیاق و سباق اور مختلف ماحول میں اپنا مطلب بدل سکتا ہے اس لیے کسی بھی لفظ کے متنوع پہلوؤں کو دیکھ کر ہی یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ کہ وہ رمزیہ اور متصوفانہ حوالوں سے اپنے اندر کیا کیا مطالب رکھتا ہے۔ اگر ہم یہ بات ذہن میں لائیں کہ لسانیات کا مطالعہ قدرے جدید دور کا موضوع ہے تو ''حقائقِ ہندی'' تحریر کرنے کی ضرورت کے بارے میں بلگرامی وضاحت کرتے ہوئے ایک گہری بات کر جاتے ہیں اور یوں وہ اپنے وقت سے بہت آگے نظر آتے ہیں۔

''حقائق ہندی'' کا تکنیکی مطالعہ بہت دلچسپ ہے۔ یہ بڑی حیرت زا بات ہے کہ اپنی اس کتاب میں بلگرامی ''حمد'' کے فوراً بعد اصل مطلب کی بات پر آجاتے ہیں یعنی ''حمد'' کے بعد جو انہوں ان نے ''پہلی سرخی دی'' وہ ہے ''مثنوی''۔ اس موقع پر اس خاص لفظ کا انتخاب ایک دلچسپ بات ہے۔ 'مثنوی' فارسی زبان کا لفظ ہے، اس کا مطلب ہے دو مصرعوں پر مشتمل ایک شعر۔ اس کا ماخذ عبرانی زبان کا لفظ ''مشنا'' ہے جس کا مطلب ہے دو۔ چنانچہ لفظ مثنوی 'کو ثنویت' یا 'دوہریت' کا مطلب خلقی طور پر ملا ہے۔ ''مثنوی'' فارسی ادب کی ایک خاص شاعرانہ صنف ہے جو طویل بیانیہ طرز کے ہم قافیہ اشعار پر مشتمل ہوتی ہے۔ اس بات کا بہت امکان ہے کہ اکبر اعظم کے دربار سے تعلق رکھنے والے منصب دار فارسی شاعری کی خاص صنف ''مثنوی'' کا اچھا ذوق رکھتے تھے۔

خصوصاً مولانا جلال الدین رومی (۱۲۷۳۔۱۲۱۷ء) کی مثنوی کا وہ ''سماع'' کے رواج سے بھی بخوبی آشنا تھے جس میں روحانی تسکین کے لیے موسیقی کا اہتمام کیا جاتا تھا۔ کتاب میں اپنے مضمون کے آغاز میں بلگرامی لفظ ''مثنوی'' کی تشریح کرتے ہوئے یہ اصول طے کر دیتے ہیں کہ کسی بھی لفظ یا تالیف کو سمجھنے کے لیے اسے اس کے سیاق و سباق کے ساتھ دیکھنا چاہیئے۔ ہر لفظ یا جملے کو سوچ سمجھ کر دیکھنا چاہیئے اس لیے کہ ان کے مطالب سیاق و سباق کی تبدیلیوں کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔ مزید برآں اگر کسی لفظ یا جملے کو کسی رمز یا علامت کے طور پر استعمال کیا گیا ہو تو اس کے کثیر رخی مطالب بن جاتے ہیں اس اصولی تعین کے بعد بلگرامی ان اہم الفاظ کے مطالب بتاتے ہیں جو دربار میں مستعمل تھے اور جن سے ایرانی عالم نابلد تھے وہ عام استعمال ہونیوالے کسی لفظ یا جملے کے سیاق و سباق کی عمومیت کی بھی تشریح کرتے ہیں اور ان سے ملتے جلتے ان الفاظ و مطالب کو بھی بہ تکرار بتاتے ہیں جو ہندو اور اسلامی روایات میں موجود تھے۔

بلگرامی اُن علاقائی قسم کے انداز اظہار کی نامانوسیت سے پوری طرح آگاہ تھے جس سے اکبر اعظم کے دربار میں ناموافقت اور بے رغبتی پائی جاتی تھی۔ سو ایک بار دربار میں بلگرامی نے ایک موسیقی کی محفل میں فرد کی استقامت کی اہمیت کو سمجھانے کے لیے ستار اور سرود کی مثال دی اور کہا کہ ان کے تاروں سے نکلنے والی آواز بہت انجانے طریقے سے سننے والے کے دل میں دائمی محبت کے جذبات جگاتی ہے اور اسرار کے پردے اٹھاتی ہے۔ سامع یہ سوچتا ہے کہ جیسے یہ مادی دنیا اور آخرت کی دنیا' دونوں کی دونوں آلۂ موسیقی کا مرکزی حصہ ہیں۔ اور جو کچھ بھی تخلیق کیا جا چکا ہے، وہ دائمی عشق کی موسیقی کے سازوں کے مختلف حصوں یا ان کی کھونٹیوں کی طرح ہیں تو ہمیں چاہیئے کہ ہمہ وقت ہم مخفی علم حاصل کریں جو ہم تک مختلف مظاہر کے ذریعہ ہی پہنچتا ہے''

بلگرامی مزید کہتے ہیں: تار اور موسیقی اپنے اندر روحانی اسرار چھپائے ہوئے ہیں۔ ایک صوفی کو چاہیئے کہ وہ ہر اس چیز کو ترک کر دے جو اس کے اپنے من کی دنیا کے لیے مناسب نہ ہو تاکہ اسے اپنے وجود کے اندر مخفی علم کی موسیقی کی گونج سنائی دے۔ ایک نو آموز پہلے اپنی باطنی

صفائی کرے اور اس طرح خود کو مخفی علم کے حصول کے لیے تیار کرے۔ الوہی علم ہمارے ارد گرد مختلف مظاہر کے ذریعے پوری طرح آشکار ہے تو پھر کوئی کیسے موسیقی کی دُھن کے اس اعجاز کی وضاحت کرے جو محض لکڑی کے ایک خشک ٹکڑے اور بوسیدہ تار سے برآمد ہوتی ہے۔'' آگے چل کر بلگرامی دو حکایتوں کا بھی حوالہ دیتے ہیں جو مسلمانوں اور ہندوؤں دونوں کے لیے یکساں طور پر بڑی کشش رکھتی ہیں۔ ایک حکایت کا تعلق اسلامی روایت سے ہے جب کہ دوسری کا تعلق ہندوستانی روایت سے ہے۔

جیسا کہ پہلے کہا گیا ہے ''حقائق ہندی'' ایک بہت منفرد کتاب ہے کہ جس میں ہندو اور مسلم فلسفوں کا تقابلی مطالعہ پیش کیا گیا ہے اور یہ اپنے وقت کا ایک اچھوتا خیال تھا۔ بلگرامی کا یہ کہنا کہ کسی جملے یا لفظ کا لغوی مطلب اپنی وسعت کے حساب سے محدود ہوتا ہے اور اسی وجہ سے وہ الٰہیاتی تصورات کے اظہار میں ناکام رہتا ہے۔ اپنی جگہ بالکل صائب بات ہے۔ ایک تشریح کسی خاص لفظ کی تعریف کر کے اس کی دقیق نکتہ رسی کو محدود کر دیتی ہے ہاں اگر اس لفظ کے رمزیہ مطالب بھی بتائے جائیں تو پھر اس کا اصل تصویری خاکہ یا منظر نامہ سمجھ میں آتا ہے۔ دراصل لفظ میں چھپی رمزیت کی قوت اسے غیر مطلق تشریح کی تنگ حدود سے چھٹکارہ دلاتی ہے۔ یہ محدودیت ہمہ دم سائے کی طرح لفظ کے ساتھ رہتی ہے۔ جب لفظ کو اس رمزیت کے حوالے کے ساتھ دیکھا جائے جو وہ خود میں سموئے رکھتا ہے تو وہ فوراً اپنی کایا پلٹ دیتا ہے اور ایک متمول جوہری کے مانند وہ طرح طرح کی شبیہوں خوشبوؤں اور محسوسات سے مالا مال نظر آتا ہے اور اگر اُسے اس کے ساحرانہ ورثے سے محروم کر دیا جائے تو پھر وہ محض ایک عام سے اظہار کا ذریعہ بن کر رہ جاتا ہے۔ جسے محدود سوچ والے آدمی استعمال کرتے ہیں اپنی ذات کے محدود پہلو ظاہر کرنے اور یہ بتانے کے لیے کہ وہ ہر دستیاب لفظ کی تشریح کس قدر محدود طریقے سے کرتے ہیں۔ اپنی رمزیہ قدر کے بغیر ایک لفظ بالکل ایسے ہی ہے کہ جیسے کوئی شخص بغیر کسی منفرد صلاحیت، تخیّل بلکہ ذہانت کے بغیر ہو۔

اگرچہ یہ بات درست ہے کہ نصرت فتح علی خان سے بہت پہلے قوالی کی موسیقی نے ہر

عقیدے اور مذہب کے لوگوں کو اکٹھا کرنے میں بہت اہم رول ادا کیا تھا لیکن نصرت فتح علی خاں وہ پہلا قوال ہے کہ جس نے روائتی انداز سے ہٹ کر قوالی کے مروجہ فن میں جدّت پیدا کرنے کے لیے پہل کی۔ اُس نے قوالی میں پہلی بار مغربی آلاتِ موسیقی کا استعمال کیا جب کہ عقیدت میں ڈوبے قوالی کے اشعار مقامی ماحول کے مطابق تھے۔اس مشرقی و مغربی امتزاج کے ساتھ اس کی گائی ہوئی قوالیاں ''جدید'' کہلائیں۔ نصرت نے اسٹیج پر نئی قوالی کے ساتھ اپنے فن کے مظاہرے کیے اور شائقین نے پہلی بار گٹار کی سریلی لہروں پر اُسے قوالی گاتے ہوئے سنا۔اس نے زیادہ تر ہندی زبان کی ''بھگتی'' شاعری کے بولوں پر اپنے فن کا جادو جگایا۔ یہ جدید انداز کی قوالی سن کر لوگ جھوم جھوم گئے۔ ان شائقین میں نوجوان نسل کے لوگ بھی شامل تھے۔مغربی دنیا میں بھی اس نے اپنی قوالیاں پیش کیں جنھیں سن کر وہاں کے لوگوں نے بھی بہت حظ اٹھایا۔ یوں اس نے ہر جا اپنی مقبولیت کے جھنڈے گاڑے۔ یہاں تک کہ ہندوستان میں بھی اس کے دیوانے موجود تھے۔ یہ بات جاننے سے قبل کہ آج کے برصغیر پاک و ہند کی گنگا جمنی تہذیب کی ترویج میں نصرت فتح علی خاں کا جو حصہ ہے اس کی اہمیت کیا ہے۔ ہمیں پہلے یہ سمجھنا ہوگا کہ قوالی ہے کیا؟

اپنی کتاب ''صوفی میوزک آف انڈیا اینڈ پاکستان'' میں مصنفہ رگولا قریشی قوالی کی صنف کا ان الفاظ میں تعارف پیش کرتی ہیں۔ ''قوالی بنیادی طور پر ایک ایسا عملی فنِ لطیف ہے جس نے (صدیوں پہلے) صوفی کے سماع کی محفلوں میں جنم لیا اور آج بھی اسے صوفی ازم کی ایک بنیادی رسم کا درجہ حاصل ہے۔ ایک روحانی پیشوا یا شیخ کے زیر ہدائت تربیت یافتہ موسیقاروں کی ایک جماعت ایسا گیت پیش کرتی ہے جس میں شاعری کا وسیع خزانہ چھپا ہوتا ہے اور جس میں متصوفانہ تجربات پر مبنی برجستگی کے ساتھ ایسے سُر جگائے جاتے ہیں کہ جنھیں سن کر سامعین پر روحانی وجد طاری ہو جاتا ہے۔ ایک عامل صوفی اپنے سمعی عمل یعنی سماع کے ذریعے اپنے زندہ پیر یا مرشد سے اپنے روحانی واسطے کو بڑھاتا ہے اور اس کے ساتھ اُن ولیوں سے بھی جو اس دنیا سے جا چکے حتیٰ کہ یہ واسطہ اسے خدا تک رسائی دیتا ہے۔'' (قریشی: ۱ : ۱۹۸۶ء)

لفظ ''قوالی کی بنیادی جڑ ایک عربی لفظ ''قول'' ہے جس کا مطلب ہے ''کہنا'' یا ''بیان''۔ بنیادی طور پر عظیم روحانی بزرگوں کے پُر معنی اقوال یا بیانات کو ایک قوالی کے مرکزی متن میں سمویا جاتا ہے۔ قوالوں کی اکثر جماعتوں میں ایک مقدم قوال ہوتا ہے جو بڑی نادر یادداشتوں کا مالک ہوتا ہے اور قوالی پیش کرتے ہوئے وہ کوئی کتاب دیکھے بغیر محض اپنی یادداشت کے زور پر، ایسے اشعار اور شعری ٹکڑے سامنے لاتا ہے کہ جن کی مدد سے وہ اپنی اصل نظم یا گیت کو شاہکار بنا دیتا ہے اور یوں سماں باندھ دیتا ہے۔ ایسا کرتے ہوئے وہ اس بات کو نہیں دیکھتا کہ جو شعر یا شعری ٹکڑا اس نے عاریتاً اپنی قوالی میں استعمال کیا ہے، اس کا مصنف کون ہے اور وہ کس زبان یا بولی کا ہے؟ اور ایسے ہی دیگر کسی حوالے سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ مستعار لیے جانے والے ان اشعار کا انتخاب ان کی صرف اس خوبی کی بناء پر کیا جاتا ہے کہ جس کی بدولت پیش کی جانے والی قوالی کے روحانی پیغام اور اس کے حسن میں اضافہ کیا جا سکے۔ اگر مستعار شعر یا جملے میں کوئی ایسا پیغام موجود ہو جو ہم خیال/ باذوق سامعین کو سنائے جانے کے قابل ہو تو قوالی اسے بلا جھجک قبول کر لیتی ہے۔ کہیں سے اشعار یا جملے مستعار لے کر انہیں اصل قوالی کے متن میں جوڑ کر استعمال کرنے کے اس عمل کو ''گرہ لگانا'' کہا جاتا ہے۔ اور جیسا کہ پہلے کہا گیا ہے، اس عمل کا مقصد اصل قوالی کے پیغام کی مزید وضاحت کرنا ہوتا ہے۔ چنانچہ ''گرہ لگانے'' کا عمل کافی اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔

برصغیر میں اردو ادب بلکہ اردو شاعری کے دست گیر زیادہ تر مسلمان رہے ہیں اور در حقیقت مسلمانوں کے لیے شراب کا استعمال مذہباً ممنوع ہے لیکن شائد یہ دل چسپی کی بات ہے کہ اردو شاعری میں وہ لمحات بہت دل کش سمجھے گئے جب کسی شاعر نے شراب کی تعریفیں بیان کیں۔ اب یہاں سوال یہ ہے کہ کیا ہم اصلی شراب کی بات کر رہے ہیں یا شراب کا استعاراتی طور ذکر کیا گیا ہے کہ اچھی شاعری وہ ہے کہ جسے قاری جب بھی پڑھے تو اس میں ایسے نوع بہ نوع رنگوں کا ایک جہان نظر آئے یوں سمجھ لیں کہ پیاز کے چھلکوں کی طرح یا گلاب کی پنکھڑیوں کی طرح یا گول دائرے میں پھیلے اس کنول کی طرح کہ جب وہ کھِلتا ہے تو وہ راز کھُلتے جاتے ہیں جو وہ اپنے اندر

چھپائے ہوتا ہے، شاعری بھی ایسی ہی ایک چیز کا نام ہے اردو ادب کی روایت کے مطابق سب سے بڑے شاعر وہ کہلائے کہ جنھوں نے اپنی تمام تر فنی مہارتیں نشے کی تشریح میں صرف کیں۔

اردو کی خمریاتی شاعری میں استعمال ہونے والے الفاظ کو اگر ان کے رمزیہ اور متصوفانہ حوالوں کے ساتھ سمجھا جائے تو قاری کو اپنی پہلی نظر سے ایک بالکل مختلف تصویر نظر آئے گی۔ دراصل سیکولر اور روحانی دونوں سطحوں پر اردو کی خمریاتی شاعری کا مزہ لینا ہو تو اس شاعری میں مستعمل ذخیرہ الفاظ اور ان کی رمزیت کو سمجھنا ازبس ضروری ہے۔ اردو شاعری کے نقاد نشے والے ذخیرۂ الفاظ اور ان کے مطالب سے پوری طرح آگاہ ہوتے ہیں۔ فیض احمد فیض کی شاعری کے ایک بڑے حصے کو عام طور سے ایک کچلی ہوئی مزاحمتی چیخ یا ایک ایسا سیاسی تبصرہ سمجھا گیا جسے کھلے اظہار کی اجازت نہ دی گئی ہو۔ دراصل رمز و کنایہ کے ساتھ کوئی بات کہنے سے شاعر اور اس کے سامعین کو بہت فائدہ پہنچتا ہے اس طرح وہ ان مسائل پر بہت کچھ کہہ اور سمجھ لیتے ہیں کہ بصورت دیگر جن پر اظہار خیال کسی خاص در پیش سیاسی ماحول میں ممنوع ہو یا خطرناک بھی ثابت ہو سکتا ہو۔ باہمی دلچسپی کے ان مسائل پر بات کرنے کے لیے شاعر اور اس کے سامعین بنیادی طور پر کسی خفیہ کوڈ یا رمزی زبان میں کچھ کہنے اور سمجھنے کے ڈھنگ سے بخوبی آشنا ہوتے ہیں۔ اور یہ مسائل ایسے ہوتے ہیں کہ جن پر وہ سرزنش کے خوف سے کھلم کھلا تبادلۂ خیال نہیں کر سکتے۔ مثال کے طور پر اس شعر میں شاعر کا خیال دیکھیے۔

ہم تو سمجھے تھے کہ برسات میں برسے گی شراب   آئی برسات تو برسات نے دل توڑ دیا

مندرجہ بالا شعر میں شراب کا ذکر تو ہے لیکن اس سے پیدا ہونے والے نشے کی کوئی بات نہیں ہے البتہ اس شعر کے ذریعے شاعر دکھی انداز میں اپنی گم شدہ یا اس خیالی جنت کی بات کرتا نظر آتا ہے جس کے بارے میں وہ خواب دیکھتا تھا اور وہ خواب ٹوٹ کر رہ گئے۔ لیکن اس شعر کا مطلب اس طرح بھی لیا جا سکتا ہے کہ آزادی کے حصول کے بعد جب وہ ساعت آئی جس کا سبھی کو بہت بے تابی سے انتظار تھا تو بدقسمتی سے حالات ایسے پیدا ہوئے کہ کسی کو مساوات اور انصاف نہ ملا اور یوں سب

کے دل ٹوٹ کر رہ گئے۔ اس شعر کے حوالے سے یہاں یہ بتانا مقصود ہے کہ دراصل اردو ادب خمریاتی شاعری سے بہت مالا مال ہے اور مذکورہ بالا شعر کے بتائے گئے مطالب وہ شخص جان نہیں سکتا جو شاعری کی رمز و کنایہ کی دنیا کو نہیں سمجھتا۔ افسوس کا مقام یہ ہے کہ آزادی کے بعد بھارت میں اردو کی تعلیم کو زوال آ گیا۔ اور اردو ادب کا شعری خزانہ تیزی سے گمنامی کی نذر ہوتا جا رہا ہے

اس پس منظر میں جب ہم دیکھتے ہیں کہ بھارت کے ایک محقق سکالر اور ہندی زبان کے شاعر ہری ونش رائے بچن (۲۰۰۳۔۱۹۰۷ء) نے اردو کی خمریاتی شاعری کو بچانے اور محفوظ کرنے کا ایک اچھا اور دلیرانہ کام کیا اور وہ اس طرح کہ انہوں نے شراب اور نشے کے مضامین کو اپنی جدید ہندی شاعری میں بڑی خوبی سے منتقل کیا اور اپنایا۔ بچن جن کا تعلق الہٰ آباد سے تھا اردو کی 'خمریاتی شاعری' کے اسرار کو سمجھتے تھے اور انہوں نے یہی اسرار اردو سے ہندی میں بڑی چابک دستی سے منتقل کیے۔ بطور شاعر انہوں نے خود اردو کی 'خمریاتی شاعری' کی اصطلاحات کا سنسکرت میں بھی بخوبی ترجمہ کیا، اس طرح کہ اپنے ترجموں میں انہوں نے الفاظ اور محاوروں کو بعینہٖ یعنی اصل حالت میں رکھا۔

ہری ونش رائے بچن نے اردو کی 'خمریاتی شاعری' کے مضامین اور روایات کو جس طرح اپنایا اور برتا اس سے گویا ہندی ادب کے قاریوں کو اردو ادب کے سمندر میں چھپے نئے خزانے ہاتھ آ گئے ہیں۔ ان کا ایک کارنامہ یہ بھی ہے کہ انہوں نے یہ بانگ دہل اپنے ایک بیان کے ذریعے ہندی ادب کے پڑھنے والوں کو یہ باور کرایا کہ ایک پہیئے کے اندرونی چکر میں لگے تاروں کی طرح سبھی راستے ایک ہی منزل کی طرف جاتے ہیں اور یہ منزل ہے ایک مطلق یا حتمی سچائی، اُن کی اس مبنی بر حقیقت آواز نے ایک منقسم، متعفن، متحرک اور شکوک سے لبریز ماحول کو ایک تازگی سے روشناس کرایا۔ اس طرح وہ راقم الحروف کی نظر میں ان بے شمار ہستیوں میں سے ہیں کہ جنھوں نے برصغیر میں ترک۔ فارسی اور ہندی روایات کو آپس میں گوندھ کر ایک نئے کلچر یعنی گنگا جمنی تہذیب کی باہمی یگانگت کو فروغ دیا

محمد انور معین زبیری مجدّدی

شاعرِ تصوف ومعرفت۔۔ حضرت خواجہ میر دردؒ

صوفیانہ شاعری کا پودا جو حضرت ابوسعید ابوالخیر رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی رباعیات کے ذریعے پانچویں صدی ہجری میں لگایا تھا اس کی مزید آبیاری اُس دور کے حکیم سنائی نے کی وحدت الوجود کے مسائل پہلی بار حضرت ابوسعید ابوالخیر رحمۃ اللہ علیہ نے فارسی شاعری میں داخل کیے گویا کہ وہ حضرت خواجہ میر درد علیہ الرحمہ کی طرح فارسی شعر وادب کے لیے یہ دعویٰ کر سکتے تھے کہ

''میں یاں زمینِ شعر میں یہ تخم بو گیا''

یہ وہ دور ہے کہ جس دور میں فارسی شاعری کا سارا کمال قصیدہ گوئی میں ہی سمجھا جاتا تھا مگر اسی نظریہ میں تبدیلی کا سہرا کسی حد تک سنائی کے سر ہے کیوں کہ انہوں نے جذبات اور مسائل کو یکجا کیا اور نہ صرف صوفیانہ خیالات میں وسعت پیدا کی بلکہ اسلوب بیان میں بھی ان کو غزل کے ساتھ وابستہ کر کے موثر بنا دیا۔

چھٹی صدی ہجری کے اختتام پر روبہ آفاق حضرت شیخ فریدالدّین عطار نظر آتے ہیں۔ ان کا بڑھاپا اور مولانا روم کا بچپن منطبق الوقت ہے حضرت بہاؤالدین اپنے بیٹے کے ساتھ خراسان سے مکہ مکرّمہ کے لیے روانہ ہوئے راستے میں نیشاپور میں حضرت فریدالدّین عطار سے ملاقات ہوئی جنہوں نے اس بچے کو دیکھ کر حضرت بہاؤالدین سے فرمایا کہ ''زود باشد کہ ایں پسرِ تو آتش بہ سوختگانِ عالم زند'' اور پھر یہی ہوا کہ حضرت عطار کی پیشگوئی پوری ہوئی اور مولانا رومؒ نے اپنی مثنوی کے ذریعے واقعی سوختگانِ عالم کے دلوں میں آگ لگا دی۔ جو قلوب عشقِ حقیقی کی تپش سے سلگ رہے تھے ان کی آتش عشق بھڑک اٹھی اور یہی مثنوی مولوی معنوی کے عارفانہ مضامین کا کمال تھا۔ مولانا رومؒ نے اپنی مثنوی میں ایک جگہ فرمایا ہے

ہفت شہرِ عشق را عطار گشت ۔ ماہنوز اندر خمِ یک کوچہ ایم

یہ عجیب ہی دنیا ہے یعنی یہ دنیائے معرفت یہ سیرِ سلوک یہ اہل تسلیم ورضا یہ اہلِ توکل یہ جلال وجمال کے مالک یہ حال وقال کی راہ کے مسافر یہ صاحب ورع وتقویٰ یہ دنیا سے اہل دنیا سے بے نیاز اُسی بے نیاز کی نیازمندی میں غرق یہ حضرات!

آئینۂ عدم میں وہ ہستی ہے جلوہ گر ہے موجزن تمام یہ دریا سراب میں (میر درد)

بس یہ تمام بھید ہے یہ ایک 'سرِّستان' ہے۔ اس بھید کو جو پا گیا وہ اسی دریا میں اندر ہی اندر اترتا چلا گیا یعنی "آں را کہ خبر شد خبرش باز نیامد۔" وہ جو غالب نے کہا تھا 'عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا'۔ یعنی جب انسان سرورِ کامل سے بھرپور ہو کر وجد وحال کی کیفیت کا استقلال حاصل کر لیتا ہے۔ اور اُس سعادت کو پالیتا ہے جو روح کو اس فانی دنیا میں آنے سے پہلے میّسر تھی اُس لمحۂ سرور کے لیے تو اہلِ شوق جنت کو بھی قربان کرنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں بقول حضرت مجدد الف ثانیؒ امامِ ربانی جب سیرِ سلوک میں سالک ہمہ تن جذب ہو جاتا ہے یعنی جب اللہ اور اس کے درمیانی فاصلے مٹ جاتے ہیں جب کیفیت جذب طاری ہوتی ہے بنابریں اس سیر کو سیرِ معشوق در عاشق کہتے ہیں یعنی معشوق اپنے عاشق کے لطائف کے آئینوں میں جلوہ گر ہو رہا ہے بقول حضرت میر درد

حیران آئینہ وار ہیں ہم کس سے یارب دو چار ہیں ہم

اُردو شاعری میں تصوّف کی اقدار بھی فارسی ہی کے فیض سے قائم کی گئیں اور اس رنگ کے موجد یقیناً حضرت خواجہ میر درد علیہ الرحمہ ہی تھے جنھوں نے فارسی شاعری سے متاثر ہو کر اپنی وارداتیں اُردو شعر کے قالب میں منتقل کیں۔ اٹھارویں صدی عیسوی کے اوائل میں دہلی میں شعر وادب کی عمارت جن چار ستونوں پر قائم تھی ان میں میر درد کو کئی اعتبارات سے امتیازی حیثیت حاصل ہے۔ وہ ایک صوفی باصفا ہیں جن کی زندگی استغنا اور توکل کا نمونہ ہے دوسرے ان کی شاعری بیش تر غزل اور صوفیانہ غزل تک محدود ہے جن میں خیالات کی پاکیزگی اور جذبات کا خلوص قدم قدم پر ملتا ہے تیسرے تمام معاصر اور متاخر تذکرہ نگاروں نے انکا ذکر اپنے تذکروں

میں بے حد احترام اور ادب سے کیا ہے میر تقی میر نے بھی اپنے تذکرے 'نکات الشعراء' میں صرف اور صرف حضرت خواجہ میر درد کے ذکر میں ادب و احترام کا بے حد خیال رکھا ہے گویا کہ میر درد اُس دور کی انتہائی محترم اور سر برآوردہ شخصیت تھے۔

حضرت خواجہ میر درد علیہ الرّحمہ جہاں عظیم شاعر تھے وہاں وہ ایک مذہبی ہستی جن کا اوڑھنا بچھونا تصوّف تھا کہ یہ ان کو ورثے میں ملا تھا وہ ایک نکتہ سنج صوفی تھے ان کے نزدیک تصوّف مقصود بالذّات ہے اور ان کی شاعری ان کے تصوّف سے ابلاغ کا وسیلہ ٹھہری۔ ان کو سمجھنے کے لیے ان کی شخصیت کا مطالعہ ضروری ہے تصوف ان کے مزاج میں رچا بسا تھا اور ایک صوفی کی حیثیت سے "غمض! الطرف عنِ الکون" (دنیا کی طرف سے آنکھیں بند کر لینا) ان کا مسلک تھا۔ جس وقت نادر شاہ درانی کی افواج نے دہلی کو تاخت وتاراج کیا ہے اور مخلوق میں بھگدڑ مچی ہوئی تھی ہر شخص لکھنؤ کا رخ کر رہا تھا مگر ایسے اضطرابی دور میں بھی میر درد اپنے دامن میں پاؤں سمیٹے سجّادہ فقر پر اطمینان سے بیٹھے رہے کہ ان پر ہر لحہ عشق کا زور تھا یہی عشق کہ مجازی رنگ میں ہو یا حقیقت کے ان کی شاعری میں سب سے بڑا محرّک ہے۔

شغل اچھا ہے عشق بازی کا حقیقی کا یا مجازی کا

اسی عشق نے انکی شخصیت کی تشکیل کی اور یہی ان کا نصب العین تھا

زور عاشق مزاج ہے کوئی درد کو قصہ مختصر دیکھا

میخانہ عشق میں تو اے درد تجھ سا نہ کوئی خراب نکلا

مجنوں فرہاد و درد و امق ایسے یہ دو ہی چار ہیں ہم

عشق کیا شے ہے کسی کامل سے پوچھا چاہیئے مگر اتنا تو سب ہی جانتے ہیں کہ وہ ایک لطیف جذبہ ہے جو لطافت کے ساتھ نہایت قوی بھی ہے جس کی ہمہ گیری دنیائے معرفت میں مسلم ہے اور جو خودی اور تمام لوازم (یعنی خودی کے پست تقاضوں کو) جلا کر خاک کر دیتا ہے حتیٰ کہ عاشق

خود بھی معدوم ہو جاتا ہے۔ العشق نار تحرق ما سوا المحبوب "عشق ایک ایسی آگ ہے کہ جو محبوب کے سوا سب کچھ جلا کر خاک کر دیتی ہے۔ بس صرف محبوب و مقصود ہی کا نام رہ جاتا ہے۔

ہر چہ گویم عشق را شرح و بیاں چوں بہ عشق آیم خجل باشم ازآں

عشق کے جذبے کو لطیف اور قوی کہا گیا ہے۔ اس کا لطیف ہونا تو اسی سے ظاہر ہے کہ وہ خود نرمی اور پاکیزگی سے متصف ہے اور انسان کی نرم اور پاکیزہ حسیات ہی کو اپیل کرتا ہے حتیٰ کہ جو لوگ طبعاً خشونت رکھتے ہیں اس کے فیضان سے محروم رہتے ہیں عشق کی جڑیں اس طرح آدمی کے اندر پیوست ہو جاتی ہیں کہ بعض اوقات خود اس کو بھی عشق کے وجود کی خبر نہیں ہوتی یہاں تک کہ اچانک کسی زبردست حادثے کی بدولت اس کا ظہور ہو کر رہتا ہے۔ رہی عشق کی قوت اس کے لیے اتنا ہی کہہ دینا کافی ہے کہ دنیا کے بڑے بڑے واقعات کے ظہور میں عشق ہی کارفرما نظر آتا ہے بقول میر تقی میر:

کوہکن کیا ہے بے ستوں کیسا عشق کی زور آزمائی ہے

عشق کسی فرد کا ہو یا قوم کا کسی بلند یا پست مقصد کا ہر صورت میں وہ مصائب کو جھیلتا طوفانوں سے کھیلتا سمندروں کو چیرتا پہاڑوں کو کاٹتا اور خارزاروں کو روندتا مردانہ وار چلا جاتا ہے۔ نوع انسانی نے آج تک فلسفہ، سائنس، سیاست، ریاست، فنون لطیفہ فنون نافعہ غرض جس شعبے میں بھی کمال حاصل کر کے انسانیت کی فلاح کے لیے کام کیا ہے سب میں عشق ہی کا عمل دخل پایا۔ علامہ نے فرمایا تھا:

عشق را از تیغ و خنجر باک نیست اصل عشق از آب و باد و خاک نیست
در جہاں ہم صلح و ہم پیکار عشق آب حیواں تیغ جوہر دار عشق

حضرت جگر مرادآبادی نے بھی ایک چھوٹی بحر میں بڑی لطیف اور آفاقی بات کہی ہے مضمون یہی ہے فرماتے ہیں

محبت صلح بھی پیکار بھی ہے ــــــــ یہ شاخِ گل بھی ہے تلوار بھی ہے

اب یہ کتنی بڑی حقیقت نظر آتی ہے کہ محبت یا عشق بہ یک وقت کتنی متضاد قوتوں کے حامل ہیں۔ امن وصلح اور آتشی کے خوش آئند جذبات بھی رکھتے ہیں شاخِ گل کی طرح نرم و نازک لطیف بھی اور جنگ وجدال وقتال میں تلوار بھی اسی کی خصوصیات ہیں۔ دروازۂ خیبر کو اکھاڑ پھینکنا اسی جذبے کے زیر اثر ظہور میں آیا۔ اسی سے عشق کی ہمہ گیری کی حقیقت بھی آشکار ہوتی ہے صوفیا کے نقطۂ نظر کے تحت تو تخلیق کائنات کی علت ہی عشق کے جذبے کے تحت ہے۔ پھر حضرت جگر مرادآبادی یاد آرہے ہیں اپنی غزل کے ایک شعر میں کیا قیامت ڈھا گئے ہیں کہ نعتوں کے کئی دواوین پر بھاری ہے انکا یہ شعر۔ فرماتے ہیں:

یہ عشق وہ بلا ہے کہ حسنِ ازل کو بھی ــــــــ تخلیقِ کائنات پہ مجبور کر دیا

ویسے اگر عام نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو بھی حیات کا کوئی شعبہ اس کی گرفت سے آزاد نہیں ہے اور کوئی ادارہ اس کی کارفرمائی سے مستثنیٰ نہیں۔ حیوان اور انسان کا تو ذکر ہی کیا جمادات و نباتات بھی اس کے اثر سے خالی نہیں۔ جو پتھر پھول پودے یا پھل جو کسی خاص زمین سے لگاؤ رکھتے ہیں اگر ان کو کسی دوسری زمین لے جا کر کاشت کرنے کی کوشش کی جائے تو یہ اپنی زندگی یا خواص کھو بیٹھتے ہیں۔ حیوانوں اور انسانوں میں یہی جذبہ زیادہ شعوری زیادہ متنوع زیادہ فعال صورت میں نظر آتا ہے۔

ماں باپ کو اولاد سے اولاد کو ماں باپ سے بھائی کو بہن سے مرد کو عورت سے انسان کو اپنے کنبے سے جو فطری لگاؤ ہے وہ سب اسی محبت و عشق کا کرشمہ ہے یہ ضرور ہے کہ ان مثالوں میں محبت کے جلوے اپنی کیفیت، کمیت اور نوعیت کے اعتبار سے مختلف ہیں تاہم ان کا وجود ایک بدیہی امر ہے۔ محبت یا عشق کا جذبہ جس کی تیزی سے انکار بھی ممکن نہیں بلکہ سچ پوچھیئے تو اس کی تیزی سے دوسرے احساسات بھی تیز ہو جاتے ہیں اپنے اندر ایک انقلابی شان رکھتا ہے وہ انانیت کو مٹاتا ہے مشکلات کو پانی کر دیتا ہے۔ پست و ذلیل فطرت کو اعلیٰ شریفانہ خصائل واخلاق سے بدل دیتا ہے۔ اپنی خواہش اپنی پسند اپنا نفع یہاں تک کہ اپنی ہستی بھی اپنی نہیں رہتی بلکہ سب کچھ محبوبِ حقیقی

کو سونپ دیا جاتا ہے۔

اللہ اللہ ترے جلوے کی حیرت اثری　　　نہ تماشے کا پتہ ہے نہ تماشائی کا

مولانا رومؒ نے اس بحث سے متعلق ایک نہایت بلیغ اور دلچسپ حکایت مثنوی میں لکھی ہے کہ ''ایک شخص نے جا کر اپنے محبوب کے دروازے پر دستک دی اندر سے آواز آئی کون جواب دیا، ''میں''، محبوب نے کہا جا ابھی تو اندر آنے کے لائق نہیں ہے جب تیری خامی جو دوائی کا ثمرہ ہے آتش عشق سے اور آتشِ ہجر سے جل جائے گی تو اجازت ملے گی۔ وہ غریب سال بھر مارا مارا پھرا اور عشق کی آگ میں جلتا رہا جب سال بھر کے بعد واپس آیا تو پھر جا کر محبوب کے در پر دستک دی جب پوچھا گیا کون ہے تو بولا کہ ''تو ہی ہے''

بانگ زد یارش کہ بر در کیست ہاں　　　گفت بر درہم توئی اے دلستاں

جس پر محبوب نے یہ کہہ کر بلالیا کہ ایک گھر میں دو کی سمائی ممکن نہ تھی جب ''تو'' ''میں'' ہی ہے تو بخوشی آسکتا ہے۔ یہ تو مجازی عشق کا حال تھا اگر عشق حقیقی ہو تو اس کی توانائی اور گہرائی کا کون اندازہ کر سکتا ہے۔ بے محل نہ ہوگا اگر یہاں علامہ شبلی نعمانی کی تحریر سے ایک اقتباس شامل کر لیا جائے وہ لکھتے ہیں'' اس کشش یعنی عشق کا مبدء حسن ہے یعنی جہاں حسن پایا جائے گا یہ کشش بھی ہوگی اور جس قدر حسن کامل تر ہوگا اسی قدر کشش بھی زیادہ قوی اور تیز ہوگی اور چونکہ حسنِ کامل صرف شاہد حقیقی میں پایا جاتا ہے اس لیے عشق بھی وہی کامل ہوگا جو شاہد حقیقی سے تعلق رکھتا ہو یہی وجہ ہے کہ حضرات صوفیہ کی شاعری میں جو جذبہ اور اثر ہے اوروں کے کلام میں اس کا شائبہ تک نہیں پایا جاتا۔ حضرات صوفیہ کا مطلوب عموماً شاہد حقیقی ہے اس لیے انکا عشق ہوا و ہوس سے پاک اور نہایت قوی اور مشکل ہوتا ہے۔ مجازی حسن ناکمل اور سریع الزوال ہے اس لیے عشقِ مجازی میں وہ زور وہ جذبہ اور استقلال نہیں ہو سکتا جو عشق حقیقی کا خاصہ ہے

چونکہ صوفی حضرات عشق کو نہ صرف ایک اہم اور موثر قوت مانتے ہیں بلکہ ان کے نزدیک وہ تخلیق کائنات کی اصل ہے جس کے مظاہر انہیں ہر سو نظر آتے ہیں۔ حق سبحانہٗ کو اپنے جمال باکمال سے

محبت ہے اور اسی لیے اس نے چاہا کہ کسی آئینے میں اپنا مشاہدہ کرے چنانچہ یہ آئینہ جس کا نام کائنات ہے تخلیق کیا گیا

عدم میں آئینہ ٹھہرے، وجود میں تصویر　　　تمہاری شان ہمیں سے کھلی ہمیں میں رہی

اسی حقیقت کو مولانا رومؒ یوں بیان فرما گئے ہیں

شد جہاں آئینہ رخسارِ دوست　　　ہر دو عالم در حقیقت عکسِ اوست

اور میر تقی میر کے یہاں بھی اسی رنگ میں فرمایا گیا ہے

محبت نے ظلمت سے کاڑھا ہے[1] نور　　　نہ ہوتی محبت نہ ہوتا ظہور

اس ملت میں ایسے صاحب علم اور صاحب باطن بزرگ گزرے ہیں جنہوں نے تمام عمر اللہ تعالیٰ کی محبت اور پھر اس کے عشق میں بسر کردی بس عشقِ الٰہی ہی ان کا مقصود و ملتجا قرار پایا کیونکہ اہل معرفت کے قلوب اللہ تعالیٰ کے خزانے ہیں ان سرزمینوں میں وہ اپنے بھید کی امانتیں رکھتا ہے اپنی حکمت کے لطائف اپنی محبت کے حقائق اور اپنی معرفت کے دقائق اور پھر یہ حضرات ان نعمتوں سے سرفراز ہو کر فنافی اللہ کی منزلوں کو پا لیتے ہیں مگر اس مقام فنا کی بھی تین سیڑھیاں ہیں نمبر ایک فنافی الشیخ نمبر دو فنافی الرسول نمبر تین فنافی اللہ۔ بندہ اپنے شیخ اس کے بعد عشق رسولؐ کی سرشاریوں سے گذر کر ہی فنافی اللہ کی نعمتِ عظمیٰ کا اہل ہو سکتا ہے پھر بعضوں نے تو اس عشق کی خاطر تخت و سلطنت پر بھی لات ماردی اور جان سی متاعِ عزیز کی بھی پروانہ کی کیا۔ خاکم بدہن یہ سب دیوانے تھے اور اگر تھے تو کاش یہ دیوانگی زیادہ سے زیادہ رواج پائے اور ایسے دیوانوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا کہ دنیا جو نام نہاد اہل علم و اہلِ عقل کی بدولت جہنم زار بن گئی ہے پھر سے رشکِ جنت بن جائے اس لیے بقول جناب انور صابری

---

[1] کاڑھنا (متروک) بمعنی نکالنا

روز آپس میں لڑا کرتے ہیں ارباب خرد کوئی دیوانہ الجھتا نہیں دیوانے سے

سبحانہ اللہ! کیا حقیقت کی ترجمانی فرمائی ہے! جب ہی تو کسی نے کیا خوب کہا ہے:

منکر نشوی گر نہ غلط دم زنم از عشق کیں نشہ مرا گر نبود یادگرے ہست

مگر کیا کیا جائے انسان ہر دور میں اُس چیز کا دشمن رہا ہے جس تک وہ اپنی جہالت کی وجہ سے نہ پہنچ سکا یہاں ایک حدیث بھی درج کرنا لازم سمجھتا ہوں کہ بہت برمحل ہے اور اس حدیث کا حوالہ حضرت امام ربانی مجدد الفِ ثانی علیہ الرحمہ نے اپنے ایک مکتوب میں دیا ہے:

"لن تو من احَدُ کمه حتیٰ یُقالَ اِنه مجنون" تم میں سے ہرگز کوئی شخص مومن نہیں ہو سکتا جب تک اسے دیوانہ نہ کہا جائے۔

یعنی ہر معاملے میں جنون ہی راہبری کرتا ہے۔ آیئے اب اس بیان کی روشنی میں کلامِ درد پر نظر ڈالیں مگر حضرت خواجہ میر درد جیسے عظیم الشان شاعر اور صوفی کے کلام کے متعلق کچھ لکھنے سے پہلے یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہیئے کہ الفقر وفخری کے منبع سے دو دریا پیدا ہوئے ایک کا نام نامی مظہر العجائب وغرائب امام المشارق والمغارب علیؓ بن ابی طالب ہے اس نے اپنی کرامت و فیضان سے قادریہ چشتیہ طریقہ کی صورت میں ایک عالم کو سیراب کیا دوسرے بحرِ بیکراں کا لقب ثانی اثنین اذ ھما فی الغار حضرت ابوبکر صدیقؓ نامدار ہے اس سلسلہ کے برکات کو نقشبندیہ کہتے ہیں۔ خواجہ سید بہاؤالدینؒ کے پرتو شہود نے عرب وعجم کو تسخیر کیا گیارہویں صدی میں حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی شیخ احمد فاروقی سرہندی قدس سرہٗ العزیز نے اس صدیقی نسبت کو ایسا نکھارا کہ مجددیہ نقشبندیہ طریقہ آفتاب بن کے جگمگانے لگا۔

حکیم خواجہ سید ناصر نذیر فراق دہلوی کی جو حضرت خواجہ میر درد کے نواسے کے نواسے ہیں کتاب "میخانہ درد" میرے سامنے ہے جس میں حضرت فراق نے تحریر کیا ہے کہ بارہویں صدی میں حضرت خواجہ سید بہاؤالدین نقشبندیؒ کے صلیبی فرزند ارجمند خواجہ محمد ناصر دہلوی متخلص بہ عندلیب (والد گرامی جناب میر درد) پر بے واسطہ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کا ابرِ رحمت

برسا اور حضرت عندلیب کو جناب امام حسنؓ کی روحِ اقدس نے نسبت محمد یہ خالصہ کی اولیت کے ساتھ تعلیم دی اسی واقعہ کا علم جناب فراق دہلوی کو حضرت خواجہ محمد ناصر عندلیب کی کتاب ''نالہ عندلیب'' سے ہوا جسے نواب شاہجہاں بیگم رئیسہ بھوپال نے دوبارہ طبع کروایا جنابِ فراق دہلوی کی زندگی میں یہ کتاب طبع ہوئی وہ تحریر کرتے ہیں کہ تذکرہ نویسوں اور مورخوں نے حضرت خواجہ میر درد علیہ الرّحمہ کا ذکر شاعری کے ساتھ ختم کر دیا انہیں حضرت درد کے باطنی کمالات کا بہت کم علم ہو سکا۔

فکرِ ہر کس بقدرِ ہمتِ اوست　　　　تُو وطوبیٰ وماو قامتِ دوست

جنابِ فراق دہلوی اپنی کتاب ''میخانہ درد'' میں تحریر فرماتے ہیں کہ حضرت خواجہ میر درد نے الہامِ غیبی کے بموجب وارداتِ قلبیہ کو رباعیات میں نظم کیا پھر غیبی اشارے پر اس کی شرح لکھی اور ان سے ایک سو گیارہ رباعیات کا انتخاب کر کے ''وارداتِ درد'' اس کا نام رکھا۔ پھر حکم ملا کہ شرح کی شرح جائے اور اس کا نام ''علم الکتاب'' رکھا جائے چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ علم الکتاب ایک عرفانِ الٰہی کا جہان ہے اور اس کی ترکیب و ترتیب محی الدین عربی شیخ اکبر اور امام غزالی قدس سرّہ کی تصانیف سے ٹکر کھاتی ہے۔ علم الکتاب چھ سو صفحات کی کتاب ہے جسے نواب نورالحسن بن نواب صدیق حسن آف بھوپال نے مطبع انصاری دہلی سے دوبارہ طبع کروایا ہے اور اہلِ علم نے کہا کہ واقعی یہ ایسی ہی کتاب ہے کہ جس کے متعلق حضرت مولانا جامی نے فرمایا تھا

من چہ گویم وصفِ آں عالی جناب　　　　نیست پیغمبر و لے دارد کتاب

اگرچہ یہ شعر کہا تو مثنوی مولانا روم کے لیے تھا مگر اہلِ علم کی رائے کے مطابق یہ مشہور شعر حضرت خواجہ میر درد کی کتاب پر بھی صادق آتا ہے۔ پھر حضرت درد نے بہ الہام الٰہی چار رسالے اور تحریر کیے جن کے نام جناب فراق نے (۱) آہ سرد، (۲) نالۂ درد (۳) دردِ دل (۴) شمع محفل لکھے ہیں جن کے متعلق وہ تحریر کرتے ہیں کہ یہ چار کتابیں کیا ہیں اسرارِ قدرت اور معرفتِ سلوک کے عجائب خانے ہیں۔

حضرت خواجہ میر درد علم الکتاب میں تحریر فرماتے ہیں کہ جدنا امام حسنؓ کی روح مقدس سات شبانہ روز میرے والدِ ماجد کے پاس ایک حجرے میں رہی اور سلوکِ محمدیہ خالصہ کا تکملہ کروا کر جنت الفردوس کو سدھاری۔ اس واقعہ کو خواجہ میر اثر نے اپنی کتاب ''بیانِ واقع'' میں ان اشعار میں تحریر فرمایا ہے۔

فیض خاصے یافت از روحِ حسنؓ　　تخمِ آں راکشت اندر ایں چمن

ہفت روز و شب میان حجرہ بود　　پیش چشمش عالمے دیگر کشود

روزِ ہفتم چونکہ در را باز کرد　　پورِ خود را واقفِ ایں راز کرد

نسبت خاصے عنایت کردہ است　　راہِ پیغمبر ہدایت کردہ است

امر شد تا دعوتِ امت نہم　　خلق را بر امرِ حق دعوت کنم

دینِ ما دین محمدؐ ہست و بس　　خالص آئینِ محمدؐ ہست و بس

تیسرے شعر میں ''پورِ خود'' سے حضرت خواجہ میر درد مراد ہیں اس لیے کہ جب حضرت امام حسنؓ کی روح کے تشریف لے جانے کے بعد حضرت خواجہ محمد ناصر صاحب نے دروازہ کھولا تو تو رات کے اندھیرے میں ان کا پیر حضرت خواجہ میر درد پر پڑا جو باپ کے انتظار میں اس حجرے کی دہلیز پر پڑے رہتے تھے اس وقت جو کچھ والد گرامی کو عطا ہوا تھا وہ اپنے اس نیک و سعید بیٹے کے سینے میں منتقل کر دیا۔

چونکہ حضرت امام حسینؓ کا ارشاد تھا کا عالمِ ظاہر میں کسی کامل فقیر سے بیعت کر لینا اس لیے جناب ناصر عندلیب کو مرشد کی تلاش ہوئی اس زمانے میں دہلی حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی شیخ احمد فاروقی سرہندی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پوتے حضرت شیخ عبدالاحد متخلص بہ وحدت جن کا لقب گُل تھا کے خلیفہ حضرت شیخ سعد اللہ گلشن مجددی علیہ الرحمہ کا بڑا شہرا تھا جن کے پاس میرزا عبدالقادر بیدل اور شمس ولی اللہ جو ولی دکنی کے نام سے تاریخ ادب اردو میں مشہور ہیں بہت باادب بیٹھے تھے اور انہیں سے بیعت تھے سے رجوع کیا مگر حضرت سعد اللہ گلشن نے معذرت کر لی

کہ آپ حضرت بہاؤالدین نقشبند رحمتہ اللہ علیہ کی اولاد ہیں آپ سے ملاقات رہے گی آپ آتے جاتے رہیں شاید کوئی صورت نکل آئے۔ شاہ سعد اللہ گلشن بہت بڑے عارف بھی تھے اور شاعر بھی بہت عظیم تھے۔ مجددیہ طریقت کے بڑے مشائخ میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ ان کے لیے لکھا ہے کہ ان کے دیوان میں دو لاکھ بیت کا اندازہ کیا جاتا ہے ایک شعر ملاحظہ ہو:

کلکِ من صورت کشِ صد معنیٔ رنگیں رواست　　　گر کند گلشن تخلص بلبلِ طبعم رواست

حضرت شیخ سعد اللہ گلشن نے عرصہ دراز مکہ معظمہ و مدینہ منورہ میں قیام کیا علوم ظاہری و باطنی کے علاوہ موسیقی کے بھی ماہر تھے ان کے پیر شیخ عبدالاحد کا لقب گل تھا وحدت تخلص فرماتے تھے حضرت مجدد الفِ ثانی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پوتے تھے۔ حضرت شاہ سعد اللہ نے اپنے پیر کے لقب گل کی رعایت سے گلشن تخلص کیا گلشن کی رعایت سے حضرت خواجہ محمد ناصر نے عندلیب تخلص کیا اور حضرت خواجہ میر درد نے اپنے والد کے تخلص عندلیب کی رعایت سے درد تخلص کیا آپ کے بھائی نے درد کی رعایت سے اثر تخلص کیا اور پھر آپ کے خاندان میں اسی رعایت سے تخلص رواج پا گیا۔ ایک شعر میں حضرت خواجہ درد نے گلشن، وحدت، عندلیب اور درد چاروں تخلص کس خوبی کے ساتھ باندھے ہیں۔

درد از بس عندلیب گلشنِ وحدت شدست　　　جلوۂ رُوئے گلے او را غزل خواں می کند

ایک مطلع میں خواجہ میر درد شاہ گلشن کے حال کی طرف اشارہ فرماتے ہیں

باغباں ہر جا کہ باشم خیر خواہِ گلشنم　　　از فقیری بہرہ مند از فیض شاہِ گلشنم

قدر ایں نا چیز را داند جنابِ عندلیب　　　گرچہ مجز کا ہے نیم اما گیا ہے گلشنم

بس کہ رنگین ست ہر یک حرفِ موزونم چو گل　　　در سخن سنجاں سراپا جلوہ گا ہے گلشنم

حضرت گلشن سے عقیدت کے اظہار کے سلسلے میں یہ اشعار آپ نے دیکھے ایک اور مطلع میں حضرت خواجہ میر درد نے حضرت شاہ گلشن کا ذکر کس ادب سے اپنے والد کے تخلص کے حوالے سے کیا ہے

از بسکہ عندلیب غزل خوانِ گلشن است — صحنِ چمن چو صفحۂ دیوانِ گلشن است

حضرت شاہ گلشنؒ کا وصال ۱۱۴۰ ہجری میں ہوا مگر اپنے وصال سے پیشتر انہوں نے اپنے مرشد زادے قبلۂ عالم خواجہ محمد زبیر مجددیؒ سے خواجہ محمد ناصر عندلیب کو بیعت کرا دیا جو حضرت مجدد الفِ ثانی رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ کے پوتے ہیں ان کی ریاضتوں اور مجاہدوں کے بارے میں ''میخانہ درد'' میں تحریر ہے کہ حضرت قبلۂ عالم خواجہ محمد زبیر صاحب کا یہ عالم تھا کہ دن کے بارہ گھنٹے میں چوبیس ہزار بار کلمہ نفی اثبات ادا کر لیتے تھے۔ اوّابین کے نوافل میں ہر روز دو سپارے تلاوت کرتے تھے تہجد کے نوافل میں ساٹھ بار سورۂ یٰسین کی تلاوت ان کا معمول تھا رات دن کے کسی لمحے بھی آپ ذکر و فکر اور مجاہدات سے خالی نہیں رہتے تھے برائے نام سوتے تھے برائے نام کھاتے تھے اور برائے نام گفتگو کرتے تھے۔

حضرت خواجہ میر درد ۱۱۳۱ھ فرخ سیرؒ کے عہد میں پیدا ہوئے آپ سیادت و شرافت میں مشہور و معروف اور نجیب الطرفین سادات میں تھے آپ اپنے بنی فاطمہ ہونے پر بڑا شکر و ناز فرماتے تھے چنانچہ فرماتے ہیں

از بسکہ خانہ زادِ قدیمِ سیادتیم — از جان و دل فدائے حریمِ سیادتیم
امیدوارِ فیضِ عمیمِ سیادتیم — یعنی چوما بزیرِ گلیمِ سیادتیم

اور پھر رباعی میں ارشاد فرماتے ہیں:

یارب خاطر غیر بشکستم من — دل را برہ حبیب تو بستم من
بیشک بغلامیٔ محمدؐ نازم — کز نورِ علیؓ و فاطمہؓ ہستم من

حضرت میر درد کا سلسلۂ پدری حضرت خواجہ سید بہاؤالدین نقشبندی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ملتا ہے اور سلسلۂ مادری حضرت غوثِ اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے۔ آپ نے بھی اپنے والد بزرگوار کی طرح اپنی زندگی بہت کٹھن گذاری اور شب و روز کی سخت ریاضتوں میں مشغول رہے۔ آپ

شہر دہلی کے کسی امیر یا وزیر کے دولت خانے پر کبھی نہیں گئے دہلی کی کسی درگاہ کسی خانقاہ پر کبھی نہیں گئے سوائے اپنے والد بزرگوار کے مزار کے جہاں وہ ہر روز باقاعدگی سے حاضری دیتے تھے۔میر ناصر نذیر فراق دہلوی لکھتے ہیں کہ حضرت خواجہ میر درد کے مقامات کے بارے میں کون کیا بتا سکتا ہے علم الکتاب میں اپنے بارے میں جو تحریر کیا ہے وہ یہ ہے ''مجھے حضرت آدم علیہ السلام اور دیگر کئی انبیاء کا مقامِ ولایت عطا فرمایا گیا جس نے مجھے ظاہری جاہ وحشم اور ملک و دولت سے بے نیاز کر دیا۔میری آتشِ غیظ وغضب کو بجھا دیا مجھے محمدؐیہ خالص کی ردا میں چھپا لیا رسول اکرمؐ کی ذاتِ گرامی میں فنا کر دیا گیا پس نہ میں رہا نہ میرا نام ونشان رہا میرے اجزائے بدن تحلیل ہو کر فنا ہو گئے اور مجھے خدا تعالیٰ نے عقل کامل نفس کامل روح کامل اور جسدِ کامل کے ساتھ مظہر اپنے تمام اسماء کا پیدا کیا تا کہ میں مومنین کو طریقۂ خالصِ محمدؐیہ کی دعوت دوں اور اس کی نعمتیں مجھ پر خاص وعام تمام ہو جائیں حضرت خواجہ میر درد نے حضرت میر ناصر عندلیب کی معیّت میں مجدّ دی طریقت کے تمام مراحل طے کیے۔

حضرت خواجہ میر درد علیہ الرحمۃ کے معمولات کے بارے میں تحریر ہے کہ آپ پانچوں وقت اپنے حجرے سے نکل کر مسجد نماز کے لیے جاتے ورنہ دن رات حجرے میں ہی بارہ دری میں رونق افروز ہوتے اور ایک تسبیح جس میں ایک لاکھ دانے تھے اور جس کا ڈورہ اتنا بڑا تھا کہ بارہ دری کے چاروں کونوں تک آسانی سے پہنچ جاتا تھا آپ کے سامنے رکھ دی جاتی تھی اور آپ تسبیح کا ایک حصہ اٹھا کر کلمہ طیبہ پڑھنا شروع کر دیتے تھے اور آپ کے ساتھ حاضرین بھی اُس تسبیح کا ڈورہ اپنی اپنی جگہ سے اٹھا لیتے اور ذکر شروع کر دیتے تھے یہ روز کا معمول تھا اسی وقت محفل میں موجود حضرات اپنے اپنے مسائل بھی بیان کر دیتے اور جواب باثواب پاتے جو بھی آتا سلام کر کے دوزانو بیٹھ جاتا اور کلمہ پڑھنا شروع کر دیتا۔آپ تعویز گنڈے سے بہت گھبراتے تھے فرماتے تھے درویشی رمالی اور منجمی کا نام نہیں مریدین میں انسانوں کے علاوہ جنات بھی ہوتے تھے۔آپ کو علم موسیقی سے بھی شغف تھا اور راگ بھی سنتے تھے موسیقی کے قواعد واصول آپ کے نوک زبان تھے بڑے بڑے

استاد گویّے اور قوال خدمت میں حاضر ہو کر سُر تال راگ راگنیوں کی تحقیق کیا کرتے تھے۔ آپ کو عربی علم وادب وشاعری میں بھی دستگاہ تھی آپ کی عربی نظم ونثر اہلِ عرب سن کر پھڑک جاتے تھے فارسی شعروادب ونثر نگاری کی یہ کیفیت تھی کہ فارسی نثر کہیں مقفّی کہیں مُسجع کہیں عاری کہیں سلیس کہیں دقیق قلم برداشتہ لکھتے تھے۔ حضرت خواجہ میر درد علیہ الرحمہ صرف زاہد خشک ہی نہیں تھے بہت شُستہ مذاق فرماتے تھے محفل آرا شخصیت تھے ایک دفعہ محفل شاعرہ میں غزل پڑھ رہے تھے مطلع تھا

بسکہ در چشم و دلم ہر لحظہ اے یارم توئی | ہر کہ آید در نظر از دور پندارم توئی

ایک بے ادب نے مذاق کیا کہ حضرت اگر سگِ درنظر می آید۔ بیساختہ فرمایا "پندارم توئی" حضرت خواجہ میر درد کے کلام میں حقیقت کے ساتھ مجازی عشق کے بھی اشارے ملتے ہیں مگر ان کے عارفانہ کلام سے صاف ظاہر ہے کہ جو کچھ وہ کہتے ہیں محض رسمی نہیں یہ امر واقعہ ہے کہ "قلندر ہر چہ گوید دیدہ گوید" یہ کہنا تو مشکل ہے کہ عشق مجازی کی ان کے یہاں کیا نوعیت تھی اور مجازی راہ سے گزر کر حقیقت کی منزل تک پہنچنے میں کتنا وقت لگا بہرحال عشق مجازی کے رنگ کے اشعار دیکھئے جن سے ان کے عشق کی پاکیزگی لطافت اور نقاہت عیاں ہے۔

مدت سے وے تپاک تو موقوف ہو گئے | اب گاہ گاہ بوسہ و پیغام رہ گیا

برہم کہیں نہ ہو گل و بلبل کی آشتی | ڈرتا ہوں آج باغ میں وہ تند خو گیا

اگر میں نکتہ رسی سے تر ادہاں پاؤں | کمر کو چاہوں تو اس کے تئیں کہاں پاؤں

زلفوں میں تو سدا سے یہ کج ادائیاں ہیں | آنکھوں نے پر یہ اور ہی آنکھیں دکھائیاں ہیں

اگلے معانقے کو اگر کیجئے معاف | لگ جایئے گلے سے مکافات کے لیے

اے درد مجھے کچھ نہیں اب اور تو آزار | اس چشم سے کہہ دیتا کہ بیمار ہوں تیرا

کچھ ہے خبر تجھے بھی کہ اٹھ اٹھ کے رات کو | عاشق تری گلی میں کئی بار ہو گیا

دل تجھے کیوں ہے بے کلی ایسی کون دیکھی ہے چلبلی ایسی

ایک شعران کی غزل کا کیا زبان کا شعر ہے اور نہیں نہیں کی تکرار کیا پُر لطف ہے

وہ ہنستے ہی جن کے کہے ہے نہیں نہیں اس سے ابھی تو ہم نے وہ باتیں کہیں نہیں

لطف ''گلشنِ ہند'' میں تحریر کرتے ہیں ''اگر چہ دیوان ان کا بہت مختصر ہے لیکن سراپا درد ہے''

آبِ حیات میں آزاد لکھتے ہیں ''خواجہ میر درد کی غزل سات شعر کی یا نو شعر کی ہوتی ہے مگر انتخاب ہوتی ہے خصوصاً چھوٹی بحروں میں جو غزلیں کہتے ہیں گویا تلوار کی آبداری نشتر میں بھر دیتے ہیں''

حضرت خواجہ میر درد ایک مخلص درویش تھے اور اُن کی وارداتِ محبت یقیناً خلوص پر مبنی تھی اسی لیے ان کے کلام میں درد و اثر کا ہونا بالکل فطری ہے۔

گزروں ہوں جس خرابے پہ کہتے ہیں واں کے لوگ ہے کوئی دن کی بات یہ گھر تھا یہ باغ تھا

جگ میں کوئی نہ ٹک ہنسا ہوگا کہ نہ ہنسنے میں رو دیا ہوگا

ہم گلشنِ دوراں میں اے خفتگیِ طالع سر سبز تو ہیں لیکن جوں سبزۂ خوابیدہ

چشمِ عبرت ہے دیکھ ایدھر نقشِ لوحِ مزار ہیں ہم

درد لب ہنستے ہیں رونے پر مرے سب خاص و عام کیا ہوئے وہ نالے جو لگتے تھے دل میں تیر سے

ان کے یہاں ندرتِ بیان ہے اور بہت خوبی کیساتھ ہے یہ ندرتِ بیان ہی ہے جو ایک شاعر کو دوسرے سے ممتاز کرتی ہے۔ اور اس کو صاحبِ طرز بناتی ہے۔

اے آنسوؤ نہ آوے کچھ دل کی بات منہ پر لڑکے ہو تم کہیں مت افشائے راز کرنا

شب خوں کے لیے فلک پھرے ہے کھینچے ہوئے تیغ کہکشاں سے

فلک کو ظالم قاتل تو سب ہی نے کہا ہے مگر ''کہکشاں کی تیغ'' کی ترکیب لاجواب ہے

مت عبادت پہ پھولیو زاہد ـــــ سب طفیلِ گناہِ آدم ہے

کیا اچھوتا انداز ہے بالکل نیا مضمون ہے زاہد کی عبادت کو طفیلِ گناہِ آدم قرار دینا کیا ندرت بیان ہے

رات محفل میں ترے حسن کے شعلے کے حضور ـــــ شمع کے منہ پہ جو دیکھا تو کہیں نور نہ تھا

یہ کس نے ہم سے کیا وعدۂ ہم آغوشی ـــــ کہ مثلِ بحر سراسر کنار رکھتے ہیں

بازی بدی تھی اس نے مری چشمِ تر کے ساتھ ـــــ آخر کو ہار ہار کے برسات رہ گئی

ساقیاں لگ رہا ہے چل چلاؤ ـــــ جب تلک بس چل سکے ساغر چلے

کھل نہیں سکتیں ہیں اب آنکھیں مری ـــــ جی میں یہ کس کا تصور آ گیا

حضرت خواجہ میر درد وہ شاعر ہیں جن کے بہت سے اشعار عام گفتگو میں اور بہت سے ضرب الامثال کے طور پر لوگوں کی زبانوں پر ہیں اور عام طور پر اس بات سے بے خبر ہیں کہ یہ شعر یا یہ مصرع کس کا ہے یہ حضرت خواجہ میر درد کے کلام کا اختصاص ہے کہ اسے مقبول عام کی سند حاصل ہے

وائے نادانی کہ وقتِ مرگ یہ ثابت ہوا ـــــ خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا

تردامنی پہ شیخ ہماری نہ جائیو ـــــ دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں

ان لبوں نے نہ کی مسیحائی ـــــ ہم نے سو سو طرح سے مر دیکھا

سینہ و دل حسرتوں سے چھا گیا ـــــ بس ہجوم یاس جی گھبرا گیا

دردِ دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو ـــــ ورنہ طاعت کے لیے کچھ کم نہ تھے کروبیاں

زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے

قتلِ عاشق کسی معشوق سے کچھ دور نہ تھا پر ترے عہد سے آگے یہ دستور نہ تھا

یہ اشعار پڑھ کر روزمرّہ کی گفتگو میں یاد آگیا ہوگا کہ کون ہے جو ان اشعار کے حوالے نہیں دیتا۔ بیساختہ عام لوگوں کی زبان پر حالات وواقعات کے تحت یہ اشعار آجاتے ہیں۔اس زندگی مستعار کی بے ثباتی کے سلسلے میں کیا برجستہ مثال اس شعر میں فرما گئے ہیں۔

پانی پہ نقش کب سے ایسا جیسے ناپائیدار ہیں ہم

حضرت خواجہ میر درد چونکہ خود بہت بڑے صوفی ولی کامل اور اہلِ حال شخصیت تھے اسی لیے صوفیانہ افکاران کی روح میں رچے بسے ہوئے تھے ان کی صوفیانہ شاعری قطعاً رواتی نہیں ہے بلکہ انہوں نے جو کچھ لکھا وہ ان کی وررداتِ قلبی ہیں پھر اندازِ بیاں اس قدر رواں اور دلآویز ہے کہ طبیعت وجد کرنے لگتی ہے

دونوں جہاں کو روشن کرتا ہے نور تیرا اعیان ہیں مظاہر ظاہر ظہور تیرا

ہے جلوہ گاہ تیری کیا غیب کیا شہادت یاں بھی شہود تیرا واں بھی شہود تیرا

حضرت خواجہ میر درد فرماتے ہیں کہ دراصل غیب وشہود کے اعتبارات ہماری نسبت سے قائم ہیں ورنہ حق تعالٰی کے لیے غیب وشہود دونوں یکساں ہیں۔

تجھی کو جو یاں جلوہ فرما نہ دیکھا برابر ہے دنیا کو دیکھا نہ دیکھا

کیا مجھ کو داغوں نے سروِ چراغاں کبھی تو نے آکر تماشا نہ دیکھا

حجاب رخ یار تھے آپ ہم ہی کھلی آنکھ جب کوئی پردا نہ دیکھا

شب و روز اے درد در پر ہوں اس کے کسو نے جسے یاں نہ سمجھا نہ دیکھا

حضرت خواجہ میر درد تمام دنیاوی مظاہر کو معشوق حقیقی کا آئینہ قرار دیتے ہیں اب

دیکھئے آئینے کو انہوں نے کس کس زاویے سے باندھا ہے اور معانی کا ایک جہان آباد کر دیا ہے۔

اے درد کر تو آئینہ دل کو صاف تو ـــــ پھر ہر طرف نظارۂ حسن و جمال کر

آئینہ عدم پہ یہ ہستی ہے جلوہ گر ـــــ ہے موجزن تمام یہ دریا سراب میں

اے درد مثلِ آئینہ ڈھونڈ اس کو آپ میں ـــــ بیرون در تو اپنی قدم گاہ ہی ہیں

وحدت میں تیری حرف دوئی کا نہ آسکے ـــــ آئینہ کیا مجال تجھے منہ دکھا سکے

اس نکتے کو دیگر شعرا کے یہاں ملاحظہ کیجئے

خود تجلی کو نہیں اذنِ حضوری فانی ـــــ آئینے ان کے مقابل نہیں ہونے پاتے

(فانی بدایونی)

تیرا جمال تیری تجلی ترا فروغ ـــــ آئینہ کس بساط پہ مغرور ہو گیا

(امیر بدایونی)

کس روز آئینے کو لگایا انہوں نے منہ ـــــ یہ سادہ لوح کاہے پہ مغرور ہو گیا

(ضیاء بدایونی)

یہاں حضرت علامہ فوق سبزواری یاد آگئے ان کی ایک رباعی ملاحظہ فرمایئے

اظہار شہود کی ضرورت کیا تھی ـــــ اس نام و نمود کی ضرورت کیا تھی

جب مر کے عدم کو پھر سے بسانا ہوگا ـــــ دنیا کے وجود کی ضرورت کیا تھی

"علم الکتاب" میں حضرت خواجہ میر درد فرماتے ہیں "کفر و معصیت ارادہ و تقدیر الٰہی سے ہوتے ہیں اگرچہ اللہ تعالیٰ انہیں پسند نہیں کرتا" میر درد شریعتِ مطہرہ کا احترام کرنے کے ساتھ خیر و شر دونوں کا سرچشمہ ایک ہی سمجھتے ہیں۔

بستے ہیں تیرے سائے میں سب شیخ و برہمن ـــــ آباد ہے تجھ سے ہی تو گھر دیر و حرم کا

اور پھر یوں بھی ہے کہ

جن کے سبب سے دیر کو تو نے کیا خراب ــــ اے شیخ اُن بتوں نے مرے دل میں گھر کیا

حضرت میر درد کے ہاں عشق حقیقی کا اظہار مختلف انداز سے ہے۔ دیکھیے بات ایک ہی ہے مگر کیسے کیسے پیرایوں میں ہے کہ اس موضوع کو یکسانیت کا شکار نہیں ہونے دیا۔ قاری کے تجسس اور دلچسپی کے لیے پیرایۂ اظہار میں کمالِ فن کی نمود ہے

وحدت نے ہر طرف ترے جلوے دکھا دیئے ــــ پردے تعینات کے جو تھے اٹھا دیئے

ہستی مطلق نے اپنے اوپر تعینات کی اعتباری بندشیں عائد کر لی ہیں اس طرح ہستی کی دو حیثیتیں ہو گئی ہیں اک اصل اور لاتعین جو پسِ پردہ ہے۔ دوسری غیر حقیقی اور مقید جو چشمِ ظاہر کے سامنے ہے یہ سارے مظاہر اسی کا عکس جلوہ ہیں اور راہِ سلوک کے مسافر کس مضطرب کیفیت کا شکار ہیں مگر تسکین کی ایک صورت ہے جو اہلِ بصیرت کی ہمت افزائی کرتی ہے۔

ہر جز کو کُل کے ساتھ بمعنی ہے اتصال ــــ دریا سے دُر جدا ہے پہ ہے غرق آب میں

عارفین کا قول ہے کہ سالک کا اپنے آپ کو خدا کہنا سراسر کفر و معصیت ہے مگر اپنے آپ کو خدا سے جدا جاننا بھی گمراہی ہے

دین و دنیا میں تو ہی ظاہر ہے ــــ دونوں عالم کا ایک عالم ہے

ڈھونڈے ہے تجھے تمام عالم ــــ ہر چند تو کہاں نہیں ہے

ہم نہ جانے پائے باہر آپ سے ــــ وہ ہی آڑے آگیا جیدھر چلے

میرا جی ہے جب تک تری جستجو ہے ــــ زباں جب تلک ہے، یہی گفتگو ہے
تمنا ہے تیری اگر ہے تمنا ــــ تری آرزو ہے اگر آرزو ہے
نظر میرے دل کی پڑی درد کس پر ــــ جدھر دیکھتا ہوں وہی روبرو ہے

حضرت درد اپنے ایک فارسی شعر میں بھی اسی فکر کو کس انداز اور کس نئے رخ سے پیش کرتے ہیں

آنچہ نسبت بخود کردیم بوداز بے خودی یعنی از بے اختیاری، اختیارے داشتیم

ان کے تمام کلام میں یہی رنگ چھایا ہوا ہے ان کے کلام کو آپ کو کہیں سے دیکھ لیں وہ اپنے محور کے گرد ہی نظر آئیں گے کیونکہ اُن کی اپنی زندگی کا بھی یہی حال ہے۔ ان کی شاعری اور ان کی زندگی میں کامل ہم آہنگی ہے وہ ایک صوفی باصفا ہین عالم باعمل ہیں مستِ بادۂ الست ہیں اسی عالمِ بے خودی میں ہر طرف انہیں یار کے جلوے سے سارا عالم معمور نظر آتا ہے

جگ میں آکر اِدھر اُدھر دیکھا تو ہی آیا نظر جدھر دیکھا

زور عاشق مزاج ہے کوئی درد کو قصہ مختصر دیکھا

اذیت مصیبت ملامت بلائیں ترے عشق میں ہم نے کیا کیا نہ دیکھا

ہم کب کے چل بسے تھے پہ اے مژدۂ وصال کچھ آج ہوتے ہوتے سرانجام رہ گیا

اور کیا شعر ہے کیا اصول وضع فرما گئے ہیں کہ کلیہ بیان فرما گئے ہیں برسوں کے مجاہدات سے نجات حاصل کرنے کا اور وصالِ یار کی کیا نوید دے گئے ہیں کہ پڑھیئے اور مست و رقصاں ہو جایئے

پردے کو تعین کے درِ دل سے ہٹا دے کھلتا ہے ابھی پل میں طلسمات جہاں کا

یعنی بات کو ایک اور شعر میں کس رخ سے صاف کر کے کہہ گئے ہیں

اے درد کر تو آئینہ دل کو صاف تُو پھر ہر طرف نظارۂ حسن و جمال کر

یہ عشق ہی کی ساری بود و نمود ہے۔ یہ کھیل تمام تر عشق ہی کا ہے جو لازوال جذبوں کی پرورش کرتا ہے جس میں عاشق اپنے آپ کو بھول کر معشوق کے جلووں میں جذب ہو جانا ہی معراجِ کمال جانتا ہے مگر درد کے ہاں اس معاملے میں بھی ایک انفرادیت ہے۔ عشق کی کٹھن راہوں پر چل کر منزل وصالِ یار تک پہنچنے کے لیے درد نے کتنے دکھوں کے صحرا اور کتنی سختیوں کی

گھاٹیاں عبور کی ہونگی زندگی کو انہوں نے کس جبر کے عالم میں گذارا ہوگا جب ہی تو فرما گئے ہیں

تھا عالم جبر کیا بتاویں کس طور سے زیست کر گئے ہم
جس طرح ہوا ،اسی طرح سے پیمانۂ عمر بھر گئے ہم

اس غزل کا مطلع بھی حسن تغزل کی جان ہے

اب کے ترے در سے گر گئے ہم پھر یہ ہی سمجھ کہ مر گئے ہم

حضرت خواجہ میر درد علیہ الرحمہ نے چونکہ مزاج عاشقانہ پایا تھا اس لیے ان کی شاعری میں درد واثر کا ہونا فطری امر ہے ان کی شاعری سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ وہ پہلے صوفی تھے پھر شاعر تھے یعنی ان کی شاعری تصوّف کے تابع تھی ان کا تصوّف شاعری کے تابع نہ تھا اس لیے اگر وہ شاعر نہ ہوتے پھر بھی صوفی ہوتے انکا خاندان دہلی کا مشہور خانوادہ ارشاد تھا۔ میر درد کے والد خود بہت بڑے صاحب طریقت بزرگ بڑے عارف کامل صاحب سجّادہ تھے میر درد نے علم دین وطریقت وسلوک کی تعلیم اپنے والد کی خدمت میں حاصل کی تھی تمام تذکرہ نگار میر درد کی پرہیزگاری دین داری یہاں تک کہ ان کی ولایت کے وصف میں رُطب اللسان ہیں میر تقی میر جیسی دماغ دار شخصیت نے بھی ان کو ''مسیرِ سلسلۂ خدا پرستاں'' کبھی ''خضرِ قافلہ اہل عرفاں'' لکھا ہے۔ میر حسن ان کے لئے'' از عرفائے عالی مقام وفقہائے ذوی الاحترام واز درویشانِ سخن مانندِ خورشید فرد'' کا جلیل القدر مقام متعین کرتے ہیں مصحفی کی رائے ان کے لیے ''در علم وفضل یگانۂ روزگار است'' نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ ان کے فضائل وکمالات کے بارے میں لکھتے ہیں ''تحریر وبیان سے باہر ہیں'' ان کے مخصوص خاندانی ماحول نے ان کی سیرت کو ایک خاص سانچے میں ڈھال دیا تھا۔ میر تقی میر، میر حسن مصحفی وشیفتہ جیسے باکمال علمی وادبی بصیرت میں ممتاز اس بات کے معترف ہیں کہ حضرت خواجہ میر درد علیہ الرّحمہ ایک مردِ فاضل درویشِ کامل جوانِ صالح خوش ذات نیک صفات عارف خدا پرست جامع شریعت وطریقت اہلِ تسلیم وتوکل جلال وجمال کے مالک حال وقال کی راہ کے مسافر صاحب ورع وتقویٰ دنیا سے بے تعلق تہذیب وتزکیۂ نفس سے آراستہ اسی

کے ساتھ خلیق متواضع عوام سے حسنِ سلوک کرنے والے سلاطین وقت سے بے نیاز استقامت و جمیعت خاطر میں ممتاز تھے یہ ایک حقیقت ہے کہ وہ ایک مستجمع الصفات بزرگ تھے تو کل واستقامت کا یہ عالم کہ جب دہلی اندرونی اور بیرونی حملوں سے تاخت وتاراج ہورہی تھی مرہٹوں کے حملے اور نادر شاہی خون آشامی اپنے عروج پر تھی اہل دہلی جدھر منہ اٹھا چلے جارہے تھے اس افراتفری کے وقت میر درد کہ جس سجادۂ فقر پر بیٹھے تھے اس سے قدم ہٹانا ہرگز گوارانہ کیا۔

جس وقت نادر شاہ مریخ فلک بن کر سرزمینِ دہلی پر ٹوٹ پڑا اور بے گناہوں کا خون بے دریغ بہایا گیا ''شامتِ اعمالِ ماصورتِ نادر گرفت'' ہر ایک کی زبان پر تھا مغل شہزادی مہر پرور نے جو حضرت خواجہ میر درد کی مرید تھیں آپ کو پیغام بھیجا میرے پیرومرشد حضرت خواجہ میر درد صاحب کی خدمت میں عرض کرنا کہ حضرت یوں تو سب جگہ خدا حافظ وناصر ہے مگر برمدے کا نالہ دہلی کی شہر پناہ سے باہر ہے جہاں آپ رہائش پذیر ہیں ایرانی فوجیں بے تمیز ہیں ایسا نہ ہو کہ حضرت کے دشمنوں کو کچھ نقصان پہنچائیں اس لیے آپ مع اہل بیعت شاہجہاں آباد کے اندر تشریف لے آیئے میں نے حضور اور حضور کے اہلِ خانہ کے لیے دو محل خالی کرا رکھے ہیں۔ مگر حضرت خواجہ میر درد نے معتمد سے کہا کہ ہماری طرف سے بیگم کو دعا کے بعد یہ جواب دینا کہ میں آپ کی اس مہربانی اور ہمدردی کا شکریہ ادا کرتا ہوں مگر ہم لوگ بنی فاطمہ اور خاص کر حسینی سیّد ہیں تلوار کی آنچ سے ڈرنا نہیں جانتے مگر خواتین کے ننگ وناموس کے خیال سے امید ہے کہ جس خدا نے حضرت حسینؓ کے اہل بیت کی کربلا سے دمشق تک حفاظت کی تھی وہی پاک بے نیاز ان سیدانیوں کو بھی ہر بلا سے محفوظ رکھے گا کیونکہ انہیں کی ذرّیت ہیں برمدے کے نالے کے چاروں طرف شہر پناہ نہ سہی مگر لوائے محمدیؐ کا سایہ اور حضرت خواجہ محمد ناصر صاحب کی عاطفت کی فصیل برمدے کے نالے کو گھیرے ہوئے ہے

آن ذاتِ مقدس ست ہردم حاضر　　برحال جہانیاں ہرجا ناظر
دستِ من و دامانِ رسولؐ و آلش　　درہر دو جہاں خواجہ محمد ناصر

پھر اہلِ دہلی نے دیکھ لیا کہ نادر شاہ درانی قتل وغارت لوٹ مار کرتے ایران روانہ ہوگیا

جن کی قسمت میں زیر وزبر ہونا تھا وہ زیروزبر ہو گئے مگر آپ کے دولت خانے تک نہ کوئی درانی آیا نہ قزلباش۔ آپ اور آپ کا سارا گھر خدا کے فضل و کرم سے محفوظ رہا مگر شہزادی مہر پرور کا اصرار رہا کہ بادشاہ (محمد شاہ رنگیلا) راجہ اندر بن گیا ہے۔ اسے سوائے عیش و نشاط کے کسی بات کا ہوش نہیں ہے آئے دن آفتیں نازل ہو رہی ہیں۔ آپ نے فرمایا میں وہاں آسکتا ہوں مگر ایک شرط پر فقیروں کے لیے فقیروں کی حیثیت کے مکان ہونے چاہیں یہ محلات تو تم بادشاہوں کو ہی مبارک رہیں۔ چنانچہ بیگم نے چیلوں کے کوچے میں نو مکان اور ایک بارہ دری کا انتظام کیا ایک مسجد تیار کروائی حضرت خواجہ میر درد معہ اہل و عیال ان مکانوں میں رہائش پذیر ہوئے اور وہ بارہ دری میر درد کی بارہ دری کے نام سے مشہور ہوئی۔

حضرت خواجہ میر درد علیہ الرحمہ کی باطنی صلاحیت اور خاندانی تربیت دونوں نے مل کر ان کی شخصیت کو ایسا بنا دیا کہ یگانۂ روزگار کہلائے ان کے ایک خمسے کا ایک بند دیکھیے جس سے ان کے روحانی مقامات کا اندازہ کیا جا سکتا ہے

اے درد رموزِ کبریائی   کب سمجھے ہے زاہد ریائی
بے عجز نہیں ہے واں رسائی   ہے مجھ کو جہاں پہ پرکشائی
پرواز شکستِ بال و پر ہے

اور جس کام کے لیے اللہ تعالیٰ نے سب کو اس دنیا میں بھیجا ہے میر درد وہ کام بخوبی کر گئے اور بہت مطمئن اس دنیا سے سدھارے کسی نے کیا خوب کہا ہے

من پاکباز عشقم ذوق فنا چشیدہ   آہوئے دشتِ ہویم از ماسوا رمیدہ

سید علی محمد شاد عظیم آبادی نے اپنی کتاب "حیاتِ فریاد" میں اپنے استاد حضرت سید الفت حسین فریاد کے حالات، زندگی تحریر کیے ہیں۔ کہنے کو تو کتاب ایک شخص کی سوانح عمری ہے مگر در حقیقت اس عہد کی یہ علمی اور تمدنی تاریخ ہے یہ عظیم آباد کے باکمالوں اور قدر دانوں کا مرقع ہے۔

سید الفت حسین فریاد اپنے زمانے کے ایک صاحبِ کمال بزرگ تھے عالم فاضل شاعر صوفی منش اور رئیس اعظم۔ اس کتاب کا وہ حصہ بے حد دلچسپ اور اثر انگیز ہے جہاں یہ ذکر ہے کہ کس طرح حضرت فریاد کے دو ماموں صاحبان سید وارث علی شاہ اشکی اور مولانا سید جمال شاہ جمال عظیم آباد سے دہلی گئے اور حضرت خواجہ میر درد کے آگے زانوئے تلمذ تہہ کیا اسی سلسلے میں اُس زمانے کی دہلی کی حالت، حضرت میر درد کا طریقۂ شاگردی، اصلاحِ شعر، انکا رکھ رکھاؤ اور شعر گوئی کی کیفیت بڑی دلآویز ہے۔ شاد صاحب تحریر کرتے ہیں۔

"غرض دلی پہنچنے کے دوسرے دن نہا دھو کر کپڑے بدلے رتھ پر سوار ہو کر چار گھڑی دن چڑھے خواجہ صاحب کے آستانے پر پہنچ گئے سیڑھیوں سے متصل ایک چھجا سا تھا وہاں پگڑی باندھے بالا بر کا انگرکھا پہنے کمر باندھے کوئی ملازم تھا کھڑا ہو گیا صاحب سلامت کر کے مودّب ہو کر پوچھا آپ صاحبوں کا کہاں سے تشریف لانا ہوا دونوں صاحبوں میں سے کسی نے کہا پٹنہ سے۔ یہ سن کہ اس نے کہا پٹنہ عظیم آباد سے فرمایا ہاں وہیں سے وہ آدمی خوش ہو گیا اور بولا میاں میں چار برس تک عظیم آباد میں رہ کر آیا ہوں حضرت شاہ گھسیٹا صاحب مجھ کو دہلی سے ہمراہ لے گئے تھے چار برس ان کی جوتیاں سیدھی کیں۔ عظیم آباد کے لوگوں کا کیا کہنا بڑے غریب نواز ملنسار وہاں کے رئیس ہیں اور دہلی والوں کے تو عاشق ہیں۔ ہاتھ سے اوپر اشارہ کر کے کہا میں ان حضرت (میر درد) کا مرید ہوں۔ پٹنہ میں دل نہ لگا یہاں چلا آیا کوئی چھ ہی مہینے تو آئے کو ہوئے ہیں پوچھا آپ صاحب کیا ہمارے حضرت کی بیعت چاہتے ہیں فرمایا نہیں کسی اور غرض سے دہلی آنا ہوا کہنے لگا میں اطلاع کیے دیتا ہوں لیکن حضرت پوچھیں گے کہ تُو تو اتنے دنوں عظیم آباد کی خاک چھان آیا تھا کون لوگ ہیں، کیسے ہیں فرمایا کہ کہدینا مولانا سید شاہ کمال علی صاحب کے بیٹے ہیں اس نے کہا اخاہ دھرم پور والے! میں تو وہاں دو مرتبہ جا چکا ہوں۔ فوراً اوپر گیا لمحے بھر میں وہ اور ایک اور صاحب سن رسیدہ سیڑھیوں سے اترے بڑے تپاک سے ملے اور اشارہ کیا کہ حضرت

مشتاق ہیں اور عذر کیا ہے کہ گھٹنوں کے درد کی وجہ سے مجبور ہوں اترنا دشوار ہے ورنہ خود حاضر ہوتا الغرض ان کے ہمراہ یہ دونوں حضرات اوپر گئے حضرت خواجہ صاحب ایک نورانی صورت بزرگ رنگت نکھری بدن بھرا بھرا خشخشی داڑھی ڈھیلا خولی کرتا گلے میں کمان وار دو پلی ٹوپی چھینٹ کی اس پر ایک خول مختصر سا لپٹا اوپر کاندھوں پر ڈالے، پشت پر ایک گاؤ تکیہ لگا تھا۔ جب تک یہ حضرات وہاں پہنچے دو شخصوں کی استعانت سے بمشکل کھڑے ہو گئے آؤ بھائی آؤ فرما کر دونوں صاحبوں کو گلے سے لگا لیا گویا ہمیشہ سے شناسائی تھی دونوں صاحبوں نے مصافحہ کر کے ہاتھ چومے گو کہ مریدانِ خاص الاعتقاد کا اکثر خانوادۂ فقرا میں پاؤں چومنے کا دستور ہے مگر ان صاحبوں نے یہ رسم ادا نہیں کی نہایت مودب ہو کر دو زانو بیٹھ گئے حضرت خواجہ صاحب نے مزاج پرسی کر کے پوچھا کہ اس اجڑے دیار میں کدھر سے آنا ہوا؟ عرض کیا قدم بوسی اور فیض پانے کے لیے عظیم آباد سے۔ خواجہ صاحب نے فرمایا تمہارا خانوادہ خود آفتاب کی طرح سارے ہندوستان پر پرتو انداز ہے تم کو اس کی کیا ضرورت ہے کہ ایک ٹمٹماتے چراغ کی طرف رجوع کرو حضرت اشکی نے عرض کیا ہم لوگوں کو یقین ہے۔ یہ وہ نور ہے جس کا پرتو آفتاب پر بھی ہے لیکن ہم لوگ تو زیادہ تر پیاسے دریائے سخن کے ہیں اگر ایک قطرہ بھی اس دریا کا نصیب ہو جائے تو کیا کہنا عمر بھر سیراب رہیں گے۔ خواجہ صاحب نے فرمایا آپ دونوں حضرات اہل سخن سے ہیں تو بھائی سچ یوں ہے کہ فقیر تو شعر و سخن سے نابلد ہے فقط وارداتِ دل کبھی کبھی نظم کر لیا کرتا ہے یا دش بخیر اگر پوچھو تو سید محمد تقی میر یا مرزا محمد رفیع سودا اس وقت استادان ریختہ، فارسی سے بھی پوری طرح آشنا ہیں ان حضرات سے رجوع بہتر ہے افسوس ہے زمانے نے سخت مجبور کر دیا چند دن ہوئے میر صاحب لکھنؤ تشریف لے گئے یہ فرما کر ایک شعر میر صاحب کا پڑھ کر آبدیدہ ہو گئے رومال سے آنکھوں کو پاک کیا۔

کون رو رو کے زندگی کاٹے   میر دلی میں جی نہیں لگتا

حضرت اشکی نے عرض کیا درست ہے وہ حضرات اپنی اپنی جگہ استادان فن ہیں مگر ہم بھو کے کسی اور ہی نعمت کے ہیں ان کے مذاق کچھ اور چاشنی چاہتے ہیں یہ کہہ کر حضرت اشکی نے مقطع پڑھا

ہر گھڑی آنسو بہاتا ہوں خود آہِ سرد ہوں　　　ناز اس پر ہے کہ اشکی خاکِ پائے درد ہوں

خواجہ صاحب نے فرمایا اشکی صاحب کیا اچھا آپ نے فرمایا بہتر ہے کہ دوسرے مصرع کو یوں فرمایئے: ''کیوں نہ میں اکثر کراہوں مبتلائے درد ہوں'' حضرت اشکی نے اٹھ کر سلام کیا۔ پھر خواجہ صاحب نے حضرت جمال کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا کہ بھائی تم کیا تخلص فرماتے ہو۔ ہاتھ جوڑ کر انہوں نے بھی ایک شعر پڑھا☆ :

خواجہ صاحب نے سن کر فرمایا ماشاءاللہ دونوں صاحبوں کو عالی طبع نصیب ہوا ہے ساتھ اس کے زبان بھی کیا پیاری اور ستھری پائی ہے بیشک بھائی تم اہلِ درد ہو

انہوں نے بھی فرشی سلام کیا دونوں صاحبوں نے ہاتھ باندھ کر عرض کیا کہ آج کا دن زندگی میں کیسا ہم لوگوں کے لیے مبارک تھا، یہ مرحلہ طے ہوا تو حضرت خواجہ صاحب نے ان سے پوچھا کہ کہاں قیام ہے اور سیدھے یہیں کیوں نہ آ گئے اس پر انہوں نے سارا ماجرا بیان کیا اور اجازت چاہی کہ جب تک دہلی میں مقیم ہیں روزانہ ایک وقت قدم بوسی کے لیے حاضر ہونگے اس کے بعد خواجہ صاحب نے ایک خادم کو جو ہر وقت دست بستہ سامنے حاضر رہتا تھا کچھ ارشاد فرمایا وہ چلا گیا تو فرمایا سنو بھائی ہمارے ہاں کا دستور یہ چلا آتا ہے کہ بروقت حصول تلمذ تھوڑی سی مٹھائی مولا مشکل کشا کی نذر کر کے دعائیں پڑھ کر شاگرد کو کھلاتے ہیں یہ سن کر ان حضرات نے عرض کیا بہت مبارک اور دس روپیہ مٹھائی کے لیے نکالے

☆ شعر واضح نہ ہونے کے سبب درج نہیں کیا گیا (ادارہ)

حضرت نے فرمایا کہ نہیں بھائی اتنے کی کیا ضرورت ہے دو چار آنے بہت ہوتے ہیں اس وقت تو میں نے لانے کو بھیج دیا ہے اتنے میں دو تانبے کے قلعی دار برتنوں میں برفیاں آئیں حضرت نے لوبان دان جلوایا اور بڑے ادب کے ساتھ باوجود پاؤں میں شدید درد کے کھڑے ہو کر نیاز دی کچھ دیر دعا کرتے رہے پھر ایک ڈلی برفی دونوں صاحبان کو اپنے ہاتھ سے کھلا دی اور برکت کی دعائیں دیں۔ اتنے میں توپ کی آواز آئی اور ساتھ ہی نقارے کی تو خود فرمایا کہ دوپہر کی توپ اس ویران قلعہ مُعلّیٰ میں چلتی ہے اور نقارہ بھی وہیں بجتا ہے۔

بعد اس کے ایک ملازم نے حاضر ہو کر فرشی تین سلام کئے اور عرض کیا کہ دسترخوان تیار ہے حضرت نے عجیب ہمدردی کے لہجے میں ارشاد فرمایا کیوں بھئی اس فقیر کے سوکھے ٹکرے بھی قبول کرو گے یا نہیں۔ انکار ممکن نہ ہوا دوسرے کمرے میں نہایت سفید شفاف بڑا دسترخوان بچھا تھا اس پر رکابیاں اور پیالوں میں انواع واقسام کی نعمتیں، نفیس کھانے تھے پندرہ سولہ مصاحب وغیرہ اور متعلقین بھی نہایت ادب سے سلام کر کے حسب مراتب دسترخوان پر آبیٹھے ایک جانب اشکی اور دوسری جانب جمال کو بٹھایا دو خدمت گار خالی رکابیوں میں روٹیاں کباب سالن وغیرہ لگانے لگے ان دونوں صاحبان کی رکابیوں میں اپنے ہاتھ سے روٹیاں کباب اور سالن عنایت کئے آخر میں پلاؤ آیا۔ پھر میٹھے چاول آئے اور تقسیم ہوئے (معلوم ہوا روزانہ دو وقت اس طرح دسترخوان پر یہی غذائیں رہتی ہیں دس بیس لوگ ہمیشہ کھاتے ہیں) خود حضرت کے آگے صرف ایک پیالہ تھا آپ نے سرپوش اتار کر نوش فرمایا۔ یہ اس وقت نہ معلوم ہوا کہ کیا تھا بعد کو سنا گیا کہ آپ ہمیشہ مونگ کی کھچڑی کے سوا اور کوئی چیز نوش نہیں فرماتے اور وہ بھی فقط ایک ہی وقت"

حضرت خواجہ میر درد کے اصلاح دینے کا کیا طریقہ تھا اس کا مختصر حال بھی سن لیجئے

''جناب خواجہ علیہ الرّحمہ کا طریقہ اصلاح یہ تھا کہ شاگرد کے کسی شعر میں اگر بالکل ہی مجازی مضمون ہوتا یا تو کوئی لفظ بڑھا کر حقیقت کا پہلو رکھ دیتے تھے یا اس شعر ہی کو کاٹ دیتے

تھے۔ اور پندرہ شعر سے زیادہ کسی غزل پر اصلاح نہ دیتے تھے ایک شاگرد کے سامنے دوسرے شاگرد کے کلام پر اس طریقہ سے کہ دوسرا اس سے مطلع ہو اصلاح نہ دیتے تھے جس زمانے میں حضرت اشکی اور حضرت جمال دلّی میں تشریف رکھتے تھے پانچ چھ شاگردوں سے زیادہ حضرت خواجہ صاحب کے شاگرد نہ تھے ہر شاگرد کی اصلاح کا ایک دن مقرر تھا اُس دن حضرت کے پائے مبارک پر ہتھیلی رکھ کر اپنی پیشانی اور آنکھوں سے مَس کرتا اور اپنی جگہ سر جھکا کر بیٹھ جاتا اور مجال نہ تھی کہ بغیر حضرت کے اشارے کے اصلاح کے لئے غزلیں پیش کرے یا زبان سے عرض کرے خود حضرت پوچھتے کیا کوئی غزل اصلاح کے لیے لائے ہو تب اشارہ پا کر سامنے حاضر ہوتا اور آپ غزل لے کر ملاحظہ کرنا شروع کر دیتے شاگرد وہیں سامنے حاضر رہتا اگر کوئی لفظ مشکوک ہوتا تو حضرت اس لفظ پر انگشت رکھ کر اس سے پوچھتے اور وہ شائستگی اور آہستگی سے جواب دیتا غزلوں پر زیادہ اصلاح بھی نہ دیتے تھے صرف چیدہ مقام پر اصلاح دے کر حوالے کر دیتے وہ اسی طرح حضرت کے پاؤں کو ہاتھ لگا کر اپنی پیشانی اور آنکھوں سے مس کرتا اور تین تسلیمات بجا لا کر رجعتِ قہقری کے انداز میں اپنی جگہ آ بیٹھتا شاگرد کو زیادہ شوق دلانے کی صورت یہ تھی کہ کسی برجستہ شعر کا قافیہ کہہ کر اس کی طرف خطاب فرماتے کہ بھئی اس قافیے والا اپنا شعر تو پڑھو اور حاضرین سے مخاطب ہو کر فرماتے دیکھو بھئی کیا اچھا شعر کہا ہے، جس کی تعریف جناب خواجہ صاحب کریں اس کا کیا پوچھنا چار اطراف سے صدائے تحسین بلند ہونے لگتی اس سے بھی زیادہ اگر کوئی شاگرد معزز ہوتا تو اس موقع پر اس کی شرح بیان کر کے اسکا لطف دوبالا کر دیتے۔''

جناب شاد عظیم آبادی نے اپنی کتاب ''حیاتِ فریاد'' میں اور بھی کئی باکمالوں کا ذکر کیا ہے اور اس دور کے شاعروں کے قاعدے قرینے آداب اور پابندیوں کے متعلق تحریر کر کے اُس دور کے ماحولِ سخن کی تصویر کھینچ دی ہے۔

حضرت خواجہ میر درد فرماتے ہیں کہ مجھ کو میری وفات کے بارے میں بیس برس پہلے ہی بتا دیا گیا ہے پھر ۱۱۹۹ ہجری میں ملہم غیبی نے آپ سے کہا کہ "بس اب کوچ کا وقت آ گیا دنیا سے چلنے کی تیاری کیجئے۔ اسی سال صفر کی ۲۴ ویں کو آپ رفیقِ اعلیٰ سے جا ملیں گے"

"درد ہم جاتے ہیں پر چھوڑے اثر جاتے ہیں"۔ فرمایا برادر عزیز ظہور الناصر معروف بہ میر اثر محمدی کمالات میں کسی طرح مجھ سے کم نہیں وہ میرے سجادے پر بیٹھیں گے اور ان کے بعد لختِ جگر الم (یہ آپ کے صاحبزادے کا تخلص ہے) تمہاری دردمندی کے لیے حاضر ہے۔

چنانچہ ایسا ہوا آپ نے صفر کی ۲۴ ویں ۱۱۹۹ھ صبح صادق کے وقت بعمر ۶۸ اڑسٹھ سال عالم قدس کی طرف رحلت فرمائی۔ آپ کے عہدِ زندگی میں محمد شاہ عالمگیر ثانی کا دورِ سلطنت ختم ہوا اور شاہ عالم (محمد شاہ رنگیلا) کے دورِ سلطنت میں وصال فرمایا آپ کے ہمعصر میرزا جان جاناں مظہر۔ میر عبدالحیٔ تاباں۔ سودا۔ میر تقی میر۔ میر سوز۔ شاہ ولی اللہ محدث۔ مولانا فخر جہاں فخر الدین چشتی نظامی۔ بھولو شاہ صاحب مجذوب وغیرہ باکمالوں کا اجتماع رہا شاہ عبدالعزیز دہلوی اور حضرت شاہ آفاق نقشبندی مجددی نے بھی آپ کا دور دیکھا اور آپ کی صحبت سے فیض یاب ہوئے۔

آپ کی تصانیف میں (۱) دیوانِ درد اردو (۲) دیوان درد فارسی (۳) رسالہ اسرار الصلوٰۃ (۴) رسالہ حرمتِ غنا (۵) واردت درد (۶) علم الکتاب (۷) آہِ درد (۸) نالۂ درد (۹) دردِ دل (۱۰) شمع محفل (۱۱) سوزِ دل واقعات درد ہیں ان کتابوں کے بارے میں میر ناصر نذیر فراق دہلوی جو ان کے نواسے کے نواسے ہیں اپنی کتاب میخانہ درد میں لکھتے ہیں کہ ان میں سے اکثر کتابیں ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں تلف ہو گئیں۔ بہت بڑا علمی اور عرفانی نقصان تھا۔ میخانہ درد حضرت خواجہ میر درد کے محیّر العقول واقعات ان کے مجاہدات ان کے ظاہری و باطنی کمالات کا حیران کن مجموعہ ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت خواجہ میر درد رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت کے کئی پہلو ہیں اور ہر پہلو ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر ہے وہ ایک عظیم شاعر ہیں ان کی شاعری کا مجازی رنگ اپنی جگہ ان کو ایک پختہ کار غزل گو ثابت کرتا ہے اور جب

ان کے اس دعوے کا جائزہ لیا جائے کہ زمین شعر میں انہوں نے گلزار معرفت کھلا دیا ہے اور اب یہ گلستان اپنی بہار دکھائے گا تو پھر ان کی شخصیت کا عارفانہ رنگ بھی اپنی جگہ اتنا پختہ ہے کہ وہ سعدی جامی اور حافظ سے کسی طور بھی کم نظر نہیں آتے ان کے شب و روز کا جائزہ لیا جائے تو وہ ایک زاہد شب زندہ دار اور صوفی صافی دل نظر آتے ہیں اور قرون اولیٰ کے اولیائے کاملین کی صفِ اوّل میں شمار ہوتے ہیں وہ دنیا سے بے نیاز اور اُس پاک بے نیاز مالک و مولائے کل اللہ جلّ شانہٗ کے نیاز مندوں میں نظر آتے ہیں ان کا کوئی سانس اللہ کے ذکر سے خالی نہیں تھا اور یہی مقامِ فنا ہے جس کو انہوں نے بغیر اَن الحق کا نعرہ لگائے ہوئے پالیا وہ نہ صرف بہت بڑے شاعر اور بہت بڑے صوفی تھے بلکہ موسیقی میں ایسا کمال حاصل تھا کہ اس فن کے ماہر بھی ان سے مشورے کے لیے حاضر ہوتے تھے بقول خود ان کے "مجھے خدا تعالیٰ نے عقلِ کامل و نفسِ کامل اور روحِ کامل اور جسدِ کامل کے ساتھ مظہر اپنے تمام اسماء کا پیدا کیا" اور وہ یقیناً مجدّدی خانوادے کی تمام پُر اثر نسبتوں کا مرقع تھے

اے درد اگر چہ مے میں ہے جوش و خروش — رہتے ہیں ولے اہلِ تامّل خاموش
موجوں کو شراب کی وہ پی جاتے ہیں — گرداب کی مانند جو ہیں دریا نوش

ترجمہ: پرتو روہیلہ

حضرت سید علی غمگین کا ایک فارسی خط غالب کے نام

اس سے پیشتر کہ حضرت غمگین کے خط کا ترجمہ پیش کیا جائے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ غالب کے اُس خط کا خلاصہ پیش کر دیا جائے جس کے جواب میں حضرت غمگین نے غالب کو یہ خط لکھا ہے۔ غالب نے اپنے خط میں لکھا ہے کہ مجھے آپ کی ارسال کردہ غزل مل گئی ہے۔ اب مجھے رباعیات کے دیوان کا انتظار ہے۔ اپنی ''ہیچ مدانی'' کے پرزور اظہار کے بعد انھوں نے اس امر کو اپنے لیے انتہائی باعث افتخار قرار دیا ہے حضرت غمگین نے غالب کو اپنے خط میں یہ تاکید بھی کی تھی کہ میں اپنا دیوانِ رباعیات (جس کے سارے مضامین عرفانیات سے تعلق رکھتے ہیں) آپ کو ارسال کر رہا ہوں لیکن آپ اس کو کسی ''غیر'' کو نہ دکھائیں۔ سو غالب نے اپنے خط میں تعمیل حکم کا اعلان کرتے ہوئے بھی یہ سوال اٹھایا ہے کہ حضرت یہاں ''غیر'' کون ہے۔۔۔۔ ہر وہ شخص کہ اس کے معنی اچھی طرح سمجھ سکتا ہے غیر نہیں ہوا۔ چونکہ اس عالم میں دیر و حرم کی کوئی تفریق نہیں۔ معزز قارئین پر غالب کے بیان کردہ آخری جملے سے یہ بات کلیتاً عیاں ہو جائے گی کہ اپنی انتہائی ارادت و عقیدتمندی اور احترام و اعتزاز کے باوجود اُس آزاد روح پر شریعت کا تو کیا طریقت کا جامہ بھی موزوں نہیں۔ اور وہ ایک لمحے کے لیے بھی بامِ تشکیک سے نیچے نہیں اترنے کے لیے تیار نہیں۔

(ترجمہ) اے میرے مشفق! اس اعتراض پر جو آپ نے لفظ ''غیر'' پر کہ (فی نفسہٖ) باطل ہے کیا ہے، مجھے بڑی خوشی ہوئی۔ اللہ تعالیٰ آپ کی ندرت خیال اور اندازِ بیان کے باوصف ہماری ملاقات بھی کرائے۔ سو اب اس کا جواب بھی سن لیجیے۔ ''غیر'' ایک بے معنی لفظ ہے۔ چونکہ وہ دراصل ''عین'' ہے غیر نہیں، لٰہذا غیر کے کوئی معنی نہیں ہوئے۔ اگر عین کہو تب اور غیر کہو تب نشان وہی حق ہی کی ہوتی ہے اور (اس طرح) یہ دونوں الفاظ ایک ذات ہی کی صفات ہیں۔ اسی طرح

لفظ 'غیر' کو 'تقید' کے اور 'عین' کو 'اطلاق'' کے مرتبے پر رکھ کر غور کریں اور اگر ہیں، تُو اور وہ کو جو دوئی سے وجود پاتے ہیں، عبارت سے خارج کر دیں تو (اصل) معنی حاصل ہو جاتے ہیں۔ ورنہ تقید کے طور پر تو آپ جو کچھ بھی کہیں جائز ہے۔ (صرف) کہنے سے غیر غیر نہیں ہو جاتا اور عین عین نہیں ہو جاتا۔ وہ جو (موجود) ہے وہ بے نام ونشاں (موجود) ہے۔ ہر جگہ اک نیا نام ونشاں رکھتا ہے۔ اسی لیے ابن عربی قدس سرہٗ جب اپنے الفاظ میں ('عین کی) تعریف کرتے ہیں تو فرماتے ہیں۔ (ترجمہ عربی) ''پاک ہے وہ ذات جس نے اپنے آپ کو لطیف بنایا اور اپنا نام رب رکھا اور پاک ہے وہ ذات جس نے اپنے آپ مکشوف (ظاہر) کیا اور اس کا نام 'عبد' رکھا''۔ لیکن تعجب کی بات ہے کہ اسی اعتراض پر میں نے سہیل بن تستری اور حضرت خواجہ جنید بغدادی رضی اللہ عنہ کو نقل کرتے ہوئے آپ کے خط میں لکھا تھا کہ بزرگوں نے یہی کہا ہے۔ اب چونکہ آپ کو بزرگوں کے قول پر یقین نہیں تو میں ایک حدیث بھی تحریر کرتا ہوں۔ حدیث ہے کہ اسی طرح ایک بار رسولؐ مقبول اصحاب صفہ سے محو گفتگو تھے کہ حضرت عمرؓ تشریف لے آئے۔ رسولؐ مقبول خاموش ہو گئے۔ جب حضرت عمرؓ کسی دوسرے کام میں مصروف ہو گئے تو رسولؐ اللہ نے دوستوں (اصحاب) سے فرمایا کہ کہیں آپ لوگوں کے دل میں یہ شک نہ آئے کہ میں حضرت عمرؓ سے کوئی بات چھپا رہا تھا۔ (دراصل) اس وقت وہ بات ان سے کرنا مناسب نہیں تھی۔ اس لیے خاموش ہو گیا۔ اور حضرت شبلی قدس سرہٗ پر جب کیفیات واحوال کا غلبہ ہوا تو انہوں نے برسرِ منبر ان باتوں (عرفانیات) کا آغاز کر دیا۔ (چنانچہ) حضرت جنید قدس سرہٗ نے ان سے کہا کہ میں نے جو باتیں تجھ سے تہہ خانوں میں کی ہیں تو اعلانیہ لوگوں سے کرتا پھر رہا ہے۔ شبلیؒ نے جواب دیا میں جو کچھ سن رہا ہوں وہی (کہہ) بتا رہا ہوں (سواب) آپ کو اختیار ہے الاّ فلا (اگر نہیں تو پھر نہیں)

ہر بات کا ایک وقت اور ہر نکتے کی ایک جگہ ہوتی ہے۔''

اے میرے مشفق یہ قوم (مسلمانانِ عالم) ہمیشہ سے خدا کے واسطے ہی خدا سے برسرِ پیکار ہے۔ ہر لمحے ایک زنّار باندھتے اور توڑتے ہیں تا کہ کفر و اسلام کے مراتب اعلیٰ حاصل کر سکیں۔

توجہ فرمائیے کہ (بزرگانِ دین) نے اکثر اسرار (معرفت) پوشیدہ رکھے ہیں۔ تو اگر میری رباعیات (کے عنوانات) پر کسی کی نظر پڑ گئی تو وہ ایک دکان سجالے گا اور اپنے آپ کو ان کا (قیاسی۔خالق) ظاہر کرے گا، خلق خدا کو گمراہ کرے گا اور نقالوں کی بعض باتوں کی فہم بھی (خلق خدا کے ساتھ یہی عمل کرے گی۔ (چنانچہ) ایک وہ وقت آجائے گا کہ ان رباعیات کا راز (بھی سارا) افشا ہو جائے گا۔ (اس لیے فی الحال) اس کو اسی طرح (پردے ہی میں) رکھیے۔

میں (اس ضمن میں) مجبور ہوں چونکہ بزرگان دین اسی طرح کرتے رہے ہیں۔ اور ہم (سالکانِ طریقت کو) جو حضرات قادریہ و نقش بندیہ (کے زمرے میں آتے ہیں) ابتدائے سلوک سے لے کر انتہائے جذب تک اسرار لکھنے کی ممانعت تھی اور وہ اس وجہ سے کہ یہ اسرار شاذ ہی کسی نے لکھے ہیں۔ اور تعمیل حکم کے طور پر اگر لکھے بھی گئے ہیں تو عقل کا فیصلہ یہی ہے کہ ہر دیکھنے والا بذریعہ نظر حقیقتِ معنی تک نہیں پہنچ سکتا۔ اور ہر وہ شخص جو (حقیقت) معنی تک آسانی سے پہنچ سکتا ہے لازماً غیر نہیں۔ ''سیر لاقطاب'' میں اسی طرح یہ نقل کیا گیا ہے کہ حضرت معین الدین چشتی قدس سرہٗ نے حضرت محبوب سبحانی سے ملاقات پر عرض کیا کہ خدا تعالیٰ کی کوئی بات کیجیے تو اس پر حضرت محبوب سبحانی نے فرمایا کہ ایسی بات کے لیے کوئی گوشہ چاہیے۔ خواجہ صاحب نے فرمایا کہ گوشے کی حاجت اس لیے نہیں کہ اگر وہ خدا تعالیٰ ہی کی بات ہے تو پھر اس سے دریغ کیسا اور اگر وہ بات (فی نفسہٖ) خدا کی بات نہیں تو وہ (اپنی نارسی کے سبب) خود بخود (سامع) تک نہیں پہنچ پائیگی۔ لیکن یہ حکایت سوائے سیَر الاقطاب کے کسی دوسری مستند کتاب میں نہیں پائی گئی اور مورخوں میں سیر الاقطاب کا کچھ زیادہ اعتبار بھی نہیں۔ اور ہر وہ شخص جس نے اس راہ (طریقت) میں قدم رکھا ہے اس پر اس حکایت کی ضعیفی ہویدا ہے اور (عیاں ہے) کہ اس کی کوئی سند نہیں، بطور منقول کتاب میں در آئی ہے۔ اور کہا گیا ہے کہ (بھلا) غیر کون ہے؟ تو غور فرمائیں کہ اس عالم میں تم (بذاتِ) خود اپنے (لیے) غیر ہو تو غیر کا کیا کہنا (البتہ) یہ بات ذرا باریک ہے۔ کوئی شخص جو اس مرتبے پر نہیں پہنچا (اس کو) سمجھ نہیں سکتا۔ رسول اللہ صلعم سے لے کر اس زمانے تک

تمام صوفیا نے ان امور کو عوام الناس سے پوشیدہ رکھا ہے۔ (سو) لازم ہے کہ آپ بھی ایسا ہی کریں۔ اور فی الوقت اس حقیقت عین تامہ کو بھی ''غیر'' ہی تصور فرمائیں۔ میرے بھائی آپ یہ خیال فرمایئے کہ ایک لامتناہی وجود ہے اور اس وجودِ بے حد و بے کنار میں صفات سمائی ہوئی ہیں اور ایک سالک کو دوسرے کی خبر نہیں ہے۔ (لہٰذا) مناسب یہی ہے کہ آپ بھی اس فقیر کے کہے پر عمل فرمائیں۔ (بظاہر) جب تک (بالمشافہ) ملاقات نہیں ہوتی آپ کی اپنے تصور ''عین و غیر'' سے نجات مشکل ہے۔ عاقل کو اشارہ کافی ہے۔

آپ نے تحریر فرمایا ہے کہ (مجموعہ) رباعیات کے دیباچے میں میری تعریف نہ فرمائیں اور اس نیاز مند کو میری حیثیت پر ہی رہنے دیں کہ اس میں کوئی نقصان نہیں۔ تو عرض یہ ہے کہ دوست یہ چاہتا ہے کہ کوئی شخص اس کے دوست کی تنقیص نہ کرے اس لیے ہزار طریقوں سے اس کی تعریف کرتا ہے سو میں آپ کی تعریف کیوں نہ کروں لیکن اس قدر ضرور باور کیجئے کہ میں جھوٹ نہیں بولونگا اور میری تقصیر معاف، خدا تعالیٰ سے قوی امید کرتا ہوں کہ بعد ملاقات آپ کا اعتراض بھی رفع ہو جائے گا آمین یارب لعالمین۔

عارف جانتا ہے اور دیکھتا ہے کہ روئی (لباس کی شکل میں) آپ کو پورے طور پر ڈھانپ لیتی ہے لیکن چادر کو یا دستار کو روئی نہیں کہا جاتا۔ اسی طرح 'عین' اور 'غیر' کو بھی قیاس فرمایئے۔

رباعی

اس ایک وجود میں کیا ہے کیا سیر
زاہد ہے حرم ہے اور غمگیں ہے دیر
اسما و صفات ہیں یہ فہمائش کے
کہنے سے عین ہو نہ کہنے سے غیر

رباعی

گو چرخ چہار کی تجھ کو ہو سیر
اس کا تُو غیر اور ترا ہے وہ غیر
یہ شرِ خودی نہ جائے جب تک تجھ سے
حاصلِ عینیت، غمگیں ہے خیر

ایک شخص حضرت شبلیؒ کے پاس آیا اور اس نے کہا عارف کس کو کہتے ہیں۔ انھوں نے فرمایا (عارف وہ ہوتا ہے) کہ جسے سات آسمانوں میں ایک بال تک نظر آتا ہے۔ وہ خاموش ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد ایک اور شخص آیا اور اس نے (بھی) یہی پوچھا عارف کسے کہتے ہیں۔ شبلی قدس سرہ نے جواب دیا (عارف) ایک مچھر کا بھی مقابلہ نہیں کرسکتا۔ ایک اور شخص جو وہیں بیٹھا ہوا تھا یہ سب سن کر حیران ہو گیا اور اس نے کہا اے شیخ پہلے آپ نے کیا کہا تھا اور اب آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ انھوں نے فرمایا پہلے میں نہیں وہ (خدا) بول رہا تھا۔ اس وقت میں (بول رہا) ہوں۔ عالِم اور عارف میں یہی فرق ہوتا ہے۔

رباعی

عارف کو یہی دوام رہتی ہے سیر — اک دم میں تو شر ہے اور اک دم میں خیر
ہیں مختلف آن آن غمگیں حالات — گا ہے ہے عین اور گاہے ہے غیر

اور 'غیر' کی تفہیم اس سے بھی ہو سکتی ہے کہ اغیار سے ہماری مراد مقلّدین سے ہے۔ اور تقلیدی ہی وہ شخص ہوتا ہے کہ (دنیاوی) عزت و نام و نمود کے لیے اس علم کو حاصل کرتا ہے لیکن اس پر (خود) عمل نہیں کرتا۔ یعنی وہ عالِم بے عمل و بے حال ہوتا ہے اور آپ اگر اس امر کی حقیقت پوچھیں اور اس کو (میرا) تکبّر نہ تصور کریں اور اپنے بھلے کا خیال رکھیں تو ہمارا 'غیر' آپ کے 'عین' سے بہتر ہے۔

رباعی

وہ شخص لطیف اور وہ فہم ہے پاک — شائستہ ہو اسپ عقل جس کا چالاک
غمگیں جو رخش بے محابا ہو تیز — انسان کو شرط اس سے ہے خوف و باک

زیادہ۔ والسلام

مرزا غالب اور حضرت سید علی غمگین کے فارسی مکاتیب

(مآخذ و دریافت)

مرزا غالب کے مکتوب الیہم میں حضرت غمگین کا نام بوجوہ بہت اہم ہے۔ اس کا سب سے بڑا سبب وہ بعد المشرقین و مغربین تھا جو دونوں کے طرزِ زندگی میں تھا یعنی بادی النظر میں ایک مشہورِ زمانہ شاعر و رند شاہد باز کا تعلق ایک سالکِ طریقت اور ایک صوفی مشرب انسان سے، عجوبگی کا مظہر تھا۔ اس کے ساتھ ہی چونکہ ان خطوط سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت غمگین کی ہدایت و ارشاد پر غالب روحانی فیض کے لیے وہ ریاضات بھی کیا کرتے تھے جو عام طور پر پختگان سلوک کے لیے ہوتے ہیں۔ اس لیے بہت سے غالب کے معتقدین نے غالب کو فرقہ ملامیتہ سے نسبت دے کر باطن ولی کامل بھی قرار دیا ہے۔ چنانچہ غالب کی زندگی میں حضرت غمگین کی مراسلت ضرورت سے کچھ زیادہ ہی اہم ہوگئی ہے۔

میرے سامنے فی الوقت غالب کے وہ دس اور حضرت غمگین کے چار فارسی خطوط ہیں جو اورینٹل کالج میگزین (فروری ۱۹۴۶ء) میں ڈاکٹر سید عبداللہ کی زیرِ ادارت طبع ہوئے ہیں اور جن میں متن کی تصحیح بقول ڈاکٹر مذکور، سید وزیر الحسن عابدی اور انہوں نے خود کی ہے۔ ڈاکٹر عبداللہ کو یہ خطوط کا مسودہ مسعود احمد صاحب ایم۔ اے شعبہ اردو گورنمنٹ کالج میرپور (پاکستان) سے ملا تھا۔ بقول ان کے ''بعض جگہ متن بے حد غلط تھا۔ اس کو درست کرنے کی پوری کوشش کی گئی ہے پھر بھی ممکن ہے غلطیاں رہ گئی ہوں۔ جہاں قیاسی تصحیح یا اضافہ کیا ہے وہاں قوسین کا استعمال کیا ہے۔ متن میں جہاں جہاں خلا ہیں ان کو نقطوں سے ظاہر کیا گیا ہے''۔

ڈاکٹر سید عبداللہ کی مختصر مندرجہ بالا تحریر کے ساتھ ہی اس میگزین میں ان خطوط کے ساتھ ایک پیش لفظ بھی ہے جس کے نیچے محرر کا نام اس طرح لکھا ہے ''از شاہ رضا محمد حضرت جی غفرلہ''۔ اس پیش لفظ کی تاریخ مندرجہ ذیل ہے ''بتاریخ ۱۵ مئی ۱۹۶۱ء۔ نہ تو ڈاکٹر سید عبداللہ نے اور نہ ہی

وزیرالحسن عابدی نے کہیں بتایا ہے کہ شاہ رضا محمد حضرت جی کا حضرت غمگین سے یا حضرت غمگین کے ان کے جلیل القدر خلیفہ حافظ میاں ہدایت النبی قادری گوالیاری مرحوم سے، جنھوں نے یہ سارے رقعات جمع کر کے اپنے قلم سے نقل کیے ہیں، کیا تعلق ہے۔ نہ ہی اس ''پیش لفظ '' سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ سارے رقعات شاہ رضا محمدؒ حضرت جی تک کس طرح پہنچے اور انھیں مندرجہ حقائق تحریر کرنے کی نوبت کس طرح آئی۔ ان تحریروں سے یہ بھی ظاہر نہیں ہوتا کہ شاہ رضا محمدؒ حضرت جی کا مسعود احمد صاحب ایم۔ اے شعبہ اردو گورنمنٹ کالج میر پور (پاکستان) سے کہ جن کے ذریعے ڈاکٹر سید عبداللہ کو یہ مسودہ ملا تھا کیا تعلق تھا۔ بہر حال قارئین کے لیے میں ان کے پیش لفظ سے چند اہم امور نقل کرتا ہوں۔

''مرزا غالب مرحوم نے جو رقعات حضرت خدانما سید علی شاہ غمگین ناخدائے سخن علیہ رحمۃ کی خدمت بابرکت میں ارسال کیے اور جو رقعات جواب میں تحریر کیے گئے ان سب کو حضرت شاہ غمگین خدانما کے ایک جلیل القدر خلیفہ مولانا حافظ میاں ہدایت النبی قادری گوالیاری مرحوم ومغفور نے جمع کر کے اپنے قلم سے نقل فرمائے ہیں۔ یہ نسخہ کتب خانہ فقیر منزل گوالیار جلد نمبر ۱/۳۳ پر موجود ہے''۔

''مذکورہ بالا مجموعۂ خطوط ۱۲۵۷ھ میں نقل کیا گیا ہے جب کہ حضرت غمگینؒ خود حیات تھے.... اس مجموعے میں دس خط وہ ہیں جو مرزا غالب نے شاہ غمگین علیہ الرحمۃ کو بہ حیثیت اپنے پیر ومرشد رقم کیے ہیں۔ اور چار خطوط وہ ہیں جو حضرت غمگین نے غالب کو تحریر کیے ہیں۔ یہ خط وکتابت ۱۲۵۳ھ لغایت ۱۲۵۶ جاری رہی ہے۔ مرزا غالب کے تین خطوط میں سنہ بھی تحریر ہیں مگر دیگر چار خطوط میں صرف تاریخ لکھی ہے اور تین خطوط میں نہ تاریخ ہے اور نہ سنہ اور حضرت صاحبؒ کے خطوط میں تو نہ تاریخ ہے اور نہ سنہ''۔

غالب اور غمگین کی اس مراسلت پر خواجہ احمد فاروقی صاحب کا ایک مبسوط مقالہ ''غالب کے چند غیر مطبوعہ فارسی رقعات حضرت غمگین کے نام'' کے عنوان سے دہلی یونیورسٹی کے شعبہ اردو کے

رسالے ''اردو معلیٰ'' کے غالب نمبر ۱۹۶۰ء شمارہ نمبر ۱ میں چھپا ہے۔ اس مقالے میں فاضل مصنف نے حق تحقیق ادا کرتے ہوئے حضرت غمگین کے متعلق اور بھی ایسے حقائق پیش کیے ہیں جنہوں نے حضرت غمگین کی شخصیت کو مزید روشن کر دیا ہے۔ چنانچہ اس مضمون کو اس عنوان کا ضمیمہ سمجھتے ہوئے اس کے اہم اور متعلق اقتباسات پیش کیے جاتے ہیں کہ ہر قاری پر اس مراسلت کا گوشہ گوشہ روشن ہو جائے

''غالب نے حضرت غمگین کی رباعیات کے متعلق لکھا ہے کہ انہوں نے ذرے میں آفتاب اور کوزے میں دریا کو بند کر دیا ہے اور ان کے دیوان رباعیات میں وہ مطالب پوشیدہ ہیں جو مثنوی مولانا روم میں بھی نہیں۔ ان رباعیات کا قلمی نسخہ'' مکاشفات الاسرار'' انڈیا آفس لائبریری لندن میں موجود ہے۔ بلوم ہارٹ نے اس کا تعارف مندرجہ ذیل الفاظ میں کرایا ہے''۔

یہ سید علی دہلوی المعروف بہ حضرت جی المتخلص بہ غمگین کی متصوفانہ رباعیات کا دیوان ہے۔ اس کے فارسی مقدمے میں مصنف نے اپنے حالات لکھے ہیں جن کی ابتدا ان اردو اشعار سے ہوتی ہے۔

ایک عمر رہی میری اللہ کی جنگ ۔۔۔۔ دنیا میں رہا شکست سوسو فرسنگ
غمگین مغلوب اب ہوا ہوں ایسا ۔۔۔۔ نہ فوج رہی، نہ میں، نہ وہ نام و ننگ

''فارسی مقدمے کے ابتدائی الفاظ یہ ہیں'' حامد ابعد حمدِ حقیقت و نعت صورت خود سید علی عرف حضرت جی متخلص غمگین متوطن دہلی، قادری نقشبندی، ابوالعلائی المشرب مجملاً از احوال خود بعرض احباب صفوت انتساب می رساند''۔

شروع کی رباعیوں میں بسم اللہ کی تفسیر ہے اور ابتدا کا یہ شعر ہے۔

بسم اللہ میں سب ہے جو کہ قرآن میں ہے ۔۔۔۔ قرآن میں وہ ہے جو کہ انسان میں ہے

(حضرت) سید علی دہلوی گوالیار کے ساکن تھے۔ ان کے والد کا نام سید محمد تھا جو دہلی کے گورنر شاہ نظام الدین احمد قادری (تلمیذ رنگین) کے بھتیجے تھے۔ غمگین کے والد کا انتقال اس وقت ہوا جب ان کی عمر بارہ سال تھی۔ ۲۵ برس کی عمر میں درویشی اختیار کی اور سید فتح علی رضوی سے

بیعت ہوئے۔ اس کے بعد گوالیار سے پٹنے اور پٹنے سے گیا کا سفر کیا۔ گیا میں ان کو حضرت شاہ ابوالبرکات کی خدمت میں نیاز حاصل ہوا جن کے مشورے سے وہ بارہ برس تک پٹنے میں رہے، جہاں انہوں نے خواجہ ابوالحسین سے فیض باطنی حاصل کیا اور ان کے حلقہء ارادت میں شامل ہو گئے۔

مکاشفات الاسرار میں حضرت غمگین نے اپنے حالات لکھے ہیں۔ اس لیے دیباچہ اہمیت سے خالی نہیں۔ یہاں اس کے چند حصے نقل کئے جاتے ہیں۔

''مجملاً از احوال خود بعرض احباب صفوت انتساب می رساند کہ ایں فقیر ابن سید محمد بن احمد بن سید شاہ پیر بن سید محی الدین بن سید شیر محمد القادری کہ در برہان پور آسودہ اند و زیارت گاہ خلائق اند از اولاد سید محی الدین عبدالقادر جیلانی است۔۔۔ وجدہ فقیر بنت خواجہ الٰہی بن خواجہ بہاؤالدین بن خواجہ عبداللہ المشتہر بہ خواجہ خورد محقق ابن خواجہ باقی باللہ الحسنی المتخلص بہ بیرنگ قدس اللہ اسرارہم است کہ در دہلی زیارت گاہ خلائق اند۔۔۔ فقیر دوازدہ سال بود کہ والد بعالم بقا رحلت فرمودند۔ گاہ گاہ ایں خیال می آمد کہ از کسے دوستِ حق بہ پیوندم و تعلیم راہ حق ازد حاصل نمایم۔ چوں (بہ) عمر بست و پنج سالگی رسیدم بہ تحصیل علوم مشغولی ورزیدم وچنکہ عمر بہ بست و نہ سالگی رسید شبے درخواب دیدم کہ شخصے می گوید کہ ترا عم تو سید شاہ نظام الدین احمد قادریؒ می طلبند''۔ اس خواب کی تعبیر حضرت فتح علی شاہ گردیزی نے بیان کی اور فرمایا ''کہ تعبیر ایں خواب ہمیں است، ترا مبارکباد، بروز جمعہ پیش ما آئی۔ پس روز جمعہ حسب ارشاد رسیدم واز دولتِ بیعت وطریقہ فائز گشتم''۔

اس دیباچے سے حضرت غمگین کی ادبی زندگی پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ ''از زمان سابق دیوانِ ریختہ گفتہ بودم آں را دور کردم الحال کہ عمر بہ شصت سالگی رسیدہ انچہ کہ واردات بر من غالب بودند موافق آں ہا دیوانِ دیگر در حالات واردات و ذوق و شوق حقیقی و مجازی خود ترتیب دادم و بعضے غزلیات مخصوصہ دیوان سابق دریں دیوان لاحق مندرج ساختم و چوں دیوان نو بہ اتمام رسید و واردات و غلبات و کیفیات بر دلم استیلا داشت، خواستم کہ برائے برادر دینی عزیز از جان اسد اللہ خان مرزا نوشہ متخلص بہ غالب و اسد کہ دریں زمانہ در نظم و نثر نظیر خود ندارند۔۔۔ ترتیب دہم''۔

حضرت غمگین نے مکاشفات الاسرار کی شرح بھی لکھی ہے جس کا نام ''مرأت حقیقت'' ہے۔ اس کے علاوہ ایک کتاب شغل واشغال میں بھی لکھی ہے جو ارشاد الحسنین کے نام سے مشہور ہے اس لیے کہ حضرت سید فتح علی گردیزی کے ارشادات پر مشتمل ہے۔ اس کا دوسرا نام ''جواہر نفسیہ'' ہے۔

حضرت غمگین کے حالات ان کی تصنیفات کے علاوہ دوسرے بزرگوں کے ملفوظات میں بھی ملتے ہیں۔ کیفیت العارفین میں لکھا ہے۔

''چوں حضرت قطب العاشقین (حضرت ابوالبرکات) ہجوم خلائق بہ خود دیدند آں زماں اکثر طالبان راہ راجہت تربیت یافتن باطن تفویض خلف الرشید خود حضرت خواجہ ابوالحسن صاحب فرمودند۔ چنانچہ درآں روزھا سید علی شاہ (غمگین) از گوالیار طالب نعمت باطنیہ گشتہ بہ خدمت حضرت قطب العاشقین آمد تربیت یافتہ، مشرف از خلافت از خواجہ ابوالحسن صاحب گردیدہ مراجعت بہ سمت گوالیار کردند۔۔۔''

''یہ مآخذ سوانح غمگین کے سلسلے میں اہم ہیں لیکن افسوس ہے کہ ان سے نہ تو تاریخ ولادت معلوم ہوتی ہے اور نہ تاریخ وفات۔ غمگین اکادمی میں ایک وظیفے کی کتاب ہے۔ اس میں حافظ میاں عبدالرزاق میاں میرن علی المتخلص بہ رزاق کے قلم سے حضرت غمگین کی تاریخ ولادت یکم صفر ۱۱۶۷ھ (مطابق ۱۷۵۳ء) اور تاریخ وفات ۳ صفر ۱۲۶۸ھ (مطابق ۱۸۵۱ء) لکھی ہوئی ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو سابقہ بیانات کی رو سے ۹۲ سال کی عمر یعنی ۱۱۹۶ھ (مطابق ۱۷۷۲ء) میں بیعت ہوئے اور ان کی نئی زندگی کا آغاز ساٹھ سال کی عمر یعنی ۱۲۲۷ھ (مطابق ۱۸۱۲ء) میں ہوا۔

غمگین کی وفات پر نواب مصطفیٰ خان شیفتہ نے ایک قطعہ تاریخ کہا ہے جس سے رزاق کی تصدیق ہوتی ہے۔

بہ عرف حضرت و غمگین تخلص	شدہ سید علی فخر زمانی
بصورت سالکِ راہِ طریقت	بمعنی شاہ ملک کامرانی
بدیدہ محو دیدار خدا بود	بدل آگہ ز اسرار نہانی

بطونش دیدۂ کحل البصیرت	ظہورش سرمۂ چشم معانی
دلش چوں یافت ذوق ربِّ ارنی	خطاب آمد کہ تو در خود نمانی
بہ یک شنبہ سوم روز صفر شد	کلیم آسا بزیرِ کوہ فانی
زدل آ ہے کشیدہ شیفتہ گفت	بہ برد اورا صدائے لن ترانی

۱۲۶۸ھ = (۱۸۵۱ء)

غمگین کا ذکر بعض تذکروں میں بھی ہے عمدۂ منتخبہ (تذکرۂ سرور) میں لکھا ہے "غمگین تخلص میر سید علی خلف الرشید میر سید محمد مرحوم برادرزادہ حقائق و معارف آگاہ سید شاہ نظام الدین احمد قادری ناظم صوبہ دار الخلافہ تشریح بزرگی وحسب نسب محتاج بہ تحریر نیست، مرد با مروّت وقابل است۔ از تصانیف اوست

تو نے صیاد نیا ظلم یہ ایجاد کیا	بال و پر توڑ قفس سے مجھے آزاد کیا
ہجر میں اس کے یہ دل جینے سے میرا سیر ہے	اے اجل بہر خدا آ جلد اب کیا دیر ہے
دل اس کو دیا اب کیا تدبیر سے ہوتا ہے	جو کام کہ ہوتا ہے تقدیر سے ہوتا ہے

عیار الشعرا میں خوب چند ذکا نے لکھا ہے

"میر سید علی غمگین۔۔۔جوانِ گرم اختلاط وخوش خلق وشگفتہ بیان، سعادت آثار، ستودہ اطوار، پرحلم وحیا معلوم شد۔ بہ اصلاحِ سعادت یار خان رنگین گلہائے اشعارِ آب دار خود را رنگ وبوئے تازہ بخشیدہ ہمگی دیوان معروف او بہ نظر ایں فقیر انواع المعانی آمدہ"

اس کے بعد نمونۂ سات اشعار دیے ہیں

مرا اس عشق کی دولت سے چہرہ ارغوانی ہے	نکلتا ہے جو اشک آنکھوں سے میرا ارغوانی ہے
مہرباں کوئی مرا جز غم دلدار نہیں	خس کا شعلے کے سوا کوئی خریدار نہیں
مضطرب تھا دل اپنا جوں پارا	آخر اس شوخ نے جلا مارا
ایک مدت رہے (ہم) عشق بتاں میں غمگیں	بعد از آں کعبہ کو بھی کر کے سفر دیکھ لیا

سرور اور ذکا وغیرہ کے تذکروں میں جن اشعار کو منتخب کیا گیا ہے وہ موجودہ دیوان غمگین میں نہیں ہیں۔ اس لیے قرینہ غالب ہے کہ یہ اشعار اس دیوانِ اوّل کے ہیں جو ۱۱۹۷ھ سے پہلے ترتیب دیا گیا تھا اور جو بیعت کے بعد غمگین نے خود ہی مسترد کر دیا تھا۔

غمگین کا ذکر مجموعہ نغز، میں بھی ہے۔ اس کا یہ اقتباس دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

"غمگین تخلص ۔۔۔ جوانے نیک زندگانی، کشادہ پیشانی، خوش اختلاط، مستحکم ارتباط، یار باش، محبت تلاش، مخلص نواز، مخالف گداز، باعزّ و تمکین، شاگردِ سعادت یار خان رنگین است علیٰ قدرِ حال خطِ نسق (کذلک) می نویسد و کم کم فکرِ سخن می گزیند و با فرح و سرورِ ایامِ بے بدل جوانی بکام دل بسر می برد۔ ایں شعر از و منسوب است۔

گو سیہ بخت ہوں پر سرمۂ بینائی ہوں   جو کہ دیکھے ہے سو آنکھوں سے لگاتا ہے مجھے

ایں شعر سرقہء طالب کلیم است اما بزبان خود خوب گفتہ

مجالس رنگین میں غمگین کا ذکر دو جگہ آیا ہے۔ ایک جگہ انہوں نے غمگین کو اپنا شاگرد لکھا ہے اور اپنی وہ غزل دی ہے (مان کر۔ جان کر) جو انہوں نے جرأت کی زمین میں غمگین کی فرمائش پر فی البدیہہ کہی تھی۔ دوسرے موقع پر غمگین کے دس شعر نقل کیے ہیں جو انہوں نے ڈھاکے میں چند دوستوں کے سامنے ایک کشتی کی سواری کے دوران پڑھے تھے۔

غمگین نے بھی رنگین کی استادی کا اعتراف کیا ہے۔ قطعہ تاریخ میں لکھا ہے۔

جب استاد رنگین جہاں سے گئے   تو ایک یادگاری رہی ریختی

خرد نے کہا یہ ہی تاریخ ہے   کہ ساتھ ان کے غمگیں گئی ریختی

غمگین کا تذکرہ کریم الدین (تذکرہ کریم الدین) نساخ (سخنِ شعرا) شیفتہ (گلشن بے خار) اور عبدالحیٔ صفا (شمیم سخن) نے بھی کیا ہے لیکن کوئی نئی یا خاص بات نہیں کہی ہے۔۔۔ مولانا محمد حسین آزاد نے البتہ ان کا ذکر استادوں میں کیا ہے اور لکھا ہے کہ نواب الٰہی بخش خاں معروف نے بھی غمگین سے مشورہ سخن کیا تھا۔

حضرت غمگین کے دیوانِ غزلیات یعنی "مخزن الاسرار" کا نسخہ کتب خانہ غمگین اکادمی گوالیار میں موجود ہے اس سے چند اشعار انتخاب کیے جاتے ہیں۔

اس کے وعدے پر اعتبار کیا ہائے پھر شب کو انتظار کیا
پھر لگا وہ لگاوٹیں کرنے پھر مرے دل کو بے قرار کیا
ہے مجھے کس کی چاہ، مت پوچھو نہ کہونگا میں آہ مت پوچھو
کیا کہوں حسن اس صنم کا میں ہے خدا کی پناہ مت پوچھو

غمگین نے مخزن الاسرار میں جا بجا مرزا اسد اللہ خان غالب کے انتخابِ کلام کی تعریف کی ہے۔

بہت سی سیر دواوین ہم نے کی غمگین مگر اسد کے نہیں انتخاب سے نسبت
اسد کا انتخاب اپنی تسلی کو کیا پیدا جب آیا تنگ شعرِ شاعراں کی انتخابی سے

غمگین نے غالب کو "برادرِ دینی" لکھا ہے اور یہ کہ نظم ونثر میں ان کا اس زمانے میں ثانی نہیں غالب نے بھی غمگین کی تعریف پورے جوشِ عقیدت سے کی ہے اور ایک خط میں تو یہاں تک لکھا ہے کہ "یزداں با سپاس گزارم وبدیں ذوق خودراو یازم کہ مرا بہ گوشہء خاطر کسے جائے دادہ است کہ تا کام ودہن را بہ ہفتاد آب نہ شویم، نامش نہ تواں برد"۔

اسی خط میں ان کو "فروغِ کوکب سعادت" "بہارِ باغ افادت" "منبع فیوضِ نامتناہی" اور "واسطہء حصولِ رحمت الٰہی" لکھا ہے۔

غالب اور غمگین کے یہ غیر مطبوعہ فارسی خطوط غمگین اکادمی گوالیار میں محفوظ ہیں اور مجھے ان کی زیارت عالی جناب سردار سید غنی محمد شاہ صاحب قبلہ حسنی الحسینی والقادری المعروف بہ حضرت جی سجادہ نشین خانقاہ عالیہ اور ان کے فرزند رشید پیرزادہ ہاشمی میاں سید رضا محمد شاہ صاحب حضرت جی زاد لطفہ، فقیر منزل گوالیار کے لطف بے نہایت سے نصیب ہوئی۔ جس کے لیے بہ دل ممنون ہوں۔

غالب نے جو خطوط حضرت غمگین کی خدمت میں ارسال کیے تھے وہ اور ان کے جوابات جو حضرت نے تحریر فرمائے تھے ان کو حافظ ہدایت النبی قادری گوالیاری نے نقل کر کے ایک مجلّہ میں جمع کر لیا ہے جس میں ۹۴ صفحات ہیں۔ تختی ۹x۱۱ انچ ہے۔

افسوس ہے کہ اصل خطوط غالب اور غمگین کے ہاتھ کے لکھے ہوئے محفوظ نہیں ہیں لیکن ان کے اصل اور حقیقی ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ میں نے بعض خطوں کے خلاصے کر لیے ہیں بعض تمام وکمال نقل کر لیے ہیں اور بعض کی نقلیں جناب سید رضا محمد شاہ صاحب قادری نے کمال مہربانی سے عطا فرمائی ہیں۔

اس سلسلے کا پہلا خط غالب کا ہے۔۔۔ اس کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت جی نے غالب سے پوچھا تھا کہ میں دیوانِ رباعیات کے دیباچے میں آپ کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ آپ کو اعتراض تو نہیں۔ اس کے جواب میں غالب لکھتے ہیں کہ دیباچے میں میرا ذکر میرے لیے ہی نہیں میرے آبا کے لیے "سرمایہ نازش جاودانی" ہے۔ (پھر) معلوم ہوتا ہے کہ حضرت غمگین نے لکھا تھا کہ میرے دیوان رباعیات کو غیر کی نظروں سے پوشیدہ رکھیے گا۔ غالب لکھتے ہیں کہ یہاں غیر کون ہے اور ان حقائق و معارف کے سمجھنے والے کتنے ہیں اور جو سمجھتے ہیں وہ غیر نہیں۔"

توضیحات

"تقید" اور "اطلاق"، "عین" اور "غیر" یہ اصطلاحات تصوف کے انتہائی غامض و دقیق اور پہلو در پہلو مسائل و احوال سے متعلق ہیں۔ اس مختصر سے حاشیہ میں ان تصورات کی مکمل تشریح تو ممکن نہیں مگر جس حد تک اس خط کے مضمون کو سمجھنے کے لیے عرض کیا جا سکتا ہے وہ یہ ہے کہ مسئلہ وحدت الوجود تصوف کے انتہائی اہم اور نازک موضوعات میں سے ہے۔ یہ ایک فلسفیانہ نظریہ بھی ہے جس کی مختلف شکلیں دیگر مذاہب اور ملتوں میں بھی موجود رہی ہیں۔ اس کے علاوہ وحدت الوجود ایک روحانی شعور و کیفیت بھی ہے، ایک مخصوص مذہبی تجربہ بھی ہے جس سے متعدد فکری، روحانی اور اخلاقی رویے جنم لیتے ہیں یہ وہ نظریہ ہے جس کی مدد سے بہت سے لوگ راہِ خدا پا گئے

جب کہ اسی کی بدولت کچھ لوگ گمراہیوں میں بھی جا پڑے۔ بعض اوقات جو مطلب اس اصطلاح کا ایک عام آدمی سمجھ بیٹھتا ہے کہ اس کائنات میں جو کچھ ہے وہ خدا ہی کے وجود کا امتداد ہے اور خدا بعض مظاہر فطرت میں متمثل ہو کر سامنے آتا ہے اور انسان اور خدا کا تعلق سمندر اور لہروں کا سا ہے، یہ بات تو ظاہر ہے کہ توحید کی اسلامی تعلیم کے منافی ہے اور Pantheism کی راہ ہموار کرتی ہے جو کہ ایک کفرِ صریح ہے۔ لیکن اگر اسلامی عقائد کے محکمات کے دائرے میں رہ کر اس نظریہ کی وضاحت کی جائے تو کچھ اس طرح کی جا سکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی کی مرضی کائنات میں کارفرما ہے اور یہ عالم شہود اسی کی صفات کا ظہور ہے۔ اللہ کا ارادہ ہر ایک حادثہ اور حادث پر حاوی اور غالب ہے، اس کی مرضی اور علم کے بغیر پتا بھی نہیں ہل سکتا۔ جس صوفی پر شعور غالب آ کر اس کے خیالات میں راہ پا جائے وہ کائنات کو ایک خاص نظر سے دیکھنے لگتا ہے، اس کو وجود حقیقی صرف اللہ کا معلوم ہوتا ہے باقی ہر ایک کا وجود اعتباری، اضافی، فانی اور ناقص نظر آتا ہے جیسا کہ وہ حقیقتاً ہے بھی، اس تشریح کے بعد تقید و اطلاق، عین اور غیر جیسی اصطلاحات کا مفہوم کسی قدر سمجھ میں آ سکتا ہے۔ جب کسی وجود یا موجود کی نسبت مخلوق کی طرف کی جائے تو اس کو مقید اور غیر کہا جاتا ہے اور جب موجود حقیقی، جو کامل اور مطلق، ازلی و ابدی ہے اس کی جانب اشارہ مقصود ہو تو اطلاق اور عینیت کے الفاظ سے کام لیا جاتا ہے۔ کبھی کبھی عینیت سے مراد اپنی ذات کو خدا کی ہستی میں گم کر دینے کی ہوتی ہے۔ بایں معنی کہ انسان فانی ہو کر اپنے آپ کو اس ذاتِ باقی کے سپرد کر دے اور اپنی ہستی کو کلیتہً مٹا دے۔ سید علی غمگین کہنا یہ چاہتے ہیں کہ وہی سب کچھ ہے کیوں کہ حقیقی وجود اسی کا ہے باقی جو کچھ عالمِ امکان میں دکھائی دیتا ہے وہ محض ایک لمحۂ عارض ہے اور آنی جانی شے ہے۔ مقید اور غیر سب کے سب اعتباری اشیاء اور اضافی امور سے تعلق رکھتے ہیں تو غیر کا ہونا نہ ہونا برابر ہوا۔ اس لیے کہ اس ذات یکتا کے علاوہ جو کوئی بھی موجود ہے وہ قیود زمان و مکان میں مقید اور حدوث و امکان کی حدود میں محبوس ہے۔ بقول غالب ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے۔ اس سارے نظریہ کے پہلو اور پرت بے شمار ہیں۔ اسلامی نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو اس تصور میں کچھ اخلاقی

سبق بھی پنہاں ہیں مثلاً یہ کہ ''اللہ تعالیٰ کی ہستی پر توجہ مرکوز رکھو، اپنے آپ کو اس کے سامنے ہیچ گردانو! اپنی خواہشات کو اس کے ارادہ کے سامنے فنا کردو اور اس حد تک کرو کہ اس کی اطاعت ہی تمہاری خواہش بن جائے کہ یہی تقویٰ کا دوسرا نام ہے، وغیرہ وغیرہ، تصوف میں یہ تعلیم اس لیے دی جاتی ہے کہ بہت سے باطنی امراض اور اخلاقی خرابیاں خود پسندی، خود پرستی مرکزیت ذات (Self-referentiality) ہی سے جنم لیتی ہیں اس کے علاوہ اپنی ہستی کو فنا کر کے ہی قربِ الٰہی اور معرفت ربانی کی مستی حاصل ہو سکتی ہے۔

سیّد انتخاب علی کمال

عرشی امرتسری و علامہ اقبال کے مباحث اور عرشی کی تاریخ گوئی

سہ ماہی 'الاقرباء' کے جولائی/ستمبر ۲۰۱۰ عیسوی کے شمارے میں بہ ذیل ''یادرفتگاں'' رکن مجلسِ مشاورت پروفیسر ڈاکٹر معزالدین صاحب، سابق پروفیسر اردو ڈھاکہ یونیورسٹی نیز مسند نشین (اقبال چیئر) کیمبرج یونیورسٹی کا تحریر کردہ مضمون 'مولانا عرشی امرتسری' نظر افروز ہوا۔ پروفیسر صاحب نے اپنی یادداشتیں قلم بند کر کے حضرتِ عرشی کو خراجِ عقیدت پیش کیا۔ راقم الحروف پروفیسر صاحب سے متاثر ہو کر زیرِ نظر مقالہ الاقرباء کے قارئین کی نذر کر رہا ہے:

بقول محترم سید محمد عبداللہ قادری ابن سید نور محمد قادری ماہرِ اقبالیات، ماہنامہ فیض الاسلام اپریل ۱۹۷۱ء میں ''عرشی کو صدمہ'' کے عنوان سے یہ عبارت شائع ہوئی۔ ''حضرت علامہ محمد حسین عرشی کے والد میاں دین محمد امرتسری تقریباً سوا سو سال کی عمر میں رحلت فرما گئے۔''

(ماخوذ ماہنامہ کنزالایمان۔ لاہور۔ جنوری ۲۰۰۱ عیسوی)

مولانا محمد حسین عرشی کے والدِ گرامی کی تاریخ رحلت کسی نے کہی جو غالباً لاہور میں مدفون ہوں گے۔ ''آہ شب ہائے دین محمد امرتسری'' (۱۳۹۱ء) ۱۹۷۱ء مطابق ۱۳۹۱ھ

مؤلف ''تذکرہ دُرفشاں'' نے عرشی امرتسری کے بارے میں لکھا ہے:

''مولوی محمد حسین (ابن ـــــ) (موصوف نے ولدیت کی جگہ خالی چھوڑ کر نقطے لگائے ہیں) ساکن امرت سر، وہیں ۱۸۹۶ عیسوی مطابق ۱۳۱۴ ہجری پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد حکیم فیروزالدین، فیروز طغرائی امرتسری[1] سے علمِ عروض اور فارسی کی تکمیل کی۔ ''شرح مائۃ عامل''

---

[1] حکیم فیروزالدین، طغرائی امرتسری (ولادت ۱۸۸۶ء وفات ۱۹۳۱ء فرخ امرتسری نے تاریخ وفات کہی ''ہائے دردِ وفات طغرائی''۔ صوفی غلام مصطفےٰ تبسم اور عرشی امرتسری آپ کے شاگرد تھے۔ آپ کا کلام ''کلیاتِ طغرائی'' کے نام سے چھپ چکا ہے۔
۳۱ عیسوی ۱۹

''کافیہ''۔ ''ابتدائی منطق''۔ ''موجز القانون'' اور ''نفیسی'' وغیرہ کے کچھ حصے پڑھے۔ پھر قرآن کا ترجمہ پڑھا۔ دورانِ مطالعۂ قرآن جو مشکلات پیش آتیں، وہ خواجہ احمد الدین امرتسری سے حل کرتے رہتے تھے۔ عربی کی بلند پایہ کتب پڑھنے کا شوق ہوا۔ تو علامہ طغرائی کے ایماء پر مولوی محمد عالم آسی امرتسری[۲] ابن مولوی عبدالحمید (ولادت ۱۲۹۸ ہجری وفات ۱۳۶۳ ہجری) کے خرمنِ فیض سے خوشہ چینی کی''۔ ''آپ کو شعر گوئی سے بھی دلچسپی ہوئی۔ اردو، فارسی اور عربی میں شعر کہنے لگے۔ حتیٰ کہ آپ کا شمار بلند پایہ شعراء میں ہونے لگا۔ عرشی اور علامہ اقبال میں گہرے مراسم تھے۔ ایک زمانے میں اقبال سے بذریعہ نظم خطاب کیا۔ یہ نظم زمیندار اخبار میں چھپی تھی۔ اقبال کا جواب ''خطابِ اقبال بہ عرشی'' کے عنوان سے ۲۲ مئی ۱۹۲۰ء کے زمیندار اخبار میں شائع ہوا'' (از مکتوبِ عرشی بنام مہر تقوی بے پوری مولف تذکرۂ درفشاں صفحہ ۱۱۹۱)

راقم الحروف نے قارئینِ الاقرباء کی دلچسپی کے لیے غالب لائبریری کے روح ورواں محترم جناب حاجی نسیم احمد صاحب کے تعاون سے ''باقیات اقبال'' (مرتبہ سید عبدالواحد معینی۔ مطبوعہ آئینۂ ادب۔ چوک مینار۔ انارکلی۔ لاہور) حاصل کی ''پیامِ عرشی امرت سری بنام اقبال'' نذرِ قارئین ہے۔

''پیام عرشی امرتسریؒ بنام اقبالؒ''

اے ترنّم ہائے رنگینت گلستانِ سخن   معنیٔ عیسیٰ دمت بخشندۂ جانِ سخن

اے حیات تازہ دادی نغمہ را از نطقِ خویش   کشتۂ شور افگن ارض و سما از نطقِ خویش

از عروسِ طبع برما جلوہ ہا پاشیدۂ   وزچمن زار تکلّم تازہ گلہا چیدۂ

شعلہ سوز اندوز از آتش نوائی ہائے تو   بادہ کیف آموز از تخیلِ ذوق افزائے تو

۲۔ مولوی محمد عالم آسی امرتسری۔ عربی صرف ونحو کے امام ومجتہد تھے۔ پیر غلام دستگیر نامی لاہوری نے تاریخ وفات کہی: بگو تاریخ نامی بے سر آز ''محمد عالم آسی کان حافظ'' بعض تذکرہ نگاروں نے آسی کی
۱۳۶۴ - ۱ = ۱۳۶۳ھ
وفات ۱۳۶۴ھ لکھی ہے۔ جو غلط ہے۔

برفراز طارمِ اعلیٰ لوا افراختی — نزدِ خود را درقمار جمع مادر باختی
یافت از تو مرکزے ہنگامۂ بیتاب را — ریختی تخمِ سکوں درمزرعۂ سیماب را
لیکن اے اقبال ایں رنگیں نوائی تا بکے — ازنفسِ گرمی واز دل شعلہ زائی تا بکے
خیزوگلبا نگِ دہل در گنبدِ خضرا فگن — از قبور آیند خلقے شور صور آسا فگن
خیز وصورت خودبہ آہنگ رجز تبدیل کن — قطرۂ داری بیاور درشرر تحلیل کن
خیز زیں گنج متانت جلوۂ بر ما فگن — ہاں بیا ہمچوں شاٸی گوئے درمیداں فگن

(از "باقیاتِ اقبال" صفحہ ۲۴۷/۲۴۸)

ہر چند کہ ہم عرشی کے لیے مقالہ سُپر دِقلم کر رہے ہیں کیا علامہ اقبال جیسے عظیم المرتبہ شاعر کا جواب قارئین کے لیے دلچسپی کا باعث نہ ہوگا؟ لہٰذا راقم الحروف علامہ اقبالؒ کے اشعار جوانھوں نے عرشی کو جواباً تحریر کیے تھے وہ بھی پیش کر رہا ہے۔ جو "خطابِ اقبال بہ عرشی" کے عنوان سے ۲ مئی ۱۹۲۰ عیسوی کو زمیندار اخبار میں شائع ہوا۔

علامہ اقبالؒ کا جواب

دانی کہ چیست شیوۂ مردانِ پختہ کار — عرشی گماں مدار کہ پیمانہ ام شکست
دارم ہنوز از کرمِ ساقیٔ حجاز — آہے درونہ تاب کہ خیزز زسینہ مست
از شاخسار فطرتِ من می دمد ہنوز — آں لالۂ کہ موجِ نسیمے دلش نہ خست
لیکن شنیدۂ کہ دمِ گردشِ شراب — پیرِ عجم چہ گفت برندانِ مے پرست
دانا کہ دید شعبدۂ چرخ حقہ باز — ہنگامہ باز چید ودرِ گفتگو بہ بست

(زوالِ آلِ عثمان)۔ (باقیاتِ اقبال" صفحہ ۲۴۹)

عرشیؒ واقبالؒ کی اس قیل وقال پر مولانا ظفر علی خاں کا محاکمہ بھی منظرِ عام پر آیا۔ چند اشعار ضمناً پیش ہیں:

مولانا ظفر علی خاں کا محاکمہ

بندہ نواز ہم سے نہیں کچھ چُھپی ہوئی
پیرِ فلک کی شعبدہ بازی کی یُو دوہست

مانا کہ آسمان سے شمس و قمر کی فوج
پیہم اُتر رہی ہے کہ ظلمت کو دے شکست

لیکن نہ قولِ سعدیٔ شیراز بھولئے
چھوٹا نہیں جو ہاتھ سے سررشتۂ الست

''رفتن بپائے مردیٔ ہمسایہ در بہشت
حقا کہ باعقوبتِ دوزخ برابر است'' ☆

(از ''باقیاتِ اقبال'' صفحہ ۲۴۹)

عرشی، اقبال اور ظفر علی خاں کے مباحثے کو نذرِ قارئین کرنے کے بعد راقم الحروف دوبارہ عرشی کے حالات کی طرف آتا ہے۔ عرشی امرتسر میں ماہنامہ 'البیان' کے مدیر رہے۔ تقسیم برِصغیر کے بعد لاہور چلے آئے۔ لاہور میں رہتے ہوئے۔ ماہنامہ ''فیض الاسلام'' راولپنڈی کو ایڈٹ کیا کرتے تھے۔ آپ کے علمی وادبی مضامین ملک کے بلند پایہ اخبارات ورسائل میں شائع ہوتے رہے۔ فارسی کلام اکثر ماہنامہ ''ہلال'' کراچی اور ''سروش'' کراچی میں طبع ہوا۔ آپ کی اولاد میں صرف ایک صاحبزادی ہیں۔ اولادِ نرینہ کوئی نہیں۔ (خودنوشتہ حالات برائے تذکرۂ دُرفشاں)

''آپ کو فنِ تاریخ گوئی میں کماحقہ، مہارت تھی۔'' (مہر) ''مگر بیش تر قطعاتِ تاریخ محفوظ نہیں رکھے جا سکے بمشکل تمام مختلف دستیاب رسائل و کتب میں شائع شدہ قطعاتِ تاریخ آپ کو ارسال کر رہا ہوں۔'' (عرشی بنام مہر) (۱۲ اپریل ۱۹۶۲ء) مندرجہ ذیل درنمونہ قطعاتِ تاریخ پیش ہیں تا کہ عرشی امرتسری کا فنِ تاریخ گوئی بھی منظرِ عام پر آسکے:۔

☆ سعدیؒ کے اس شعر میں مصرعہ اول و مصرعہ ثانی کے مقام کی باہمی تبدیلی مولانا ظفر علی خاں مرحوم نے اشعار میں صرف ضرورتِ قافیہ کے تحت فرمائی ہے (ادارہ)

۱۔ ۱۳۵۶ ہجری مطابق ۱۹۳۷ عیسوی میں مولوی محمد دین غریب[1] کے انتقال پر عرشی نے قطعۂ

تاریخ کہا:۔

روح پاکے گزشت ازیں عالم   کز تقدس رسید بر معراج
سادگی بود زینتِ خلقش   برسرش داشت زیں فضیلت تاج
سالِ ترحیل ، مُلہم ملکوت   گفت ۔ ''وائے غریب و سادہ مزاج''
۱۳ ہجری ۵۶

(ماہنامہ ''بلاغ'' ۔ امرتسر)

۱۹۵۲ عیسوی مطابق ۱۳۷۱ ہجری میں فخر الاطبا حکیم فقیر چشتی نظامی امرت سری (مدفون بجوارِ حضرت میاں میر ۔ لاہور) کی وفات پر عرشی نے یہ تاریخ کہی:

(الف) چُوں فقیر محمّد ، فقیر خُدا   آں حق اندیش وحق گو وہم حق شنو
رَخت بربست ازیں کار گاہِ فنا   جانبِ ملک جاوید شُد راہ رو
جُستمش سالِ رحلت ز روح الامیں   گفت ''ثُمَّ نُنَجِّي الَّذِينَ اتَّقَوا''
۱۹ عیسوی ۵۲

دیگر

(ب) حاذقِ عصر ، آگہِ فقراں فقیر   کرد سوئے دارِ عقبٰی ارتحال
بود ذاتش چشمۂ فیض و عطا   ''فاتَ فیض'' آمد بہ دل از بہر سال
۱۳۷۱ ہجری

۱۹۵۶ء میں عرشی نے زُبیدہ بیگم کی وفات پر تاریخ لکھی ۔ جس کے قطعات میں سے صرف

ا؎ مولوی محمد دین غریب کا انتقال ہوا تو محمد عالم (ابن مولوی عبدالحمید) آسی امرت سری نے بھی قطعۂ تاریخ لکھا ۔ جس کا آخری شعر یہ ہے:۔

از یوم الجمعہ سوئی رحلۂ   قال آسی ، ''فَازَ بالجدوئی غریب''
۱۳ ہجری ۵۶

اشاریہ: محمد عالم آسی امرتسری، عرشی کے استادِ محترم تھے ۔ آسی امرتسری کی (ولادت ۱۲۹۸ھ ۔ وفات ۱۳۶۳ھ) ہے

مادّہ تاریخ نذرِ قارئین کررہا ہوں۔ تاکہ غیر ضروری طوالت سے بچا جاسکے:

مغفور زُبیدہ بیگم گنج تمیز
۵۶ عیسوی ۱۹

۱۹۵۹عیسوی میں خواجہ عباد اللہ اختر امرتسری (مدفون جہلم۔ پنجاب) کی تاریخ اِنتقال عرشی نے یہ لکھی:

عباد اللہ اختر جب ہوئے فوت — پکارا دوستوں نے آہ اختر
زبانِ غیب نے تاریخِ رحلت — کہی ''خواجہ عباد اللہ اختر''
۵۹ عیسوی ۱۹

(پُورے نام سے بغیر کسی لفظ کے اضافے کے تاریخِ وفات حاصل ہو جانا اور حاصل کر لینا اتفاق اور تاریخ گو شاعر کی رَسائیِ فکر کی نہایت عُمدہ اور قابلِ تحسین دلیل ہے۔ سُبحان اللہ۔)

۱۳۸۱ ہجری/۱۹۶۱ عیسوی میں پیر غلام دستگیر (ابنِ پیر حامد شاہ) نامی لاہوری کی وفات پر عرشی امرتسری نے دو قطعات کہے

(الف) وہ نامی بزرگِ گرامی صفات — جہاں چھوڑ کر جا بسا خُلد میں
سُنا میں نے رضواں سے سالِ صُعود — کہا اُس نے ''داخل ہوا خُلد میں''
۸۱ ہجری ۱۳

دیگر

بھری بزم سے سُوئے دارِ بقا — بڑا محترم شخص رُخصت ہوا
جو ہاتف سے پُوچھا گیا سالِ فوت — تو۔ ''ہو داخلِ خُلد نامی'' کہا
۸۱ ہجری ۱۳

عرشی امرتسری کا ۱۹۸۵عیسوی مطابق ۱۴۰۶ ہجری میں لاہور میں انتقال ہوا۔ کسی شاعر نے ''مقبولِ ایزد عرشی امرتسری مرحوم'' تاریخ وفات کہی۔
۸۵ عیسوی ۱۹

پروفیسر پروین صادق۔ (متحدہ عرب امارات)

ثقافت اور مسلمانوں کا ثقافتی ورثہ

ثقافت لفظ ''ثقف'' سے نکلا ہے جس کے معنی ''ہنر یا سیکھنے'' کے ہیں انگریزی میں اس کا مترادف ''کلچر'' ہے جس کے معنی ''ہل چلانا'' یا ''کھیتی باڑی'' کے ہیں۔ اصطلاحاً ''انسانوں کے طریق زندگی'' یا اس کل مجموعے یا طرز حیات کو کہا جاتا ہے۔ جو انسان غیر جبلی طور پر یعنی سیکھ کر انجام دیتا ہے''۔ گویا ثقافت ایک ایسی جامع اصطلاح ہے جس میں طرز معاشرت یا طریق زندگی کے تمام نمونے آجاتے ہیں۔ لیکن ان میں وہ کام شامل نہیں جو جبلی طور پر انجام پاتے ہوں مثلاً بھوک جبلی شے ہے اس لیے یہ ثقافت میں شامل نہیں۔ مگر اسے مٹانے کے لیے جو طریقے استعمال کیئے جائیں انہیں ثقافت میں شامل کیا جائے گا۔ ای۔ جی۔ ٹیلر کے نزدیک: [۱]

''ثقافت اس کل مجموعے یا ضابطے کا نام ہے جس میں مذہب عقائد، علوم وفنون، اخلاقیات، عادات، رسوم اور وہ تمام رجحانات وامور شامل ہیں جو انسان اکتساب کے بعد انجام دیتا ہے۔''

فیض احمد فیض لکھتے ہیں:

''ثقافت کا لفظ تیس برس پہلے ہم تک نہیں پہنچا تھا کیونکہ یہ ایجاد ہی پچھلے بیس پچیس برس کی ہے میں ثقافت کی بجائے پرانا لفظ ''تہذیب'' استعمال کروں گا۔ جس سے ہم سب مانوس ہیں۔ تہذیب سے میری مراد وہی مفہوم ہے جو لفظ کلچر کا ہے۔ اردو میں کلچر کا ہم معنی لفظ موجود نہ ہونے پر ہمیں حیران نہیں ہونا چاہیے اس لیے کہ آج سے دوسو برس پہلے خود انگریزی میں بھی یہ لفظ موجود نہ تھا۔'' [۲]

ثقافت کو فارسی میں ''فرہنگ'' کہتے ہیں جو کہ دواجزاء پر مشتمل ہے۔ ''فر'' اور ''ہنگ''۔ ''فر''

۱۔ E.G. Tailor, our Culture, Oxford Printing Press, 1958, Pg.59

۲۔ فیض احمد فیض، پاکستانی کلچر اور قومی تشخص کی تلاش، فیروز سنز لاہور، ۱۹۸۸ء ص ۱۵

کے معنی ہیں آگے یا اوپر۔ اسم سے پہلے اس کا استعمال چمک دمک اور عظمت اور شکوہ کے معنی دیتا ہے "ہنگ" جو اوستائی زبان کا لفظ تھنگا (Thanga) سے مشتق ہے کھینچنے، لے جانے، وزن اور بوجھ کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ لہٰذا ان دونوں الفاظ کے مرکب (فرہنگ) کا لغوی مفہوم "اوپر لے جانا" یا "باہر نکالنا" ہے قابوس نامہ جس کا تعلق پانچویں صدی کے ادب سے ہے۔ اس میں فرہنگ کے لفظ کو ہنر سکھانے، تعلیم دینے اور بروئے کار لانے کا ہم معنی قرار دیا ہے۔ مہدی قلالی رکنی لکھتے ہیں:

"ایک وسیع مفہوم میں عقائد و معارف، اعلیٰ اقدار، آداب و رسوم، فن و ادب، قانونی، عسکری، سیاسی، اقتصادی اور معاشرتی قواعد و ضوابط، تفریحی امور اور معاشرے کے ان تمام وسائل و ذرائع کے مجموعے کو جن کے ذریعے انسان اپنی ارتقائی منازل طے کرتا ہے اور جنہیں وہ اپنے بعد آنے والی نسلوں کے لیے بطور میراث چھوڑ کر جاتا ہے "ثقافت" سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔" [۳]

درحقیقت 'ثقافت' معاشرے کی پیداوار نہیں بلکہ ثقافت معاشرے کو بناتی اور سنوارتی ہے نیز اس کے حال اور مستقبل پر بھی نظر رکھتی ہے۔ جو کچھ بھی ماضی میں وقوع پذیر ہوا۔ وہ تہذیب کے زمرے میں آتا ہے۔ جبکہ جو کچھ کل آنے والی نسلوں کو سنوارنے اور بنانے کی راہ ہموار کرے اس کا شمار "ثقافت" کے زمرے میں ہوگا۔ لہٰذا یہ کہنا بھی بجا ہوگا کہ جو کچھ ہم بناتے یا ایجاد کرتے ہیں، وہی "تہذیب و ثقافت" ہے

ڈاکٹر جمیل جالبی کلچر یا تہذیب و ثقافت کی تعریف ان الفاظ میں کرتے ہیں:

"کلچر اس ذہنی، مادی، خارجی طرز عمل کے اظہار کا نام ہے جو باضابطگی کے ساتھ معاشرے کے افراد میں یکساں طور پر پایا جاتا ہے۔ طرز عمل کی یہی باضابطگی کسی معاشرے کے کلچر کو ظاہر کرتی ہے اور یہی وہ چیز ہے جو ایک معاشرے کو دوسرے معاشرے سے ممیز کرتی ہے۔۔۔ طرز عمل کی یہ باضابطگی قومی سطح پر جس معاشرے میں جتنی زیادہ ہوگی، تہذیبی اعتبار سے وہ معاشرہ اسی قدر متحد ہوگا۔" [۴]

۳۔ Mahdi Qlali Rukni, our Cultural Heritage, Prestan Univerisity, press, 1993 Pg.17

۴۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، پاکستانی کلچر، نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۱۹۹۷ء ص ۳۶

ہم مجموعی طور پر جب ثقافت کا لفظ استعمال کرتے ہیں تو اس سے مراد ثقافت یا تہذیب ہی لیتے ہیں۔ ثقافت کی پانچ اقسام ہیں:

۱۔ حسی تمدن یا ثقافت

اس کے حامی جسیاتی علم کو ثقافت کی بنیاد قرار دیتے ہیں

۲۔ عقلی یا منطقی تمدن یا ثقافت:

اس کے حامی عقلی استدلال یا منطقی توجہ کو ثقافت و تمدن کی بنیاد قرار دیتے ہیں۔

۳۔ تجربی ثقافت یا تمدن:

اس کے حامی محض ان عوامل کو تہذیب و تمدن کی بنیاد سمجھتے ہیں جو تجربے میں آ کر صحیح ثابت ہوں۔

۴۔ اشراقی تمدن یا ثقافت:

اس کے حامی وجدان، کشف اور رہبانیت کو معاشرتی ثقافت کی بنیاد سمجھتے ہیں۔

۵۔ الہامی تمدن:

اس کے حامی الہامی، وحی اور پیغمبرانہ تعلیمات کو ثقافت اور تہذیب کی بنیاد قرار دیتے ہیں۔

تمدن بھی تہذیب کی ایک شاخ ہے۔ یہ لفظ مدینہ سے نکلا ہے جس کے معنی شہر کے ہیں۔ تمدن کو شہر کے حوالے سے پہچاننا ضروری ہے۔ کیونکہ تمدن شہروں کے بغیر وجود میں نہیں آتا۔ اس لیے تمدن شہری طرز معاشرت و معیشت کا نام ہے۔ عموماً تہذیب کے لفظ کو تمدن کی جگہ پر استعمال کیا جاتا رہا ہے۔ جب ہم ہڑپہ یا قدیم روما کی تہذیب کا ذکر کرتے ہیں۔ تمدن عارضی اور مقامی ہوتا ہے۔ ہر قوم اور علاقے کے ساتھ اس کا تمدن نشو و نما پاتا اور بالآخر اس کے ساتھ ہی مٹ جاتا ہے۔ علم انسانیات کی تاریخ میں ''لوئی'' کا یہ نظریہ قابلِ قدر اہمیت کا حامل ہے۔

'ثقافت'' عقائد، آداب و رسوم، رویوں، فنون، خوراک کے طریقوں اور آخر کار اس

مجموعے کا نام ہے جو فرد اپنے معاشرے سے حاصل کرتا ہے۔ یعنی ایک ایسا مجموعہ جو اس کی انفرادی سرگرمیوں اور ایجادات کا نتیجہ نہیں ہوتا بلکہ وہ اس کے اسلاف کا ورثہ ہوتا ہے جو براہ راست یا بالواسطہ سیکھنے کے بعد اس تک منتقل ہوتا ہے۔'' ۵

ہمارا ثقافتی ورثہ:

انسانی تاریخ کی ابتداء سے ہی دو ثقافتیں ایک دوسرے کے ساتھ برسر پیکار رہی ہیں اور یہ مقابلہ ابد تک جاری رہے گا۔ وہ ثقافتیں درج ذیل ہیں۔

۱۔ شرک کی ثقافت (غیر توحیدی ثقافت)

شرک کی ثقافت یا ثقافتِ شرک ایسی ثقافت ہے جس کی بنیاد تقابلی جائزہ پر ہے۔ جس کا سرچشمہ حضرت آدمؑ کے سامنے ابلیس کا سجدہ نہ کرنے والے شیطانی نظریے سے پھوٹتا ہے۔ اس تقابل کی بنیاد طاقت وتشدد پر رکھی جاتی ہے۔ اس ثقافت کی بنیاد اپنی بڑائی اور برتری کی جستجو ہے۔

۲۔ توحیدی ثقافت یا توحید کی ثقافت:

توحید کی ثقافت میں ''لا الہ الا اللہ بنیادی نظریہ ہے اور اس کے تمام مفاہیم، انا للہ وانا الیہ راجعون میں پوشیدہ ہیں۔ اس نظریے کے تحت ثقافت کا ڈھانچہ توحیدی بنیادوں پر استوار ہوتا ہے جس پر گامزن ہو کر انسان خدا تک پہنچ جاتا ہے توحیدی ثقافت میں انسانی قدر و قیمت کا اندازہ کچھ اس طرح لگایا جاتا ہے کہ انسان خداوند تعالی سے کس حد تک قریب ہو گیا ہے لیکن ثقافتِ شرک اس کے بالکل برعکس ہے۔ اس لئے کہ ثقافت شرک کے ذریعے شرک کی طرف پیش قدمی کی جاتی ہے تا کہ طاقت، مال اور منصب حاصل کر لیا جائے اور اس میں دوسرے لوگوں پر کنٹرول اور تسلط زیر نظر ہوتا ہے۔

۵۔ Mehdi Qlali Rokni,our Cultural Haritage,Preston University Press, 1993 pg.20

ہمارا ثقافی ورثہ اسلامی ہے۔ ''تشکیل انسانیت'' میں رابرٹ بریفالٹ لکھتا ہے۔ ''یہ صرف سائنس ہی نہیں جس سے یورپ کے اندر زندگی کی ایک نئی لہر دوڑ گئی بلکہ اسلامی ''تہذیب و تمدن کے اور بھی متعدد گوناگوں اثرات ہیں۔ جن سے یورپ میں پہلے زندگی نے آب و تاب حاصل کی۔ پھر اگرچہ مغربی تہذیب کا کوئی پہلو نہیں جس سے اسلامی تہذیب وثقافت کے فیصلہ کن اثرات کا پتہ نہ چلے۔ لیکن اس کا سب سے بڑا اور روشن ثبوت اس طاقت کے ظہور سے ملتا ہے جو عصر حاضر کی مستقل اور نمایاں ترین قوت اور اس کے غلبے اور کارفرمائی کا سب بڑا سرچشمہ ہے۔'' [۶]

بریفالٹ کی طرح دیگر متشرقین کو بھی اس امر کا بخوبی یقین ہے کہ اگر کوئی تہذیب یا ثقافت مغربی تہذیب وتمدن کو پچھاڑ سکتی ہے تو وہ صرف اسلامی ثقافت ہے۔ جو علم و اخلاق سے آراستہ اور عشق جیسی توانائی سے مسلح ہے۔ مصر و بابل کا تمدن ختم ہو گیا۔ ان کی تہذیب اجڑ گئی اور ثقافت برباد ہو گئی۔ چین کی ثقافت عصر رواں کا ساتھ نہیں دے سکتی۔ ہندو تہذیب وتمدن ادہام اور خرافات کا مجموعہ ہے اور یورپی تہذیب میکاولی کی ابلیسی سیاست پر مبنی ہے۔

اسلامی ثقافت کا آغاز داعی اسلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت کے ساتھ ہوتا ہے۔ تقویٰ اسلام کا واحد معیار ہے۔ جو زندگی اس کے طرز اور مظاہر کو پرکھتا ہے اس لیے اسلامی ثقافت یا دنیا کے مختلف مظاہر کو اسی معیار پر پرکھنا ضروری ہوگا۔ مثلاً خدا کی خوشنودی اور اقرار توحید ''لا الہٰ الا اللہ'' وہ بنیادی کلمہ ہے، جس پر اسلامی ثقافت، تہذیب اور تمدّن کی عمارت استوار ہوئی ہے۔ جس کا سب سے پہلا اخلاقی مظہر 'السلام علیکم'' ہے۔

یہ وہ دور تھا جب یورپ وحشت، بربریت اور جہالت میں ڈوبا ہوا تھا۔ اور ایشیا و افریقہ کی ثقافت وتمدن کا شائبہ تک نہ تھا۔ یورپ کا تمدن بھی غیر مہذب اور ثقافت بھی غیر مہذب تھی۔ اس وقت اسلام کی روشنی عرب سے نکلی جس کی تہذیب نے پوری دنیا کو راہِ ہدایت دکھائی۔ اسلام وہ

۶۔ عطش درانی، اسلامی فکر وثقافت، مکتبۂ عالیہ، لاہور، ۱۹۸۸ء ص ۷۴

پہلا دین ہے جس نے مذہب کی صحیح حدود متعین کیں۔ اسے ذاتی ذوق سے نکال کر اجتماعی مقام عطا کیا، فلسفے کو ایک نیا موڑ بخشا۔ عطش درانی لکھتے ہیں:

"اگرچہ تکنیکی علوم میں مسلمانوں نے جدید یورپ کی سی ترقی نہیں کی۔ لیکن بغداد اور اندلس کے مراکز علوم وفنون کی بیشتر مثالیں تکنیکی علوم میں مسلمانوں کے ذوق وشوق کا اظہار کرتی ہیں۔ اسلام نے مسلمانوں کے طریق زندگی میں اس حد تک تبدیلی پیدا کر دی کہ آج بھی مختلف مقامی ثقافتوں کے باوجود مجموعی طور پر اسلامی ثقافت ایک ہے۔" ۷

بقول ٹی ایس۔ ایلیٹ:

"کسی قوم کی ثقافت بنیادی طور پر اس کے مذہب کی تجسیم ہوتی ہے اس لیے اسلامی ثقافت کے تمام سرچشمے قرآن وحدیث سے پھوٹتے ہیں۔ کتاب وسنت کے مطابق صحیح اسلامی زندگی ہی اسلامی ثقافت کا امتیازی نشان ہے اور اسلامی ثقافت کی روح وہ قومی روایات ہیں جو عہد رسالت صلی اللہ علیہ وسلم اور عہد خلفائے راشدین، عہد صحابہ کرام عہد تبع تابعین کی یادگار رہیں۔ اسلام چونکہ ایک عالمگیر مذہب ہے اور پورا عالم اس کے وطن کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس لیے دوسری قوموں کی ثقافت کی طرح اسلامی ثقافت نہ ملکی آب وہوا سے متاثر ہوتی ہے نہ وہ جغرافیائی حدود کے اندر محدود ہوتی ہے۔" ۸

دین اسلام ایک منفرد ثقافت ہے۔ یہ ثقافت کیونکہ ایک جداگانہ حیثیت کی حامل ہوتی ہے اور اس سے مسلمانوں کی مختلف تہذیبوں اور تمدنوں نے کیوں جنم لیا؟ اس کی تشریح درج ذیل عنوانات کے تحت کی جاتی ہے۔

اسلام کا تصور زندگی:

اسلام کا تصور زندگی دیگر اقوام ومذاہب سے جدا اور افراط وتفریط میں میانہ رو ہے۔ اسلام

۷۔ عطش درانی، اسلامی فکر وثقافت، مکتبہ عالیہ، لاہور ۱۹۸۸ء ص ۷۵

۸۔ منشی عبدالرحمان، اسلامی تہذیب وثقافت، شاخ زریں گلبرگ لاہور، ۱۹۸۶ء، ص ۳۷

ہے نے نہ تو انسان کو غیر ذمہ دار اور متکبر ہونے کی اجازت دی ہے اور نہ مجبور و بے کس مخلوق ٹھہرایا ہے۔ انسان زمین پر اللہ کا خلیفہ اور نائب ہے۔ کائنات اور اس کی تمام اشیاء کا حقیقی مالک اللہ ہے۔ انسان کو اس کا تصرف حاصل ہے مگر اس تصرف کے سلسلے میں وہ اللہ کے آگے جوابدہ ہے اس لیے ضروری ہے کہ انسان کائنات اور اس کی اشیاء کا استعمال اللہ کی بتائی ہوئی حدود میں رہتے ہوئے کرے۔ اس ذمہ داری میں ہر شخص فرداً فرداً اللہ کے آگے جوابدہ ہے۔ ضروری ہے کہ اس دنیا کو صرف برتنے کی شے سمجھے۔ حلال چیزیں خود پر حرام کرنے اور حرام کو حلال کرنے والے اللہ کے باغی ہیں۔ جن کا حساب آخرت میں ہوگا۔

زندگی کا نصب العین

جب زندگی کا مقصد اللہ تعالیٰ کی خوشنودی ٹھہرے تو انسان کا ہر ثقافتی فعل، خیال ارادہ، زندگی موت، کھانا، پینا، اٹھنا بیٹھنا، رہنا سہنا، معاملات معاشرت، دوستی دشمنی، معیشت و معاشرت محض اللہ کے لیے ہوتا ہے۔ گویا اسلامی ثقافت کی دوسری بنیاد خالص اللہ کے لیے ہونا ہے۔ یہ چیز اسلامی ثقافت کو دنیا کی دیگر ثقافتوں اور تہذیبوں سے جدا کر دیتی ہے۔

اللہ پر ایمان

یہ ایمان رکھنا کہ اللہ تعالیٰ اپنی تمامتر خصوصیات کے ساتھ واحد ہے۔ اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں۔ چنانچہ جو اللہ پر ایمان رکھتا ہے وہ تنگ نظر نہیں ہو سکتا۔ اس کا دل حرص و ہوس اور رشک و حسد کے جذبات سے پاک ہو جاتا ہے اور وہ اپنے اعمال کی تہذیب کرنے پر قادر ہو جاتا ہے۔

فرشتوں پر ایمان لانا:

فرشتوں پر ایمان لانا کہ وہ اللہ کی مخلوق ہیں اور اللہ کے حکم سے کائنات کو چلا رہے ہیں

رسولوں پر ایمان لانا:

سلسلہ نبوت پر ایمان لانا جو حضرت آدمؑ سے شروع ہوا اور حضرت محمدؐ پر ختم ہوا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا ایمان بالرسل کی بنیاد پر جو تہذیب قائم ہوتی ہے۔ وہ تمام خرابیوں سے پاک ہوتی ہے اللہ کے رسولؐ کے مقرر کردہ اصول قومی یا زمانی نہیں بلکہ آفاقی و مبنی برصداقت ہوتے ہیں۔ جس چیز کو حضرت محمد صلی اللہ علیہ والہ وسلم نے کفر و باطل قرار دے دیا ہے وہ ہمیشہ کے لیے کفر اور باطل ہے اور جسے اسلام نے حق کہہ دیا وہ ہمیشہ کے لیے حق ہے۔ یہی وہ ٹھوس بنیاد ہے جس پر اسلامی تہذیب کی عظیم الشان عمارت تعمیر ہوئی ہے۔

الہامی کتابوں پر ایمان

تمام الہامی کتابوں پر ایمان لانا جو وقتاً فوقتاً اللہ تعالیٰ اپنے رسولوں پر اپنے کلام کی صورت نازل فرماتا رہا اور جس کی آخری کڑی قرآن پاک ہے۔ جو اسلامی شریعت کا منبع و مصدر ہے۔ جس پر اسلامی تہذیب کی بنیاد ہے۔

یوم آخرت پر ایمان لانا:

اس بات پر ایمان لانا کہ موت کے بعد ایک زندگی ہے جو دائمی ہے ہر انسان کو موت کا ذائقہ چکھنا ہے اور پھر دوبارہ ساری مخلوق کو زندہ کیا جائے گا اور جزاء سزا اعمال کے مطابق دی جائے گی۔ نیکی کا پھل نیک اور بدی کا پھل برا ملے گا۔ اس وقت کوئی دنیاوی چیز کام نہ آئے گی سوائے اللہ تعالیٰ کی رحمت کے وہ جسے چاہے بخش دے۔

تربیت افراد:

اسلام میں تربیت افراد کا طریقہ خارجی سے زیادہ داخلی ہے۔ تہذیب و تزکیہ نفس کے بعد ہی انسان اس قابل ہوتا ہے کہ وہ بہتر معاشرتی زندگی گزار سکے۔ اسلام نے اعمال کا دارومدار نیت پر قرار دیا ہے۔ چنانچہ نیت درست ہونے سے عمل کی درستگی کے ساتھ فلاحی معاشرہ وجود میں آتا

ہے جس کی صاف ستھری ثقافت دنیا کی بہترین ثقافت بن جاتی ہے۔

اجتماعی نظام

اسلام نے انفرادیت پر زور دیتے ہوئے فرد کو ملت اور معاشرے کا پابند بھی ٹھہرایا ہے۔ اطاعت الٰہی اور اطاعت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد اطاعتِ امیر بھی فرض کی گئی۔ اسلام کا اجتماعی نظام خاندان سے شروع ہو کر ''مسجد' محلّہ، گاؤں، شہر، علاقہ اور پھر ملت اسلامیہ کی طرف سفر کرتا ہے۔ لیکن فرد کی وفاداری ترجیحی طور پر ملت کے ساتھ پہلے اور پھر درجہ بدرجہ خاندان اور ذات تک آتی ہے۔ یوں نسبتاً مضبوط معاشرے کی بنیاد پڑتی ہے۔

درحقیقت تہذیب وتمدن ثقافت کے دو بڑے پہلو ہیں۔ اسلامی ثقافت میں بھی ان پہلوؤں نے اتنا بھرپور کردار ادا کیا ہے کہ آج تہذیب وثقافت کو ایک حد تک جدا جدا دیکھنا مشکل ہو گیا ہے۔ ابتدائی عہد کی اسلامی ثقافت یقیناً عرب ثقافت سے ایک حد تک جداگانہ تھی۔ اسلامی ثقافت کی نمایاں خصوصیات میں عظمت انسانی، مساوات، اتحاد، رواداری، آزادی، امن، میانہ روی، عدل وانصاف، اخلاق اور عالمگیریت شامل ہیں ہم کہہ سکتے ہیں کہ عربوں کی ثقافت میں اسلامی معیار ثقافت نے نمایاں تبدیلیاں کیں۔ درج بالا مظاہر پر اسلامی ثقافت کی عمارت تعمیر ہوتی ہے۔ مختلف ادوار میں مسلمانوں نے مختلف تہذیبوں کا اجرا کیا وہ اسلامی تو نہیں البتہ مسلم کلچر کہلا سکتی ہیں اسلامی تہذیب اس روز وجود میں آئے گی جب اسے پورے معیارات کے ساتھ نافذ کیا جائے گا۔

قرونِ وسطیٰ میں سقوطِ بغداد (تیرہویں صدی عیسوی) تک مسلم تہذیب اپنے عروج پر تھی خصوصاً علمی وسائنسی میدانوں میں دور دور تک مسلمانوں کا کوئی ہم پلہ نہ تھا۔ دنیا وآخرت دونوں پر مسلمانوں کی نظر تھی اور وہ ان دونوں کو بہتر بنانے میں لگے ہوئے تھے۔ یہ وہ دور تھا جب یورپ وحشت وبربریت اور جہالت میں ڈوبا ہوا تھا۔ لوگ گارے اور گھاس کے جھونپڑوں میں رہتے تھے۔ سیاست، حکومت، تمدن اور تہذیب کا کوئی تصور سرے سے وہاں موجود نہ تھا۔ دنیا کی بڑی

بڑی تہذیبیں اور تمدن تباہ ہو چکے تھے۔ اس وقت مسلمان اٹھے اور دیکھتے ہی دیکھتے انہوں نے ہندوستان سے فرانس اور چین سے افریقہ تک کے علاقوں میں ایک ہی ثقافت وارد کر دی تھی مسلمانوں نے جابجا مساجد بنائیں جن کا طرز تعمیر دیگر معابد سے جدا تھا۔ انہوں نے علم وفن کے مراکز قائم کیے۔ یونانی، رومی، ہندی اور چینی علوم کو جمع کر کے مرتب کیا۔ کتب جمع کرنے کا جنون مسلمانوں میں عام تھا۔ سلاطین اور امراء تو کیا عام مسلمان بھی کتابوں کا ذخیرہ کرنا ثقافت و تہذیب کا جزو سمجھتا تھا۔ ''تمدن عرب'' کا مصنف لیبان لکھتا ہے۔

''جب منگولوں نے اہل بغداد کی کتابیں دریائے دجلہ میں پھینکیں تو وہاں ایک پشتہ سا بن گیا جس پر لوگ پیدل چل سکتے تھے اور دریا کا پانی سیاہی گھلنے سے کالا ہو گیا تھا۔'' ۹

ایجاد وصنعت کے لحاظ سے بھی مسلمان سب سے آگے تھے۔ مسلمانوں کا سب سے اہم کام کاغذ کا رواج تھا۔ اس کے اصل موجد تو چینی تھے مگر مسلمانوں نے بغداد، دمشق نیشاپور، شیراز، خراسان، مراکش، قرطبہ، غرناطہ اور سسلی وغیرہ میں کاغذ سازی کے کارخانے لگائے اور پہلی بار انہیں کتابوں اور تحریروں کے لیے استعمال کیا۔ موسیو لیبان لکھتا ہے۔

''کاغذ پر پہلی تحریر عربوں ہی کی تھی۔ اسی طرح قطب نما کا استعمال بھی مسلمانوں ہی نے کیا اور شورے کے استعمال کو ترقی دے کر بارود ایجاد کیا۔ توپ کو سب سے پہلے افریقہ کے سردار یعقوب نے ۱۲۰۵ء میں استعمال کیا اور سلطان مراکش ابو یوسف نے پہلی بار توپ بنانے کا کارخانہ لگایا۔ مسلمانوں کی قابل ذکر ایجاد گھڑی اور کلاک ہے۔'' ۱۰

قرونِ وسطیٰ کی ثقافت میں علم کی فراوانی کا یہ حال تھا کہ لوگ تحصیلِ علم کو فرضِ اولین اور کسب معاش کو فرض دوم سمجھتے تھے۔ خصوصاً علم دین اور تصوف میں مسلمانوں نے وہ کمال حاصل کیا کہ آج تک دیگر علوم کے ارباب بست وکشاد اس مقام تک نہیں پہنچ سکے۔

۹۔ لیبان، تمدن عرب، پرنسٹن پریس، آکسفورڈ، ۱۹۵۸ء ص ۵۲

۱۰۔ ایضاً ص ۶۹

بغداد میں اسلامی ثقافت کی جھلک بے شمار مساجد، مدارس اور جامعات کی صورت میں دکھائی دیتی ہے۔ قرطبہ سپین کا ایک شہر ہے یہاں کے شاہی محلات، باغات، مکانات، عمارتیں، مساجد، پل، حمام وغیرہ اتنے خوبصورت تھے کہ آج تک قابلِ دید ہیں۔ ہر محلہ بجائے خود ایک شہر تھا شہر میں سڑکیں کشادہ اور گلی کوچے صاف ستھرے تھے۔ روشنی کا بہترین انتظام تھا شہر کے سامنے وادی الکبیر کا پُل انجنیئر نگ کا بے مثال نمونہ تھا۔ لاتعداد مدارس تھے تعلیم مفت دی جاتی تھی طلبہ کو وظائف بھی دئے جاتے تھے کتب خانے بے شمار تھے قرطبہ کی جامع مسجد آج بھی مسلمانوں کی تہذیب وتمدن کی واضح عکاس ہے۔

بغداد اور سپین میں قرطبہ جیسے دو بڑے تمدنوں کے علاوہ بے شمار چھوٹے چھوٹے تمدن ہین جو مختلف علاقوں مثلاً مصر، شام، ترکستان، ہندوستان، پاکستان، جزائر انڈونیشا وملائشیا میں معرض وجود میں آئے۔ اگر چہ انہوں نے مقامی ثقافت سے بھی اثر لیا۔ لیکن اس کے باوجود ان پر اسلامی ثقافت کی چھاپ ضرور رہی ہے۔ قاہرہ، دمشق، بصرہ، سمرقند، بخارا، لاہور ،ملتان، دہلی، مالدیپ اور سماٹرا وغیرہ میں مسلمانوں کی تہذیب آج بھی قابلِ ذکر ہے۔ ان سب تمدنوں کی بنیادی روح وہ اسلامی اصول ہیں جنہیں ہم دین یا ضابطۂ حیات کا نام دیتے ہیں۔

مسلم ثقافت چودہ سو سال سے ایک ہی نہج پر چلی آرہی ہے۔ ہمارے وطن عزیز کی بنیاد ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو صرف اس بنیاد پر پڑی کہ ہماری ثقافت سرتاپا ہندو ثقافت سے مختلف ہے۔ مگر افسوس اتنی قربانیوں کے بعد حاصل ہونے والا یہ ملک قائداعظم کی وفات کے بعد نااہل حکمرانوں کے ہاتھوں کھلونا بن کر رہ گیا اور ہمارا حکمران طبقہ اسلامی ثقافت کی بجائے فرنگی ثقافت کا دلدادہ نکلا ڈیڑھ سو برس کی فرنگی غلامی نے انہیں انگریزی تہذیب وتمدن کا گرویدہ بنا دیا تھا طاغوتی قوتیں نہ ہی پاکستان کی حامی تھیں اور نہ ہی وہ پاکستان میں اسلامی ثقافت کو پنپتا دیکھ سکتی ہیں۔ انہوں نے پاکستان میں اسلامی ثقافت کی بجائے شیطانی ثقافت کی ترویج وترقی میں معاون کردار ادا کیا۔ تاریخ شاہد ہے کہ جب بھی کوئی قوم کسی غیر ملک پر قابض ہوتی ہے تو وہاں اپنے اقتدار کے تحفظ

کے لیے سب سے پہلے وہاں کے نصاب تعلیم کو بدل کر اس میں غلامانہ ذہنیت کا درس دینا شروع کرتی ہے تاکہ وہ پھر سے آزادی کے خواب دیکھنے کے قابل نہ رہے یہی کچھ انگریز نے اپنے ڈیڑھ دوسو سالہ عہد حکومت میں کیا اور آج بھی امریکہ کی اسلام دشمنی واضح طور پر دکھائی دیتی ہے۔

تاریخ بتاتی ہے کہ رقص یا ناچ کی بنیاد سب سے پہلے یہودیوں نے ڈالی یہ ناچ گانے کی رسم آہستہ آہستہ یہود و ہنود سے نصاریٰ تک پہنچی اور انہوں نے اسے اپنی ثقافت کا جزو عظیم بنالیا۔ حزب الشیطان کے ذریعے بڑھتے بڑھتے یہ رسم اسلامی دنیا میں بھی پھیل گئی جس کے باعث اکثر اسلامی سلطنتوں پر زوال آیا، علامہ ابن خلدون لکھتے ہیں:

''جتنی اسلامی سلطنتوں پر زوال آیا ہے ان میں اکثر کا باعث یہی تھا۔ کہ وہ بادشاہ ناچ گانوں کی محفلوں میں شب و روز مصرف رہتے تھے۔'' ۱۱ (مقدمہ ابن خلدون)

حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

''مجھے دو احمق اور بیہودہ آوازوں سے منع کر دیا گیا ہے ایک وہ آواز جو لہو ولہب اور مزامیر یعنی گانے بجانے سے پیدا ہو اور دوسری وہ آواز جو بین کرتے وقت اور سینہ اور منہ پر پیٹتے ہوئے پیدا ہو۔'' ۱۲

معاشی، سیاسی، صنعتی اور عسکری میدانوں میں کوئی قوم کتنی ہی طاقتور کیوں نہ ہو اگر اس کی ثقافت (اپنی اصل راہ سے) منحرف ہو جائے تو وہ اندر سے کھوکھلی ہو جاتی ہے۔ اگر کسی معاشرے کی ثقافت کا سرچشمہ کسی مخالف ثقافت سے پھوٹنے لگے تو لامحالہ اس کے دیگر شعبے بھی مخالف سمت کی طرف مائل ہو جائیں گے۔ یہاں تک کہ وہ مخالف ثقافت میں تحلیل ہو کر تمام پہلوؤں میں اپنا وجود کھو بیٹھے گی۔ معاشرے کی آزادی اور بقاء اس کی ثقافتی آزادی پر منحصر ہے۔ اب سوچنا یہ ہے کہ پاکستان میں ہم اسلامی ثقافت کو فروغ دینے میں کیا کردار ادا کر سکتے ہیں۔

۱۱۔ منشی عبدالرحمان، اسلامی ثقافت کا مسئلہ، شاخ زریں گلبرگ، لاہور، ۱۹۸۶ء ص ۳۹

۱۲۔ عطش درانی، اسلامی تہذیب وثقافت، شاخ زریں گلبرگ، لاہور، ۱۹۸۶ء ص ۳۹

کتابیات

۱۔ ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر، تہذیب و تاریخ، غضنفر اکیڈمی پاکستان، ستمبر ۱۹۹۲ء

۲۔ اکرام شیخ محمد، پاکستان کا ثقافتی ورثہ، ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ، لاہور، ۲۰۰۱ء

۳۔ الیبان، تمدنِ عرب، پرنسٹن پریس، آکسفورڈ یونیورسٹی، ۱۹۵۸ء

۴۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، پاکستانی کلچر، نیشنل بک فاونڈیشن، لاہور، ۱۹۹۷ء

۵۔ خاور جمیل، ادب کلچر اور مسائل، رائل بک کمپنی، کراچی، ۱۹۸۶ء

۶۔ عارفہ فرید، ڈاکٹر، پاکستانی کلچر کی روایات، رائل بک کمپنی، کراچی ۱۹۹۳ء

۷۔ عطش درانی، اسلامی تہذیب و ثقافت، شاخ زریں گلبرگ، لاہور، ۱۹۸۶ء

۸۔ عطش درانی، اسلامی تہذیب و ثقافت، مکتبۂ عالیہ، لاہور، ۱۹۸۸ء

۹۔ فیض احمد فیض، پاکستانی کلچر اور قومی تشخص کی تلاش، فیروز سنز، لاہور، ۱۹۸۸ء

۱۰۔ مصطفیٰ سباعی، ڈاکٹر، اسلامی تہذیب کے درخشاں پہلو، ادارۂ معارف اسلامی، ۱۹۸۰ء

۱۱۔ ول ڈیورانٹ مترجم، تنویر جہاں، انسانی تہذیب کا ارتقاء، مکتبہ فکر و دانش، لاہور، ۱۹۸۹ء

۱۲۔ E.G. Tailor, our Culture, Oxford Printing Press, 1958

۱۳۔ Mehdi Qlali Rokni, our Cultural, Haritage, Prinston University Press, 1993

عقیل دانش ۔ لندن (برطانیہ)

خسروِ شیریں مقال

علم ۔ ادب ۔ تاریخ دانی ۔ مذہب ۔ موسیقی ۔ تصوف و شعر اور دانشوری کو یکجا دیکھنا ہو تو برصغیر کی تاریخ میں ایک ہی نام پر نظر پڑتی ہے اور وہ نام ہے امیر خسرو کا ۔ خسرو کے بارے میں مجھ ناچیز ہی کا خیال نہیں ہے ۔ میرؔ جیسے بدد مغ نے بھی ''نکات الشعراء'' میں اُنھیں ''مجمع کمالات'' کے علاوہ ''صاحب حالات'' بھی گردانا ہے ۔ برصغیر کی تاریخ میں خصوصاً مسلمانان ہند کی تاریخ میں امیر خسرو کا نام بذاتہٖ ایک ادارہ ہے ۔ ایک تہذیب کی علامت اور ایک ثقافت کا اشاریہ ہے ۔ وہ ادارہ وہ تہذیب اور وہ ثقافت جس میں شاہ و گدا ۔ خاص و عام، عالم و جاہل، صوفی و رند سبھی کا عکس ہے

خسرو نے اپنے اطراف ۔ اپنے ماحول ۔ اپنے زمانے ۔ اپنے سماج اور اپنی معاشرت سے جو کچھ حاصل کیا تھا اُسے اپنی ژرف نگاہی، تدبیر، فراست، فنکاری، ریاض، حسن نظر ۔ مطالعے مشاہدے، تجربات اور سوزِ دروں سے نکھار کر اور سنوار کر دنیا کے سامنے اس طرح پیش کیا کہ موجودہ علم ۔ ادب ۔ شعر ۔ موسیقی ۔ تصوف اور دوسرے کتنے ہی شعبوں پر اُن کے اثر کی گہری چھاپ لگی ہوئی ہے ۔ اور اس عمل کے پس منظر میں دراصل خسرو کا زندگی کے ساتھ وُہ رویّہ اور محسوسات ۔ میلانات اور رجحانات کی وہ عوامیت ہے جو اُن کے رگ و پے میں بس گئی تھی ۔ جس طرح ایک تناور درخت جس کی چھاؤں میں قافلے ٹھہرتے ہیں اپنا آذوقہ زمین سے لیتا ہے اسی طرح علم و ادب کے اس گھنی چھاؤں والے درخت خسرو نے بھی زمین یعنی عوام سے اپنا رشتہ برقرار رکھا ۔ جس طرح نظیر اکبر آبادی کو اُن کے عوامی رجحانات کی وجہ سے ترقی پسند گردانا جاتا ہے اُسی طرح خسرو کو اپنی عوام پسندی کے لیے اصطلاحاً ''ترقی پسند'' تسلیم کر لینا چاہیئے ۔

خسرو کا ایک گاؤں کے گھاٹ پر پانی طلب کرنا اور گاؤں کی گوریوں کا خسرو سے کھیر ۔ چرخے ۔ کتے اور ڈھول کے الفاظ سے ایک ''ڈھکوسلہ'' نظم کرنے کی فرمائش کرنا اور خسرو کا فی

البدیہہ یہ کہنا کہ

کھیر پکائی جتن سے چرخا دیا جلا　　　آیا کتا کھا گیا تو بیٹھی ڈھول بجا

ممکن ہے الحاقی بات ہو یا زیب داستاں۔ لیکن خسرو کی ذات سے اس طرح کے واقعات منسوب کرنا اس بات کا ثبوت ضرور ہے کہ وہ عوام اور خواص کے مشترکہ محبوب تھے اور یہ محبوبیت اُنھیں عطا ہوئی تھی اُس در سے جہاں شاہوں کی پیشانیاں جھک جاتی تھیں۔ دلّی کے سلطان حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی قدم بوسی کے فیض نے امیر خسرو کے سر پر ''مقبولیت عام'' کا تاج رکھا تھا۔ امیر خسرو کو بھی اُن قدموں کی عظمت اور کفش کی وقعت کا احساس تھا۔ اُنھوں نے گیارہ شاہوں کا زمانہ دیکھا بہت سوں کے دربار سے وابستہ رہے۔ دربار سے وابستگی کا سلیقہ اُنھوں نے اپنے نانا عماد الملک سے سیکھا تھا جو اگر چہ بادشاہ نہ تھے لیکن ''بادشاہ گر'' ضرور تھے۔ کجکلاہوں نے امیر خسرو کی قدردانی کی۔ اُنھیں دل کھول کر نوازا لیکن خسرو کے لیے دام و درہم سے بڑھ کر شیخ کی محبت تھی۔ اور اس کا یہ کرشمہ تھا کہ خسرو نے ایک قصیدے کے صلے میں ایک شاہ کے دربار سے ملنے والے ۵ لاکھ روپے کے عوض ایک مسافر سے اپنے مُرشد کے جوتے خرید لیے۔ مُرشد بھی وُہ جن سے شرف باریابی کی تمنا لے کر جلال الدین خلجی اس دُنیا سے سدھار گیا۔ یہ آگ یہ لگن یکطرفہ نہ تھی جب خسرو سر پر اُستاد کے جوتے رکھ کر نظام الدین اولیاء کے دربار میں پہنچے تو مرشد کہہ اُٹھے ''میرے تبرک سستے خرید لئے۔ جواباً خسرو نے اپنی غزل چھیڑی

ہر دو عالم قیمت خود گفتہ ای　　　نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز

آج جب کہ زندگی بہت آگے بڑھ چکی ہے۔ نقد و نظر اور تحقیق و جستجو کے سانچے بدل گئے ہیں۔ نقادانِ فن اور محققین نے خسرو کے فن کا تجزیہ بھی دقیق نگاہی اور منطقی استدلال سے کیا ہے۔ جدید تحقیق کے مطابق خسرو اُردو کے پہلے شاعر نہیں ہیں بلکہ یہ سہرا مسعود سعد سلمان کے سر بندھتا ہے۔ پھر بھی خسرو کی غزل

زحالِ مسکیں مکن تغافل درائے نیناں بنائے بتیاں
کہ تابِ ہجراں ندارم اے جاں نہ لیہو کاہے لگائے چھتیاں
شبانِ ہجراں دراز چوں زلف و روزِ وصلت چوں عمر کوتہ
سکھی پیا کو جو میں نہ دیکھوں تو کیسے کاٹوں اندھیری رتیاں
چو شمع سوزاں چو ذرّہ حیراں ز مہر آں مہ بگشتم آخر
نہ نیند نیناں۔ نہ انگ چینیاں، نہ آپ آویں نہ بھیجیں بتیاں
یکایک از دل دو چشم جادو، بصد فریبم بہ برد تسکیں
کسے پڑی ہے جو جا سُناوے ہمارے پی کو ہماری بتیاں
بحقِ روزِ وصالِ دلبر کہ درد مارا فریب خسرو
سپنت سُن کے درائے راکھوں جو جاتے پاؤں پیا کے گھتیاں

پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہی وہ زمین تھی جس پر اُردو کا لہلہاتا ہوا سبزہ اُگا ہے مسعود سعد سلمان طرزِ ریختہ کے محرک ہو سکتے ہیں لیکن موجد یقیناً امیر خسرو تھے میرے بچپن ہی سے جب قوال

نمی دانم چہ منزل بود شب جائے کہ من بودم
بہر سو رقصِ بسمل بود شب جائے کہ من بودم
پری پیکر نگارے، سرو قدّے، لالہ رُخسارے
سراپا آفت دل بود شب جائے کہ من بودم
رقیباں گوش بر آواز و اُو در ناز و من ترساں
سخن گفتن چہ مشکل بود شب جائے کہ من بودم
خدا خود میر مجلس بود اندر لا مکاں خسرو
محمدؐ شمع محفل بود شب جائے کہ من بودم

الاپتے تھے تو بغیر سمجھے ہوئے مجھ پر ایک انجانا سا کیف طاری ہو جاتا تھا یہ پڑھ کر کہ یہ نعتیہ غزل امیر خسرو کے کلام میں الحاقی ہے دل پر دھکا سا لگا۔ یہ مانا کہ اُن کے کسی مجموعے میں یہ غزل موجود نہیں ہے لیکن چونکہ کسی اور نے اِس غزل پر دعویٰ ملکیت نہیں کیا نہ کسی ناقد اور محقق نے یہ ثبوت فراہم کیا کہ یہ غزل فلاں کی ہے تو کیوں نہ اسے امیر خسرو کی تخلیق سمجھا جائے کیا اس بات کا امکان نہیں ہے کہ بوجوہ یہ غزل کسی مجموعے میں شامل نہ ہو۔ صاحب حال وقال کے لئے امیر

خسرو کی صرف یہی غزل اُنھیں دیدارِ محمدؐ سے سرفراز کر سکتی ہے۔☆

سرسید احمد خاں کہا کرتے تھے کہ روزِ قیامت جب اللہ تعالیٰ سوال کرے گا کہ سرسید ''دُنیا سے کیا لایا ہے'' تو میں عرض کرونگا کہ میں حالی سے مسدّس لکھوا لایا ہوں۔'' محبوب الٰہی خواجہ نظام الدینؒ لکھتے ہیں کہ جب قیامت میں مجھ سے یہ سوال ہوگا کہ ''نظام الدین دنیا سے کیا لایا ہے۔'' اُس وقت میں خسرو کو پیش کرتے ہوئے عرض کرونگا کہ ''سوزِ سینۂ ایں ترک مرا بہ بخش'' سچ تو یہ ہے کہ سینے میں ایسی ہی آگ رکھنے والا

نمی دانم چہ منزل بود شب جائے کہ من بودم بہر سو رقصِ بسمل بود شب جائے کہ من بودم

کہہ سکتا ہے۔ خسرو کے سینے کی اسی آگ نے خواجہؒ دلّی کے وصال پر اُن سے کہلوایا تھا۔

گوری سوئے سیج پر مکھ پر ڈالے کیس چل خسرو گھر آپنے سانجھ بھئی چودیس

خسرو صرف ملک ادب ہی کے خسرو نہ تھے مملکتِ دل کے بھی خسرو تھے اور یہی بات انھیں اوروں سے ممیّز کرتی ہے۔ ڈاکٹر ظہیر فتحپوری کے الفاظ میں

''خسرو کا اندر باہر سب روشن رہا۔ باہر حسن سنجری سمیت کافی (جیسی) باوفا محبوبوں کی قربتیں تھیں اور اندر محبوب الٰہی کی جلوہ سامانیاں۔ باہر انگور سے کھنچی شراب تھی اور اندر جام حقیقت نما کا انمٹ خمار۔ باہر پرتکلف درباری مجرے تھے اور اندر نیاز مندیوں پر نازو افتخار۔ باہر لفظی جرأت اور عالمانہ رعب داب والے قصیدے اور نثر نما بیانیہ مثنویاں تھیں اور اندر دل کی دھڑکنوں میں ڈوبی ہوئی رسمساتی غزلیں۔ باہر پہیلیوں کی ذہنی مشقیں تھیں تو

☆ خسرو سے منسوب غزل کے مندرجہ بالا چار اشعار ''ارمغان پاک (اسلامی ہندو پاکستان کی فارسی شاعری کا انتخاب) کے مولف شیخ محمد اکرام (مصنف آثار غالب، شبلی نامہ، موج کوثر وغیرہ) نے نقل کیے ہیں (ص ۵۳ مطبوعہ (غالباً ۱۹۴۹ء) چاپ خانہ دین محمدی۔ لاہور) البتہ مقطع مصرعۂ اول کی تبدیلی کے ساتھ اس طرح ہے:

مرا از آتشِ عشق تو دامن سوخت اے خسرو محمدؐ شمع محفل بود شب جائے کہ من بودم (ادارہ)

اندر گیتوں اور دوہوں کی دلدوزیاں۔ زندگی کی اپنی ''لذتیں'' باہر نے دیں اور زندگی بعد از موت کی تابانیاں اندر کے طفیل ملیں۔'' ☆☆

خسرو کی رگوں میں ترک باپ کا خون تھا۔ ہندوستانی ماں کے دودھ اور دوآبے کی فضا نے اُن کی طبیعت میں جو رچاؤ پیدا کیا تھا اُس نے خسرو کو مشرق وسطیٰ اور برصغیر کی تہذیب کا ایسا ستون بنا دیا جو تعصب اور بیگانگی کی فضا میں آج بھی سربلندی کے ساتھ ایستادہ ہے۔ اُن کی شاعری میں ترکی و ایران کی صبحیں ہیں تو لکھنؤ اور بنارس کی شامیں۔ شیراز کے نغمے ہیں تو ہند کے گیت۔ فارسی کے قصائد۔ مثنویاں اور غزلیں ہیں تو ہندی کے دوہے۔ دوسخنے کہہ مکرنیاں۔ ڈھکوسلے۔ معمّے اور چیستاں۔ اُن کی شاعری دماغ بھی ہے اور دل بھی۔ نظر بھی ہے شعور بھی۔ آورد بھی ہے آمد بھی۔ جسم بھی ہے جان بھی۔ اور اُن کی شاعری کی تابناکی سے برصغیر ہی کی نہیں مشرق وسطیٰ اور یورپ کی آنکھیں بھی خیرہ ہو گئیں۔ حافظ شیراز نے اُنھیں طوطی خوش مقال کا لقب دیا۔ لینن گراڈ کے ''سالتی کوف شچدرین'' نامی کتب خانے میں برٹش میوزیم لائبریری لندن میں۔ پیرس کی 'ببلوتیکا نیسانال' لائبریری میں آکسفورڈ کی بودلین لائبریری میں اور مشرقی جرمنی کے دو کتب خانوں میں ان کی تصانیف اور شعری مجموعے آج بھی اُن کی عظمت اور انسان دوستی کی داستانیں سُنا رہے ہیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ میر کا کلام ''آہ'' ہے اور سودا کا کلام ''واہ'' میرا خیال ہے کہ امیر خسرو کا کلام آہ اور واہ کا مجموعہ ہے۔ قوالی کے اپنے 'واہ' سے لے کر رخصتی کے گیت

کاہے کو بیاہی بدیس رے لکھی بابل مورے

تک حال وقال آنسوؤں آہوں۔ مسکراہٹوں۔ قہقہوں۔ وصال وفراق۔ بہار وخزاں اور برہا ملن کے کتنے ہی لمحے کتنی ہی تصاویر اُن کے کلام کا جزو ہیں

''خالقِ باری سرجن ہار'' کو محققین نے ملکیت امیر خسرو سے خارج کر دیا ہے۔ مجھے

☆☆ ہندی میں خسرو کا شعری رویہ ڈاکٹر ظہیر فتحپوری مطبوعہ 'افکار' خسرو وایڈیشن شمارہ نومبر۔ دسمبر ۱۹۷۵ء ص ۱۶۵

ڈر ہے کہ کل کوئی صاحبِ تحقیق ''کاہے کو بیاہی بدلیس'' کو بھی امیر خسرو کا کلام ماننے سے انکار کر دے گا۔ اور کیسا کرب کا عالم گزرے گا اُن لوگوں پر جن کے ذہن میں امیر خسرو اور ''کاہے کو بیاہی بدلیس'' ساتھ ساتھ اُبھرتے ہیں۔ خسرو اور ترنم ۔ خسرو اور موسیقیت ۔ خسرو اور غنائیت ایسے لازم وملزوم ہیں جن کا تجزیہ کرنے کے لئے محققین کو برسوں درکار ہونگے۔ مجھے اپنی کم مائیگی اور کم علمی کا اعتراف ہے میں موسیقی اصطلاحات چھند۔ گیت ۔ پربند۔ دھرپت۔ قول۔ قلبانہ۔ نقش۔ گُل ۔ نگار۔ بسیط ۔ ترانہ۔ خیال دادرا۔ میاں کی توڑی۔ شام کلیان۔ پہاڑی۔ بھیرویں۔ کیدارا۔ درباری۔ ٹھمری وغیرہ سے واقف نہیں ہوں لیکن اتنا جانتا ہوں کہ سارے گاما سے لے کر پادھانی تک۔ اکتارے سے لے کر ستار تک۔ ڈھولک سے لے کر طبلے تک مجھے ہر جگہ خسرو ہی خسرو نظر آتے ہیں

میں اُس خسرو سے کم ہی واقف ہوں جسے گیارہ بادشاہوں کے دربار میں جگہ ملی۔ جسے حافظِ شیراز نے سلام کیا۔ جسے خواجہ دلّی کے پہلو میں فردکش ہونے کا افتخار ملا۔ آج بھی جس کا نام لے کر بڑے بڑے موسیقار اپنا راگ الاپتے ہیں۔ میں اُس خسرو سے بھی واقف نہیں ہوں جو ایک بہادر سپاہی اور تلوار کا دھنی تھا۔ آئینہ سکندری اور ہشت بہشت کے خالق خسرو میری سمجھ میں نہیں آتے۔ میں اُسی خسرو کو جانتا ہوں جو سانجھ بھئے اپنے گھر جانا چاہتا تھا۔ وہ اپنے گھر چلا گیا۔ اُس کے خیال کی خوشبو۔ اُس کے طبلے کی دھمک اس کے ستار کی آواز اور اُس کے شعر کا اعجاز آج بھی زندہ ہے۔ خسرو نے خواص کے مقابلے میں اپنا رشتہ عوام سے زیادہ استوار رکھا تھا۔ اُنھوں نے سادہ زبان میں اور خوبصورت اور دلچسپ انداز میں عوام سے باتیں کی ہیں۔

کسی بھی گلی کوچے کے آدمی سے یہ پہیلیاں اور کہہ مکرنیاں سُن لیجئے ''اتار کیوں نہ چکھا۔ وزیر کیوں نہ رکھا'' دانا نہ تھا۔ گوشت کیوں نہ کھایا۔ ڈوم کیوں نہ گایا''۔ غرض کہ خسرو ہماری تہذیب ثقافت ۔ فکر۔ مزاج ۔ رسوم رواج ۔ اقدار اور روایات کے بلاشبہ سب سے بڑے نمائندہ تھے اور جب تک اُردو زبان زندہ رہے گی خسرو بھی زندہ رہیں گے۔

ہے نام اُن کا زندہ ثقافت کے باب میں — سر پر حصول علم کی دستار بھی رہی
یہ قصہ مختصر ہے کہ خسرو کے ہاتھ میں — تسبیح بھی ۔ ستار بھی ۔ تلوار بھی رہی

عابدہ تقی

جون ایلیا۔۔۔تنہائیوں کا رسن بستہ شاعر

قسمت کی دیوی نے خواہشِ انجمن آرائی کے جرم کی پاداش میں جون ایلیا کو تنہائی کی سزا سنا دی تھی۔ ایک تنہائی تو وہ ہے جو خود آگہی کا ایک سلسلہ ہے۔ جس کا اردگرد کے شور یا خاموشی سے کوئی تعلق نہیں۔ وہ جسے شاعر ہجومِ پُر شور کے درمیان بھی وجودی طور پر کسی محفل کا حصہ ہوتے ہوئے بھی اختیار کرنا چاہے تو کر لیتا ہے فلسفی John Cowper Powys کے بقول وہ نہ تو تنہائی ہے (Loneliness) نہ علیحدگی (Isolation)، بلکہ شکوہِ تنہائی (Glory of solitude) ہے۔ یہ شاعر کے مزاج کا وہ حصہ وہ قوت ہے جو اس کے تخلیقی کمالات کے تسلسل کا ضامن ہے۔ مگر میری ناقص رائے میں جس قوت نے جون ایلیا سے تخلیقی معراج کی منزلیں طے کروائیں وہ ہرگز شکوہِ تنہائی نہیں تھا در اصل ''تنہائی کا کرب'' ہی تھا جو اُن پر ہر طرف سے حملہ آور تھا اور تخلیقی کارگزاری کو انہوں نے اپنے بچاؤ کی ڈھال بنایا یا پھر جوابی جنگ کا ہتھیار۔ لیکن اگر مان بھی لیا جائے کہ تنہائی کی قوت ہی جون ایلیا سے جو ہر ثقلی، فرنود، تجرید جیسے مشکل کاموں کے لیے دماغی عرق ریزی کرواتی رہی تو پھر یہ بھی حقیقت ہے کہ بعد میں اسی نے انہیں اکیلے پن کی اس دیوار میں چنوا دیا جہاں وہ کربِ تنہائی کی آری بن کر ان کے استخوانی وجود کے آر پار ہوتی رہی۔ جسے انہوں نے تنہا روی جیسی خراب عادت کی طرح اپنا لیا تھا اور جس کی وجہ سے ان کے مزاج کے رنگوں میں انتہا پسندی کے عکس مزید گہرے ہو گئے تھے۔ جس کا اظہار ان کے اشعار میں جا بجا ملتا ہے۔ جس کا واحد مثبت پہلو یہ ہے کہ اس نے انہیں خوبصورت اشعار کے لازوال خزانے سے نوازا اور اشعار کے پیرائے میں ان کی ''آپ بیتی'' مرتب کر دی۔

عجیب ہے میری فطرت کہ آج ہی مثلاً　　مجھے سکون ملا ہے ترے نہ آنے سے

ہر اک حالت کے بیری ہیں یہ لمحے　　کسی غم کے بھروسے پر نہ رہیو

جون ہم زندگی کی راہوں میں　　اپنی تنہاروی کے مارے ہیں

جون ایلیا کی شاعرانہ انفرادیت کی شناخت کا مرحلہ بہت سیدھا اور آسان ہے۔ جہاں بہت سے شاعر بہت سے دوسرے شعرا جیسے ہیں وہاں جون ایلیا کسی کی طرح کا شاعر ہے۔ ایک ایسا تخلیق کار کہ گردوپیش نے جسے غم وغصہ کا، فلسفے نے بے یقینی کا، بے یقینی نے تنہائی کا، تنہائی نے یاد کا اور یاد نے خوف کا آزار دیا۔ اس کی شاعری سے جھانکتی زندگی جن آزاروں سے برسرپیکار دکھائی دیتی ہے بے یقینی ان میں سرفہرست ہے۔

یہ جو بھی کچھ ہے نہیں کچھ بھی جز فریبائی　　یقیں کو چھوڑ دو یعنی گماں سے چل نکلو

وہ گماں اور یقین کے بیچ اس گھمسان کے رن میں اپنے تماش بینوں کو اپنے مضروب جسم، مجروح انا اور گھائل سانسوں پر شعری تازہ کاریوں کی تاثیرِ اندمال کا معجزہ دکھاتے رہے۔ سوچ کی مکڑی ان کے ذہن کی دیواروں پر فریب وگماں کے جالے بُننے کا کام کرتی رہی اور ان کے تخلیقی ہاتھ ان جالوں کو ہٹا کر دھندلے منظروں کو واضح اور شفاف بناتے رہے۔ کیونکہ ان کے پاس بدنی اور ذہنی قوت قلیل ہی سہی مگر حرف اور قلم کی استطاعت کثیر تھی۔ تخلیقی قوتوں کا ان کے گرد مضبوط حصار انہیں ذہنی طور پر پسپا ہونے نہیں دے رہا تھا اور شائد ان کی تخلیقی فتحمندی کا منہ بولتا ثبوت بن کر سامنے آیا۔ وہ غصہ ور، یقین کی منزل سے دور "میں" کے سوالیہ نشان کو کھوجتے ہوئے، کائنات کے بود و نبود پر سر کھپاتے، اپنی تلاش میں سرگرداں، کوئی گتھی سلجھانے کے عمل میں الجھنوں کے غار میں محصور، اپنی شاعری کو دائمی بقا دینے کے لیے مسلسل چلّہ کشی کرتے رہے اور اس دوران کتابوں کا

ڈھیر ان کے گرد فصیل بن گیا، ایسی فصیل جو باہر کی روشنیوں کو اندر آنے کی اجازت نہیں دیتی اور وہ ان کتابوں کے اندر رمز کی قندیل جلنے کا انتظار کرتا رہا۔

میرے کمرے کو سجانے کی تمنا ہے تمہیں
میرے کمرے میں کتابوں کے سوا کچھ بھی نہیں

ان کتابوں میں چھپی رمز کا مارا ہوا ذہن
مژدۂ عشرت انجام نہیں پا سکتا
زندگی میں کبھی آرام نہیں پا سکتا

آج کے جدید دور میں عقلی استدلال (Rational approach) مانا جاتا ہے کہ کسی شخصیت سے اس کے فن یا حالاتِ زندگی کے بارے میں جاننے کے لیے اپنے سوالوں کو بدتمیزی کی حد تک بیباک کیا جائے۔ اس ٹیکنیک کا اثر جواب دینے والے پر یہ ہوتا ہے کہ وہ مشتعل ہو کر سب حقیقتوں کا اظہار کر دیتا ہے کوئی شے بھی مخفی نہیں رہتی۔ جون ایلیا کی شاعری کو پڑھتے ہوئے متعدد بار مجھے محسوس ہوا کہ زندگی ان کے سامنے کسی منہ پھٹ انٹرویور کی طرح بیٹھی ان سے سچ اگلوانے کی کوشش میں انہیں مسلسل اشتعال دلائے جا رہی تھی اور وہ اندر سے دہکتے لیکن باہر سے خاموش کسی جوالا مکھی کی طرح جب شعلہ فشاں ہوئے تو سارا حال کہتے چلے گئے۔

حال یہ ہے کہ خواہشِ پرسشِ حال بھی نہیں | اُس کا خیال بھی نہیں اپنا خیال بھی نہیں
اے شجرِ حیاتِ شوق ایسی خزاں رسیدگی | پوششِ برگ وگل تو کیا جسم پہ چھال بھی نہیں

میں بھی بہت عجیب ہوں اتنا عجیب ہوں کہ بس

کچھ ناقدینِ ادب کا یہ خیال ہے کہ کچھ اشعار کی خوشبو سماعتوں کا تعاقب خود کرتی ہے اپنے ذائقے کا تعارف فہم و ادراک سے خود کرواتی ہے اور ایسا شاعر کی تخلیقی توفیقات کی بنا پر اور تخیل کے

اظہار کی طاقت پر ہوتا ہے۔شائد یہ طاقت جون ایلیا کے پاس موجود ہے۔ان کی تخلیقی توفیقات ان کے اشعار کے نطق سے بولتی ہیں۔ان کی شاعری اپنی سخنورانہ استطاعت اور شعری لوازمات میں خود کفالت کی آئینہ دار ہے، ایک مترنم بے اختیاری کے ساتھ کیونکہ شاعری ان کے ماحول میں جزوِ پیغمبری نہیں مکمل پیغمبری سمجھی جاتی تھی اور ایک الوہی آہنگ اور قدوسی ترتیل کی حیثیت رکھتی تھی۔اسی لیے جون ایلیا اوائل عمری میں ہی کچھ مترنم بحروں کے اسیر ہو گئے جو اُن میں تخلیق انگیز کیفیت پیدا کر دیتی تھیں اور میرے لیے یہ بات بہت خوشگوار حیرت کا باعث ہوتی کہ وہ بحر جس نے انہیں شاعری پر اکسایا اور جس میں وہ کلام کرنا چاہتے تھے وہ ایک منقبت کی بحر تھی۔

روئے حسنؑ، رُخِ حسینؑ، جلوہ طراز مشرقین　　غازہ بہ غازہ، خط بہ خط، دیدہ بہ دیدہ، دُو بہ دُو

''ارسطو سے ایلیٹ تک'' میں میتھیو آرنلڈ کہتے ہیں ''زندگی اور دنیا کو اپنی شاعری میں برتنے سے پہلے شاعر کے لیے خود زندگی اور دنیا کے اسرار رموز سے واقف ہونا ضروری ہے'' جون ایلیا نے ''شائد'' کے دیباچے میں شاعری کے بارے میں یہ کہا ہے کہ سچا شاعر ہونے کے لیے صرف ایک گواہی کی ضرورت ہے اور یہ گواہی اسی وقت حاصل ہوتی ہے جب اپنی ذات کو بیرونِ ذات سے دیکھا، پرکھا اور محسوس کیا جائے'' یہ حصارِ ذات سے نکل کر زندگی، ماحول، گرد و پیش کو دیکھنے، سمجھنے اور پرکھنے اور دوسروں کی آنکھ پر یہ منظر اتارنے کی کوشش میں رویوں کے دکھ درد سمیٹنے پڑتے ہیں اور جون ایلیا کے ہاں بھی عمومی طور پر انسانی رویوں کے نتیجے میں ملنے والے دکھ، درد، کرب، غصہ، جارحانہ پن اور مایوسی شعروں کا موضوع ہوئے۔شاعر کو ورثے میں ملی ہوئی حسیّت میں اگر اس کی فطرت کے مثبت یا منفی رنگ بھی شامل ہو جائیں تو پھر اشعار کا رنگ بھی کچھ ویسا ہی ہو جاتا ہے۔وہ یعنی جون ایلیا رویوں کے مشاہداتی اور تجرباتی دور سے گزرنے کے بعد جو نتیجے اخذ کرتے رہے وہ Sarcastic predictions یعنی طنزیہ پیشن گویاں بن کر شعروں کی صورت میں سامنے آئیں۔انسانی رویوں کو اپنی کسوٹی پر پرکھتے ہوئے اور کسی

ریاضی دان کے فارمولے کی طرح اسے مستند قرار دینے کی اتھارٹی اپنے پاس رکھتے ہوئے گویا وہ اس نتیجے پر پہنچ چکے کہ کچھ مہربان رویوں کا آخری اور حتمی نتیجہ وہی ہے جو وہ خود طے کر چکے ہیں اور یوں ان کی شاعری میں وہ پیغمبرانہ پیش گوئیاں (Prophetic predictions) بن جاتی ہیں۔

بہت نزدیک آتی جا رہی ہو — بچھڑنے کا ارادہ کر لیا کیا

مل رہی ہو بڑے تپاک کے ساتھ — مجھ کو یکسر بھلا چکی ہو کیا ؟

کر کے اک دوسرے سے عہدِ وفا — آؤ کچھ دیر جھوٹ بولیں ہم

شاعر کا خواب کچھ الگ طرح کا ہوتا ہے جو بند آنکھوں پر نہیں کھلی آنکھوں پر اترتا ہے اور تخیل کے پردے پر متحرک رہتا ہے۔ یہ خواب ہاتھ نہ آنے والا یا ہاتھ سے پھسل جانے والا وہ لمحہ ہے جس میں اس کی ادھوری تمنا یا آرزوئے ناتمام کا وہ نغمہ ہے جس کی بازگشت وہ سننا چاہتا ہے اور اسی کوشش میں حال سے زیادہ ماضی کی طرف اپنے دھیان کے دریچے کھولے رکھتا ہے۔ جون ایلیا کی زندگی بھی ہر شاعر کی طرح خوابوں سے عبارت ہے۔ ان کی قوتِ متخیلہ نے ہنر مندانِ مصر کی طرح ان خوابوں کو آنکھ کی پتلیوں میں حنوط کر کے ہمیشہ کے لیے محفوظ کر لیا ہے۔ وہ گاہے گاہے نہیں ان کی اوٹ سے پیچھے پلٹ کر دیکھتے ہیں اور اس عمل سے موجود لمحوں میں ناموجود لمحوں کا درد کشید کرتے ہیں۔

مگر خوابوں میں خوابوں کا تسلسل — عذابِ جاں بھی ہے، جاں آفریں بھی

سلا کر حال کی تاریکیوں میں — مجھے ماضی میں چونکاتے ہیں یہ خواب

صبح ہو گی مگر اس خواب سے کچھ کم ہو گی — عجب اک خواب ہے خوابوں کا دیارِ آخرِ شب

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے اپنی کتاب ادبی تنقید اور اسلوبیات میں کہا" ہر بڑی شاعری اپنا پیمانہ خود ہوتی ہے۔ بڑا شاعر یا تو کسی روایت کا خاتم ہوتا ہے یا کسی طرزِ نو کا موجد۔ وہ اظہار کے لیے نئے پیمانے تراشتا ہے اور نئی شعری گرامر تخلیق کرتا ہے۔" یہ طرزِ نو کے موجد والی بات یہاں صادق آتی اس لئے محسوس ہوتی ہے کہ جب کوئی شعری روایت بھولی جا رہی ہو اور اسے پھر سے تازہ کیا جائے تو وہ اس بھولے ہوئے زمانے میں ایجاد بن جاتی ہے۔

بیسویں صدی میں پرانی ردیفوں کا احیاء ان کی شاعری کا کارنامہ ہے جس پر کئی جگہ انہوں نے خود تفاخر کا اظہار کیا۔ جون ایلیا کے دوغزلے اور سہ غزلے بھی ان کی تخلیقی روانی اور افکار کے بہاؤ کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ وحدتِ تاثر کی یہ مثالیں مرزا غالب کے ہاں زیادہ وضاحت سے دکھائی دیتی ہیں۔ جون ایلیا کے دوغزلے میں "نہیں" کی جگہ پرانے طرز کی "نہیں" کا استعمال اس صدی کا جداگانہ تجربہ ہے۔

مرا اک مشورہ ہے التجا نئیں — تو میرے پاس سے اس وقت جا نئیں
ہیں سب اک دوسرے کی جستجو میں — مگر کوئی کسی کو بھی ملا نئیں

معاشی تگ و دو میں معاشرتی اقدار کا اسقدر تیزی سے تبدیل ہونا کہ آنکھ کے سامنے سے وہ منظر غائب ہوتے چلے جائیں جن پر کسی معاشرت کی بقا کی بنیاد ہے اور کچھ نہ کر پانا بے بسی کے عالم میں بدلتی تہذیب کی آنکھ بن کر تبدیلی سے پہلے کے مناظر کو تاریخ کی طرح اور تبدیلی کے بعد آنے والے المیوں کی پیشگوئیوں کو تبلیغ کی طرح اپنے شعروں میں رکھ دیتا ہے۔ فرد کا معاشرے سے رابطے کا تار جس طرح ٹوٹ رہا ہے شاعر کا اسے منصۂ شہود پر لے آنا ہی اس کی شعری ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے مترادف ہے جس میں جون ایلیا سُرخرو ہیں۔

اب کوئی مجھ کو ٹوکتا ہی نہیں — یہی ہوتا ہے خاندان میں کیا

توُنے تو ہم سے آج تک کوئی گلہ نہیں کیا　　　کیسے کہیں کہ تجھ کو بھی ہم سے ہے واسطہ کوئی

یادیں جون ایلیا کے ہاں سینت کے رکھی ہوئی پونجی کی طرح ہیں یا محرومیوں کی بازگشت سے پیچھا چھڑانے کی عارضی کوشش میں ان کی پناہ گاہ۔ یادیں ان کا ایسا عصا بھی ہیں کہ جواُن کی زندگی میں کچھ نہ کچھ توازن برقرار رکھے ہوئے دکھائی دیتا ہے۔ اگر زاویہ نگاہ بدل کر دیکھا جائے تو یہ یاد ان کے منفی حالات کے جمود کی طرف ایک واضح اشارہ بھی ہے جہاں یادِ ماضی حاصلِ زیست منفعت نہیں، احساسِ زیاں کو زیادہ نمایاں کرتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ کبھی کبھی یادوں کا عمل ان کے ہاں خود کو یہ یقین دلانے کی کوشش بھی بن جاتا ہے کہ ان کا ماضی ان کے حال سے زیادہ خوش گن تھا اور ظاہری بات ہے کہ اس تقابل میں بھی جون ایلیا کو دکھ کی فصل کاٹنا پڑتی ہے۔

جانے قدم قدم کہاں مجھ کو چلا کے لے گئی　　　یادِ خراب وختہ یاد، بے سروساز ونامراد

وہ صبح و شام تو جیسے فسانے ہو گئے ہیں　　　جو اپنے طور سے ہم نے کبھی گزارے تھے

''سفر'' کا استعارہ مابعدالطبیعیاتی شعراء کے ہاں ایک موضوع کی حیثیت سے ابھرا جسے وہ روح کا مادیت کے جہاں سے ابدیت کی طرف سفر کی تفہیم بنا کر پیش کرتے تھے۔ رومانی شعراء کے ہاں بھی ''سفر'' تسلسل اور ابدیت کے معنوں میں استعمال ہوا۔ ان سے پہلے یہ کہیں تہذیبوں کے ارتقا کے امیج کے طور پر بھی استعمال ہوا اور نقاد یہ کہتے ہیں کہ جدید شاعری میں سفر وقت کے ساتھ ساتھ پرانے خیالات سے نئے خیالات کی طرف انسانی ذہن کے سفر یا شعور کے ارتقا کی بات ہے۔ اردو شاعری میں ''سفر'' کے استعارے نے قاری کے ذہنی اُفق کو بہت وسعتوں سے آشنا کیا۔ یہ سفر جو فیض کے ہاں جذبۂ سفر کی ان شدتوں کے اظہار کی علامت دکھائی دیتا ہے جہاں جاں سے گزرنے کے مرحلے ہیں:

جو رکے تو کوہِ گراں تھے ہم جو چلے تو جاں سے گزر گئے

رہِ یار ہم نے قدم قدم تجھے یادگار بنا دیا

احسان دانش کے ہاں رونقوں سے تنہائی کی طرف چل نکلنے کا اشارہ اسی سفر میں نظر آیا

اسی وادی میں تم اب جادہ پیا ہو جہاں میں تھا　　　زمانے کی بھری محفل میں تنہا ہو جہاں میں تھا

منیر نیازی کے ہاں غم کے قافلے کا خوشی کے پڑاؤ ڈھونڈنے کے تسلسل کا آئینہ دار ہوا

سفر میں ہیں مسلسل ہم کبھی آباد بھی ہونگے　　　ہوئے ناشاد جو اتنے تو ہم دلشاد بھی ہوں گے

یہی سفر افتخار عارف کے ہاں سمتوں کا تعین کرتی ہوئی زندگی، خود اختیار کیے ہوئے ہجر اور رخ بدلتے رویوں کی پیچیدگی کا بھی عکاس ہے۔

تھکن تو اگلے سفر کے لیے بہانہ تھا　　　اسے تو یوں بھی کسی اور سمت جانا تھا

گویا ''سفر'' ہمارے صاحب اسلوب شعرا کے ہاں زندگی کے تمام داخلی اور خارجی منطقوں کا احاطہ کرنے والا استعارہ ہے۔ جون ایلیا کی شاعری میں بھی ''سفر'' کو موضوع کرتے ہوئے اشعار کئی بے مہر موسموں کی پیامبری کرتے ہیں۔ ان کے ہاں سفر تلاشِ ذات کی سعی بھی ہے اور رُخ بدلتی ہوئی زندگی کے مدارج کا بیان بھی، ذاتی زندگی کی تگ و دو بھی اور ماحصل زندگی کا سراغ بھی، کائنات کی وسعتوں میں بود و نبود کے نئے نشانوں کا پتہ لگانے کا امکان بھی اور جسم و جاں کی تھکن کا اعلان بھی۔

عجب ایک ہم نے ہنر کیا وہ ہنر بطورِ دگر کیا　　　کہ سفر تھا دُور دراز کا سو ہم آ کے خود میں ٹھہر گئے

اک عجب آمد و شد ہے کہ نہ ماضی ہے نہ حال　　　جون برپا کئی نسلوں کا سفر ہے مجھ میں

جون ایلیا کی زندگی کے توانا لمحے جس محبت یا جن محبتوں کی گرفت میں تھے وہ بھی یوں لگتا

ہے کہ ان کے قائم کیے ہوئے مفروضوں سے زیادہ کچھ بھی نہیں۔ محبت جو اُن کی آرزو تھی، خواب، تمنا، ان کی سوختہ جانی بھی وہ دراصل ان کی دسترس میں کبھی تھی ہی نہیں۔ وہ اپنے شعروں میں جس جس زلیخائے زماں اور لیلیٰ عمر سے بظاہر بے نیازی برتتے ہوئے اور ان کو ایک ایک کر کے زندگی سے الوداع کہتے چلے جا رہے تھے یہ ان کی Utopia کے آئیڈیل مناظر ہیں۔ یہ سب وہ ہوگا جو وہ چاہتے تھے کہ ہو مگر دراصل چاہنے اور چاہے جانے کی ناتمام خواہشوں کے شکست خوردہ تھے کیونکہ جس ذہنی کیفیت میں وہ رہے وہاں خیالی صورت گری کی دنیا ان کے اردگرد کے مناظر کو رنگین کیے ہوئے لگتی ہے۔ اس لیے یہ شعری کارگزاریوں سے عیاں محبتیں ان کا گمان ہیں یا گمان کا فریب۔ لیکن جو بھی تھا ان خوش رنگ مفروضوں نے ان کی شاعری کو جمالیاتی پیراہن عطا کیا اور ان کے رنگِ تغزل کو بھی خوب نکھارا اور نظموں کو بھی۔

آرزو کے کنول کھلے ہی نہ تھے فرض کر لو کہ ہم ملے ہی نہ تھے

کسی پہچان کی نظر سے یہاں اصل چہرے کہاں گزرتے ہیں
زندگی میں تمام چیزوں کو ہم فقط فرض ہی تو کرتے ہیں

جون ایلیا نے فلسفے کو ہی اپنے مطالعے کا ہدف کیوں بنایا؟ میرا خود سے یہ سوال کوئی جواب نہیں پا سکا۔ کیونکہ یہ مضمون لکھتے ہوئے اور اب اسے پڑھتے ہوئے ایک جھرّیوں بھرا چہرہ، دو بے یقیں آنکھیں مجھے مسلسل دیکھ رہی ہیں جیسے کہہ رہی ہوں مجھے تو میرے زمانے کے اور بعد کے زمانوں کے فلسفی، نکتہ داں اور دانشور بھی جان نہیں پائے تو عابدہ تقی! تم مجھے جانتی ہی کتنا ہو؟

فضہ پروین

اردو شاعری میں ایہام گوئی

شمالی ہند میں اردو شعرا نے ایہام گوئی پر توجہ دی۔ آخری عہد مغلیہ میں مرکزی حکومت عدم استحکام کا شکار ہوگئی۔ اس کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ ۱۸ فروری ۱۷۱۹ تک تین بادشاہ تخت نشین ہوئے۔ (۱) محمد شاہ رنگیلا ۱۷۱۹ سے ۱۷۴۷ تک مغلیہ حکومت پر قابض رہا۔ اسی عہد میں ایہام گوئی کا آغاز ہوا۔ محمد شاہ اخلاقی اقدار کی دھجیاں اڑا رہا تھا۔ اس کی شامت اعمال ۱۳ فروری ۱۷۳۹ کو نادر شاہ کی صورت میں عذاب بن کر نمودار ہوئی، دہلی کی اینٹ سے اینٹ بجا دی گئی۔ دو لاکھ پچپن ہزار افراد نادر شاہ کی سفاکی اور بربریت کی بھینٹ چڑھ گئے (۲) ان حالات میں اردو شعرا نے ایہام گوئی کی روش اپنائی۔

ایہام سے مراد وہم یا شک میں مبتلا کرنا ہے۔ اپنی اصل کے اعتبار سے ایہام کو رعایت لفظی کے ایک خاص انداز سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ ذو معنی الفاظ کے استعمال سے تخلیق کار دو مفاہیم کے ذریعے قاری کو وہم میں ڈال کر اپنے فنی محاسن کے لیے داد طلب ہوتا ہے۔ میر تقی میر نے ایہام کو ریختہ کی ایک قسم قرار دیا ہے۔ (۳) اردو شاعری میں ایہام گوئی کا رجحان ۱۷۱۸ سے دیکھنے میں آتا ہے جو دہلی کے شعرا کے ہاں پچپن سال تک برقرار رہا۔ (۴) ایہام گو شعرا کے ہاں الفاظ کو دوہری معنویت کا حامل بنا دیا جاتا ہے۔ بادی النظر میں قاری قریب ترین معانی تک جاتا ہے مگر حقیقت میں اس سے مراد دور کے معانی ہوتے ہیں۔ اس طرح قاری قدرے تامل کے بعد دور کے مفہوم تک رسائی حاصل کر پاتا ہے۔ مثلاً

یہی مضمون خط ہے احسن اللہ　　　کہ حسن خوبرویاں عارضی ہے

یہاں عارضی میں ایہام ہے۔ عارضی کے قریب ترین معانی تو ناپائیدار ہیں مگر شاعر نے اس سے رخسار مراد لیے ہیں۔

نشہ ہو جس کو محبت کے سبز رنگوں کا　　　عجب نہیں جو وہ مشہور سب میں بھنگی ہو

یہاں لفظ بھنگی میں ایہام پایا جاتا ہے۔

علم صنائع بدائع میں ایہام کو ایک صنف قرار دیا گیا ہے۔ اردو زبان میں ایہام کے فروغ میں ہندی دوہوں کا گہرا عمل دخل ہے۔ سنسکرت میں ایہام کو "شلش" کہا جاتا ہے۔ اردو میں ہندی اور سنسکریت کے وسیلے سے ایہام کو فروغ ملا۔ فارسی ادب میں بھی ایہام گوئی کا وجود پایا جاتا ہے مگر فارسی تخلیق کار اس میں کم دلچسپی لیتے تھے۔ محمد حسن آزاد نے اردو میں ایہام گوئی کے سلسلے میں لکھا ہے کہ ہندی دوہوں کے زیر اثر اس کا آغاز ہوا (۵) رام بابو سکسینہ نے ایہام گوئی کے آغاز کو ولی کے عہد سے وابستہ کیا ہے۔ انھوں نے لکھا ہے:

"ولی کے معاصرین صنعت ایہام کے بہت شائق تھے۔ یہ صنعت بھاشا کی شاعری میں بہت مقبول ہوئی اور دوہوں کی جان ہے۔ قدما کے کلام میں ایسے ذو معنی اشعار بکثرت ہوتے ہیں۔" (۶)

اردو شاعری میں ایہام گوئی پر خان آرزو اور ان کے شاگردوں نے تخیل کی جولانیاں دکھائیں۔ مولوی عبدالحق نے اردو شاعری میں ایہام گوئی کے محرکات کے بارے میں لکھا ہے۔

"یہ خیال قرین صحت معلوم ہوتا ہے کہ اردو ایہام گوئی پر زیادہ تر ہندی شاعری کا اثر ہوا اور ہندی میں یہ چیز سنسکرت سے پہنچی۔" (۷)

محمد حسین آزاد نے آب حیات میں لکھا ہے کہ ایہام گوئی کا تعلق آخری عہد مغلیہ سے ہے۔ انھوں نے ولی کے عہد میں اس کے پروان چڑھنے کی بات کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"ولی نے اپنے کلام میں ایہام اور الفاظ ذو معنین سے اتنا کام نہیں لیا۔ خدا جانے ان کے قریب العہد بزرگوں کو پھر اس قدر شوق اس کا کیوں کر ہو گیا۔؟ شاید دوہوں کا انداز جو ہندوستان کی زبان کا سبزۂ خود رو تھا، اس نے اپنا رنگ جمایا۔" (۸)

یہ بات قرین قیاس ہے کہ دوہوں نے ایہام گوئی کی راہ ہموار کی مثلاً یہ دوہا ملاحظہ کریں۔

رنگی کو نارنگی کہیں بنے دودھ کو کھویا　　　چلتی کو گاڑی کہیں دیکھ کبیرا ردیا

تخلیقی اظہار کے متعدد امکانات ہوتے ہیں۔ ان میں سے کسی ایک کو منتخب کرنا تخلیق کار کا صوابدیدی اختیار ہوتا ہے۔ ان حالات میں اگر کوئی تخلیق کار یہ طے کرلے کہ وہ قاری کو سرابوں کی بھینٹ چڑھا کر اپنی فنی مہارت کی داد لے گا تو یہ ایک خیال خام ہے۔ ایسے ادیب ذو معنی الفاظ اور زبان و بیان کی بازی گری سے اپنا مافی الضمیر کیسے پیش کرسکتے ہیں؟ ایہام کے متعلق یہ بات ذہن نشین کرلینی چاہیئے کہ ایہام گو شعرا اپنے کلام میں ایسے الفاظ کو استعمال کرتے ہیں جو بہ ظاہر گنجینہ، معانی کے طلسم کی صورت پیدا کردیتے ہیں۔ اور شاعر کو یہ گمان گزرتا ہے کہ قطرے میں دجلہ اور جزو میں کل کا منظر دکھانے پر دسترس رکھتا ہے۔ تخلیق کار کی شخصیت میں داخلی پہلو عام طور پر غالب رہتا ہے۔ اس کی شدت سے مغلوب ہو کر وہ قاری کو حیرت زدہ کرنے کے لیے نت نئے طریقے دریافت کرنے کی ترکیبیں تلاش کرتا ہے۔ ایہام اسی سوچ کو تخلیقی اظہار کی مثال بناتا ہے۔ ایہام گو شاعر تخلیق فن کے لمحوں میں ایسا پیرایۂ اظہار اپناتا ہے کہ پورے شعر یا اس کے کسی ایک جزو سے دو ایسے مفاہیم پیدا ہوں جو ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہوں۔ اس مقصد کے لیے ذو معنی الفاظ کے استعمال میں شعرا نے گہری دلچسپی لی ہے۔ جہاں تک معانی کا تعلق ہے ان میں سے ایک معنی تو قریب کا ہوتا ہے جب کہ دوسرا معنی بعید کا۔ دراصل شاعر کا مدعا یہ ہوتا ہے کہ بعید کے معنی پر توجہ مرکوز کی جائے اور قاری وہم کی صورت میں قریب کے معنی میں اُلجھ کر رہ جائے۔ شاعر ذو معنی الفاظ کو اپنے تخلیقی اظہار کی اساس بنا کر صنائع بدائع کی اس صنف کو اپنی شاعری میں استعمال کرکے اپنی جدت پر داد طلب دکھائی دیتا ہے۔ اس سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ رعایت لفظی کی ایسی صورتیں پیدا کرکے شعرا نے کس طرح مفاہیم کو بدلنے میں اپنی صلاحیتوں کا استعمال کیا۔ اردو شاعری کے کلاسیکی عہد میں یہ رسم چل نکلی تھی کہ حقیقت کو خرافات میں نہاں کرنا ہی فنی مہارت کی دلیل ہے۔ داخلی حقائق کو خارجی فرغلوں میں لپیٹ کر پیش کرنا قادر الکلام ہونے کا ثبوت ہے۔ ایہام بعض اوقات الفاظ کے املا سے بھی پیدا کیا جاتا ہے۔

وہ تخلیق کار جنھوں نے ایہام گوئی پر بھرپور توجہ دی ان کے نام حسب ذیل ہیں:۔

خان آرزو، شاہ مبارک آبرو، ٹیک چند بہار، حسن علی شوق، شہاب الدین ثاقب، رائے آنندرام مخلص، میر زین العابدین آشنا، شرف الدین مضمون، شاہ حاتم، محمد شاکر ناجی، غلام مصطفےٰ یک رنگ، محمد احسن احسن، میر مکھن پاک باز، محمد اشرف، اشرف ولی اللہ اشتیاق، دلاور خان بے رنگ، شرف الدین علی خاں پیام، سید حاتم علی خاں حاتم، شاہ فتح محمد دل، میاں فضل علی دانا، میر سعادت علی خان سعادت، میر سجاد اکبر آبادی، محمد عارف عارف، عبدالغنی قبول، شاہ کاکل، شاہ مزمل، عبدالوہاب، یک رو اور حیدر شاہ۔

کلام میں ذو معنی الفاظ کا استعمال کرنا اس عہد کے شعرا نے بظاہر ایک جدت کا پہلو تلاش کیا۔ ان کا خیال تھا کہ اس طرح کلام کے حسن میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ دور از کار مفہوم اور باتوں کی بے لطفی ضلع جگت کی بے لطفی سے کسی طور بھی کم نہیں (۹) ولی کے سفر دہلی کے بارے میں بھی درست معلومات پر توجہ نہیں دی جاتی۔ دلی کے بارے میں یہ تاثر ملتا ہے کہ انھوں نے کہا تھا

دل ولی کا لے لیا دتی نے چھین　　جا کہو کوئی محمد شاہ سوں

یہ شعر وتی دکنی کا نہیں بلکہ شرف الدین مضمون کا ہے۔ صحیح شعر اس طرح ہے

اس گدا کا دل لیا دلّی نے چھین　　جا کہو کوئی محمد شاہ سوں (۱۰)

ولی کے اشعار میں ایہام کا انداز سادگی، سلاست اور اثر آفرینی کا حامل ہے۔

خودی سے اولاً خالی ہو اے دل　　تجھے اگر شمع روشن کی لگن ہے

موسیٰ جو آکے دیکھے تجھ نور کا تماشا　　اس کو پہاڑ ہووے پھر طور کا تماشا

شیخ شرف الدین مضموں (م ۱۷۳۵) نے ایہام گوئی کے سلسلے میں اپنے اہم کردار کا ذکر کیا ہے

ہوا ہے جگ میں مضموں شہرہ اپنا　　طرح ایہام کی جب سیں نکالی

شاہ مبارک آبر نے ایہام گوئی پر توجہ دی اور اسے اپنے اسلوب کی اساس بنایا۔ آبرو اپنے

اسلوب میں محض ایہام ہی نہیں بلکہ بسا اوقات وہ سادگی، سلاست، بے ساختگی اور دردمندی کو بھی اپنے تخیل کی اساس بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اگر وہ ایہام پر انحصار نہ کرتے تو ان کا شاعرانہ مقام اس سے کہیں بلند ہوتا۔ ایہام میں ان کی مبتذل شاعری نے ان کے اسلوب کو شدید ضعف پہنچایا۔ شیخ شرف الدین مضمون نے ایہام گوئی کو بہ طور اسلوب اپنایا۔ ان کا شمار ایہام گوئی کے بانیوں میں ہوتا ہے۔ ان کی شاعری میں ایہام کی فراوانی ہے۔ اس کے باوجود اس صنعت کے استعمال کی کسی شعوری کوشش یا کھینچ تان کا گمان نہیں گزرتا۔ ایہام گوئی ان کا اسلوب شعروسخن رہا لیکن اس میں وہ اس سادگی، سلاست، بے ساختگی اور بے تکلفی کا مظاہرہ کرتے ہیں کہ ان کے کمال فن کو تسلیم کرنا پڑتا ہے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ تمام کیفیت نوائے سروش کی ایک صورت بن کر شاعر کے دل میں سما گئی۔

مضمون شکر کر کہ ترا نام سن رقیب غصے سے بھوت ہو گیا لیکن جلا تو ہے

کرنا تھا نقش روئے زمیں پر ہمیں مراد قالیں اگر نہیں تو نہیں بوریا تو ہے

نظر آتا نہیں وہ ماہ رو کیوں گزرتا ہے مجھے یہ چاند خالی

اگر پاؤں تو مضموں کو رکھوں باندھ کروں کیا جو نہیں لگتا مرے ہاتھ

شیخ ظہور الدین حاتم (م ۱۷۹۱) کا پیشہ سپہ گری تھا۔ ان کی ایہام گوئی ابتذال کی حدوں کو چھو لیتی ہے اور ذوق سلیم پر گراں گزرتی ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس عہد کے متعدد شعرا نے شیخ ظہور الدین سے اکتساب فیض کیا جن میں مرزا محمد رفیع سودا بھی شامل ہیں۔ حاتم کے اسلوب میں ایک اہم بات یہ ہے کہ وہ تنقیدی بصیرت سے متمتع تھے۔ وہ حالات کے نباض اور قاری کے ذوق سے آشنا تھے اس لیے جب انھوں نے یہ محسوس کیا کہ ایہام سے قاری کا ذوق سلیم غارت ہو جاتا ہے تو انھوں نے نہ صرف اسے ترک کر دیا بلکہ ایسے اشعار بھی اپنے کلام سے حذف کر دیئے۔

نمونہ کلام:

مثال بحر موجیں مارتا ہے لیا ہے جس نے اس جگ کا کنارہ

ہے وہ گردوں مثال سرگرداں　　جس کو حاتم تلاش مال ہوا

نظر آوے ہے بکری سا کیا پر ذبح شیروں کو　　نہ جانا میں کہ وہ قصاب کار کھتا ہے دل گردہ

اس عہد کے ایک اور شاعر کا نام بھی ایہام گوئی کے بانیوں میں شامل ہے یہ سید محمد شاکر ناجی ہیں۔ ناجی زمانی اعتبار سے شاہ حاتم اور دلی دکنی کے ہم عصر ہیں۔ ناجی نے اپنی تمام تر صلاحیتیں ایہام گوئی پر صرف کر دیں۔ ان کے کلام کا بہ نظر غائر مطالعہ کرنے سے قاری اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ اس تخلیق کار نے اپنے قصر شاعری کو ایہام اور صرف ایہام کی اساس پر استوار کرنے کا عزم کر رکھا تھا۔ ایہام کے علاوہ ان کے دیوان میں کچھ موجود نہیں۔ ایہام کے استعمال کی شعوری کاوشوں نے ان کے کلام کے حسن کو متاثر کیا ہے اور سادگی، بے ساختگی اور اثر آفرینی عنقا ہو گئی ہے۔ نمونہ کلام

ریختہ ناجی کا ہے محکم اساس　　بات میری بانیء ایہام ہے

قرآں کی سیر باغ پہ جھوٹی قسم نہ کھا　　سیپارہ کیوں ہے غنچہ اگر تو ہنسا نہ ہو

شیخ شرف الدین مضمون (م ۱۷۴۴) کا شمار ایہام گوئی کی تحریک کے بنیاد گزاروں میں ہوتا ہے۔ شیخ شرف الدین مضمون کو حاتم اور ناجی کے بعد تیسرا بڑا ایہام گو شاعر قرار دیا جاتا ہے۔ ان کی شاعری میں ایہام گوئی کے باوجود جدت اور شگفتگی کا عنصر نمایاں ہے۔

مصطفیٰ خان یک رنگ کی شاعری میں ایہام گوئی اس شدت کے ساتھ موجود نہیں جس قدر آبرو اور ناجی کے ہاں ہے۔ انھوں نے اپنے اسلوب پر ایہام گوئی کو مکمل طور پر حاوی نہیں ہونے دیا بلکہ ایہام گوئی کا ہلکا سا پر تو ان کی شاعری میں موجود ہے۔

جدائی سے تری اے صندلی رنگ　　مجھے یہ زندگانی دردِ سر ہے

ذیل میں بعض ایہام گو شعرا کا نمونہ کلام درج ہے۔ جس کے مطالعہ سے ان کے اسلوب کے بارے میں آگہی حاصل ہو سکتی ہے۔ احسن اللہ احسن:

صبا کہیو اگر جاوے ہے تو اس شوخ دلبر سوں　　کہ کر کے قول پرسوں کا گئے برسوں ہوئے برسوں

عبدالوہاب یکرو:

دیکھ تجھ سر میں جامۂ ململ ـــــ خوش قداں ہاتھ کو گئے ہیں مل

میر محمد سجاد:

ہم تو دیوانے ہیں جو زلف میں سوجاتے ہیں ـــــ ورنہ زنجیر کا عالم میں نہیں ہے توڑا

اردو شاعری میں ایہام گوئی نے بلاشبہ اپنے عہد کے ادب پر اثرات مرتب کیے کئی تخلیق کار اس جانب مائل بہ تخلیق ہوئے۔ جب بھی کوئی تخلیق کار کسی بھی صورت میں اپنے عہد کے علم و ادب کو متاثر کرتا ہے تو بالواسطہ طور پر اس سے افکار تازہ کی سمت ایک پیش رفت کی امکانی صورت پیدا ہوتی ہے۔ جہد و عمل کے لیے ایک واضح سمت کا تعین ہو جاتا ہے، جمود کا خاتمہ ہو جاتا ہے اور خوب سے خوب تر کی جانب سفر جاری رہتا ہے لیکن ایہام گوئی کے بارے میں صورت حال انتہائی غیر امید افزا رہی۔ ایہام گو شعرا نے الفاظ کا ایک ایسا کھیل شروع کیا جس کی گرد میں معنی اوجھل ہو گئے۔ لفظوں کی بازی گری نے اسلوب پر غلبہ حاصل کر لیا، دروں بینی کی جگہ سطحیت نے لے لی۔ ایہام گو شعرا نے افکار تازہ کی جانب کوئی پیش قدمی نہیں کی بلکہ قدامت پسندی کی پامال راہ پر چلتے ہوئے حقائق کو خیال و خواب بنا دیا۔ الفاظ کے اس گورکھ دھندے میں مطالب و مفاہیم عنقا ہوتے چلے گئے۔ فارسی کا ناطقہ سر بہ گریباں تھا کہ اس کو کس چیز کا نام دے اور خامہ انگشت بہ دنداں کہ ایہام گوئی کے متعلق کیا لکھا جائے۔ ایہام پر مبنی تحریروں کا تو مدعا ہی عنقا تھا۔ بعض اوقات ایسا بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ تلمیحات، مرکبات اور محاورات کے معانی میں ایہام کے ذریعے حسِ مزاح کو تحریک ملتی ہے۔ مرزا محمد رفیع سودا کے ہاں اس کا ہلکا سا پرتو ملتا ہے۔ کہتے ہیں آخری عمر میں مرزا محمد رفیع سودا دہلی سے ترک سکونت کر کے لکھنؤ چلے گئے اور نواب آصف الدولہ کے دربار سے وابستہ ہو گئے۔ ایک مرتبہ نواب آصف الدولہ شکار کو گئے سودا بھی ہمراہ تھے۔ شکار کرتے ہوئے ''بھیلوں'' کے جنگل میں نواب آصف الدولہ نے ایک شیر مارا۔ اس موقع کی مناسبت سے سودا نے برجستہ کہا:

یارو! یہ ابن ملجم پیدا ہوا دوبارہ ـــــ شیر خدا کو جس نے ''بھیلوں'' کے بن میں مارا

یہاں شیر خدا سے مراد اللہ کی مخلوق شیر ہے۔اس میں مزاح نگار نے ناہمواریوں کا ہمدردانہ شعور اجاگر کر کے فن کارانہ انداز میں ایہام کے ذریعے مزاح پیدا کیا ہے۔ایہام گوئی اپنی نوعیت کے لحاظ سے کلاسیکیت کے قریب تر دکھائی دیتی ہے۔اس تحریک کے علم برداروں نے الفاظ کے اس کھیل میں اس قدر گرد اڑائی کہ حسن اور رومان کے تمام استعارے قصۂ پارینہ بن گئے۔اردو کو مقامی اور علاقائی آہنگ سے آشنا کرنے میں ایہام گو شعرا نے اپنی پوری توانائی صرف کر دی۔متعدد ایسے الفاظ زبان میں شامل کیے جو مانوس نہیں تھے۔اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ زبان میں ان الفاظ کو قبولیت نصیب نہ ہو سکی۔تاہم کچھ الفاظ ایسے بھی تھے جن کو اپنی جگہ بنانے میں کامیابی ملی۔اس لسانی تجربے سے مستقبل میں مزید تجربات کی راہ ہموار ہوئی اور علاقائی زبانوں کے الفاظ رفتہ رفتہ اردو میں جذب ہونے لگے۔اردو شاعری میں ایہام گوئی کی تحریک ایک بگولے کی طرح اٹھی اور سارے ماحول کو مکدر کرنے بعد گرد کی طرح بیٹھ گئی جب افق ادب پر مطلع صاف ہوا تو اس کا کہیں نام ونشاں تک دکھائی نہ دیا۔

ایہام گوئی محض الفاظ کی بازی گری کا نام ہے۔شاعری کو تاریخ کی نسبت ایک وسیع اور جامع حیثیت حاصل ہے۔ایہام گوئی میں ایسی کوئی صفت نظر نہیں آتی۔اس عہد میں جن شعرا نے ایہام گوئی پر توجہ دی ان میں سے شاہ حاتم اور ولی کے علاوہ کوئی بھی اپنا رنگ نہ جما سکا۔باقی سب ابتذال کی راہ پر چل نکلے۔علم و ادب کے فروغ کے لیے یہ امر ناگزیر ہے کہ درخشاں اقدار و روایات کو پروان چڑھایا جائے۔جب تخلیق کار نظام اقدار کو پس پشت ڈالنے کی مہلک غلطی کے مرتکب ہوتے ہیں تو تاریخ انھیں یکسر فراموش کر دیتی ہے۔اخلاقیات سے قطع نظر ادبیات کے حوالے سے بہر حال ایہام گو شعرا نے الفاظ کے مفاہیم اور معنوی لطافتوں اور نزاکتوں کے حوالے سے جو کام کیا وہ ناقابلِ فراموش ہے۔کثیر المعنویت کی اہمیت مسلمہ ہے۔لفظ کی حرمت اور اسے برتنے کا قرینہ آنا چاہیے۔معدودے چند ایہام گو شعرا نے مرصع ساز کا کردار ادا کیا الفاظ کو مربوط انداز میں اشعار کے قالب میں ڈھال کر انھوں نے الفاظ کو گنجینۂ معانی کا طلسم بنا دیا۔تاریخ ادب

میں اس تجربے کو ہمیشہ قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔

مآخذ

۱ محمد اکرام شیخ ڈاکٹر، رودِ کوثر، ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور طبع دوازدہم ۱۹۸۸ء صفحہ ۵۹۸

۲ حسن اختر ملک ڈاکٹر: اردو شاعری میں ایہام گوئی کی تحریک یونیورسل بکس، لاہور ۱۹۸۶ صفحہ ۲۴

۳ انور سدید ڈاکٹر: اردو ادب کی تحریکیں، انجمن ترقی اردو اشاعت چہارم ۱۹۹۹، صفحہ ۱۸۷

۴ وقار عظیم سید پروفیسر، تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان وہند، جامعہ پنجاب لاہور، ساتویں جلد، ۱۹۷۱، صفحہ ۶۵

۵ وقار عظیم سید پروفیسر، تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان وہند، جامعہ پنجاب لاہور، ساتویں جلد، ۱۹۷۱، صفحہ ۶۷

۶ رام بابو سکسینہ تاریخ ادب اردو ترجمہ مرزا محمد عسکری، گلوب پبلشرز، لاہور ص ۱۶۷

۷ عبدالحق مولوی ڈاکٹر "اردو شاعری میں ایہام گوئی" مضمون مجلّہ ہم قلم، کراچی، اشاعت جون ۱۹۶۱ صفحہ ۹

۸ محمد حسین آزاد: آب حیات، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور صفحہ ۷۵

۹ حسرت موہانی سید فضل الحسن نکات سخن، حیدرآباد، جنوری ۱۹۲۵ صفحہ ۱۱۸

۱۰ حسن اختر ملک ڈاکٹر: اردو شاعری میں ایہام گوئی کی تحریک یونیورسل بکس، لاہور ۱۹۸۶ صفحہ ۷۶

ڈاکٹر راہی فدائی۔ میسور (انڈیا)

علامہ اقبالؒ کی نفسیات (۱۸۷۷۔۱۹۳۸ء)

''علامہ اقبالؒ جتنے عظیم شاعر تھے اتنے ہی کمزور نفسیات کے مالک تھے'' یہ اور اس قبیل کی آرا کسی بھی نقاد یا محقق کی کیوں نہ ہوں مبنی بر نادانی ہی نہیں حق و صداقت کے بھی منافی ہوتی ہیں۔

انسانی نفسیات دراصل مزاج و ماحول اور تعلیم و تربیت کے اثرات و ثمرات کے ساتھ ذہنی انسلاکات و طبعی رجحانات کے مربوط و مستحکم باطنی وقوعے کا نام ہے۔ نفسیات کے ہزار رنگ اور صد ہزار روپ ہوتے ہیں، جس طرح انسانی شکلیں سرسری نظر میں ایک دوسرے سے مناسبت رکھنے کے باوجود قطعی طور پر مختلف تشخصات کی حامل ہوتی ہیں، اسی طرح انسانی نفسیات بھی بظاہر یکساں نظر آنے کے باوصف گوناگوں کیفیات کی مرکز و محور ہوتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ نفسیات کے مثبت و منفی اثرات کی تاریخ ہی انسان کے اخلاق و کردار کی تاریخ کی حیثیت سے روشناس ہوتی ہے، جس پر اہل دانش و بینش صواب و خطا اور صحیح و غلط کے فیصلے صادر کرتے رہے ہیں۔

علامہ اقبال پر تحریر کردہ سوانحی مضامین اور ان کے خطوط کا بغائر مطالعہ کیا جائے تو ہمارے پردۂ ذہن پر علامہ کی نفسیات کے کئی پوشیدہ زاویے تابندہ ہونے لگتے ہیں۔ چنانچہ علامہ کا انتہائی حساس طبع ہونا اور آپ میں حمیت اسلامی کے جوش و جذبہ کا وافر حصہ پایا جانا یہ تو اظہر من الشمس ہے ہی مگر علامہ کا انفعالی مزاج و غیر مستقل طبیعت کی نیرنگی بھی قاری کی توجہ کو اپنی طرف مبذول کر لیتی ہے۔ مثال کے طور پر آپ کی عائلی زندگی کے اوراق الٹ کر دیکھیں تو محسوس ہوتا ہے کہ آپ کی اہلیہ محترمہ کے ساتھ ازدواجی زندگی کی ناآسودگی، بچوں کے تعلقات میں تلخی اور گھریلو حالات و معاملات میں ناہمواری اور نامساعد حالات ممکن ہے کہ مذکورہ بالا نفسیات کی وجہ سے رونما ہوئے ہوں۔ علامہ کے گھریلو حالات پر خود آپ کے فرزند جاوید اقبال نے تبصرہ کرتے ہوئے تحریر کیا:

''نذیر نیازی کی رائے میں کریم بی (اہلیہ علامہ اقبال) سے کشیدگی کی ابتداء انہیں ایام (۱۹۰۰ تا ۱۹۰۵) میں ہوگئی تھی، ۱۹۰۵ء سے لے کر ۱۹۰۸ء تک یہ تین سال اقبال نے یورپ میں گذارے، ان کی واپسی پر معراج بیگم (دختر) بارہ برس کی اور آفتاب اقبال (فرزند) دس برس کے تھے'' ۔ نذیر نیازی (مزید تحریر کرتے ہیں) یورپ سے واپسی کے بعد اگرچہ وہ (کریم بی) احیاناً لاہور آتیں، محمد اقبال ان کا بڑا خیال رکھتے ۔ مگر ایک دوسرے سے کشیدگی بڑھتی چلی گئی تا آنکہ باپ اور بھائی کی کوششوں کے باوجود مکمل علیحدگی کی نوبت آ گئی، یہ زمانہ محمد اقبال کے لیے بڑے اضطراب کا تھا'' (زندہ رود، جلد دوم، ص ۱۶۲)

علامہ کے مذکورہ بالا ناہموار و غیر تسلی بخش حالات کے باوجود آپ کا گھرانہ بفضل خدا پھولا پھلا اور آپ کا صبر و تحمل بار آور ثابت ہوا جس کی زندہ و تابندہ مثال آپ کے لائق و فائق فرزند جاوید اقبال کی صورت میں علمی دنیا کے روبرو موجود ہے ۔ علامہ کی زندگی کے نشیب و فراز میں آپ کے خیر خواہوں کی نیک خواہشات اور شائقین کلام اقبال کے قلبی تاثرات کے علاوہ یتیم بچوں کی دعاؤں کے ثمرات بھی شامل ہیں چنانچہ علامہ اقبال ۱۰ جنوری ۱۹۲۹ء کو مہاراجہ میسور کرشنا راج وڈیر چہارم کی دعوت پر دورۂ میسور کے لیے اپنے رفقاء پروفیسر عبداللہ چغتائی اور چوہدری محمد حسین کے ساتھ بنگلور سے میسور تشریف لائے تو ۱۱ جنوری بروز جمعہ حضرت سلطان ٹیپوؒ کی زیارت سے فراغت کے بعد مسلمانان میسور اور یتیم خانہ اسلامیہ کی جانب سے شہر کے ٹاؤن ہال میں منعقد جلسہ سے ولولہ انگیز خطاب فرمایا اس یادگار و عظیم الشان جلسہ میں صدر محفل نواب غلام احمد کلامی نے سپاس نامہ پیش کرتے ہوئے کہا تھا:

''ہم آخر میں ان معصوم یتیموں کی دعاؤں کا تحفہ آپ کی خدمت میں پیش کرتے ہوئے اظہار تشکر و امتنان کرتے ہیں، بارگاہ رب العزت میں نہایت عاجزی و خلوص دل سے دعا کرتے ہیں کہ خدا آپ کے خاندان کو سرسبز و شاداب رکھے اور اقبال مندی کے ساتھ سرخ رو بنائے آمین ثم آمین'' (علامہ اقبالؒ کے دورۂ میسور کی چند تاریخی جھلکیاں ۔ از: ایس

معین الدین پاشا میسور۔ ص:۸ روزنامہ راشٹریہ سہارا، بنگلور۔ ۱۱ جنوری ۲۰۱۱)

علامہ کے مداحوں نے آپ کے خانگی احوال سے صرف نظر کیا ور صرف آپ کے اعلیٰ درجے کی تخلیقات پر نگاہ مرتکز کرتے ہوئے آپ کی شاعری کے فنی محاسن وحسن و جمال اور آپ کے گرانقد پیغام خودی و درس اولوالعزمی کی دل کھول کر داد دی، اور بجا طور پر آپ کی تحسین وتوصیف میں رطب اللسان ہوئے۔ بقول ڈاکٹر عبارت بریلوی:

''اقبال پاکیزگی کے شاعر ہیں، بلند اخلاق کے مفکر ہیں، ان کی ساری شاعری زندگی کی اعلیٰ قدروں کی ترجمان ہے۔ ان کا سارا فلسفہ زندگی کے ارفع معیاروں کا عکاس ہے۔
(اقبال۔ احوال وافکار۔ ص ۱۰۰)

اس کے برخلاف علامہ اقبال کے مداحوں نے درونِ خانہ جھانکنے کی کوشش کی اور اس پر پڑے ہوئے دبیز پردوں کو ہٹا کر دیکھا پھر اس بات پر گرفت کی کہ علامہ عطیہ فیضی کی علمیت و ذکاوت اور اس کے حسن و جمال سے اس قدر متاثر ہوئے کہ اس کی محبت آپ کے دل میں جاگزیں ہوگئی، اسی وجہ سے آپ کی عائلی زندگی کی چہاردیواری میں دراڑ پیدا ہوگیا، جس کی تلافی آپ سے ممکن نہ ہوسکی۔ بقول سلیم اختر:

''پہلی شادی سے اقبال خوش نہ تھے، یورپ میں عطیہ سے ملاقات ہوئی اور ہم مذاقی اور ہم مشربی کو جذباتی ناآسودگی کے لئے باعثِ تسکین بنانے کی سعی کی۔ لیکن بہ وجوہ بات نہ بن سکی'' (اقبال کا نفسیاتی مطالعہ۔ ص ۱۶/ ماخوذ از حیات اقبال)

بہر حال مذکورہ بالا اعتراضات نے علامہ کی بلند و بالا شخصیت کے قد کو گھٹانے میں ایڑی چوٹی کا زور لگایا مگر دنیا نے دیکھ لیا کہ انہیں ناکامی و نامرادی کا منہ دیکھنا پڑا۔ دراصل آپ کی شاعری کا جمال معنی عطیۂ خداوندی تھا جس کے آگے عطیہ فیضی کا حسن دل آرا کا نشہ دیر پا نہیں رہ سکا۔ بقول پروفیسر شکیل الرحمٰن:

''اقبال کی جمالیات میں جہاں روشنی کا احساس جمالیاتی جذبۂ یاس بن گیا ہے وہاں

جمالیاتی شعری تجربہ بے حد قیمتی ہو گیا ہے۔(اقبال۔روشنی کی جمالیات۔۲۹۔ماخوذ از اقبال کا فن)

یہاں یہ نکتہ ذہن نشین رہے کہ کسی بھی قد آور فن کار کی عظمت اس کے فن پارے میں پوشیدہ ہوتی ہے، خصوصاً شاعر کی بلندیٔ خیال بسا اوقات عرش و کرسی کی بلندیوں کو پیچھے چھوڑ دیتی ہے اور اس کے افکار کی تابندگی مہر و ماہ کے لیے بھی باعث رشک بن جاتی ہے۔ان اوصاف کے حاملین بلند قامت شعرا کی حیات کے چند کم زور پہلو ان کی شہرتِ دوام میں مانع نہیں ہو پاتے ہیں، وہ تو ''تلامیذ الرحمٰن'' ہیں جنہیں خدائے بزرگ و برتر اپنے فضل و کرم سے قوتِ تخیل اور فکر رسا سے نوازتا ہے۔جس کی بدولت وہ ایسے نادر و محیر العقول مضامین شعروں میں بیان کرتے ہیں جو عوام تو کجا خواص کے لیے باعث حیرت و استعجاب ہوتے ہیں۔ان اشعار میں حکمت و دانائی کی نورانیت بھری رہتی ہے، جیسا کہ حدیث شریف میں ارشاد ہوا ہے۔''ان من الشعر الحکمۃ وان من البیان لسحرا''یعنی بعض اشعار حکمت سے مملو ہوتے ہیں اور بعض بیانات جادو کا اثر رکھتے ہیں۔

یہ حقیقت اپنی جگہ اٹل ہے کہ دنیا کے نامور ادباء و شعرا میں سے بہت سے ایسے بھی گزرے ہیں جن کی خانگی زندگی بظاہر ناکام رہی ہے۔حضرت سعدی شیرازیؒ کی مثال سامنے ہے۔آپ کی اہلیہ بڑے گھرانے کی فرد تھیں اور عیش و آرام کی دلدادہ تھیں، اسی لیے حضرت سعدی کی سادگی اور بے نیازی پر ناراض رہتیں اور طعنے دیا کرتی تھیں۔جس کا تذکرہ کرتے ہوئے حضرت سعدی نے یہ شعر کہا تھا

''حال من از دخت سلطاں ابتر است۔در گلویم سدتِ پیغمبر است۔''

اس امر واقعہ کی وجہ سے سعدیؒ کی نہ شخصیت مجروح ہوئی اور نہ ان کی تخلیقات متاثر ہوئیں۔ اس سے آگے اگر ہم دیکھیں اور اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ بندوں اور نفوس قدسیہ کی نجی زندگی پر نظر ڈالیں تو پتہ چلے گا کہ ان مقدس ہستیوں کی دعوت و تبلیغ کے باوجود ان کے گھر کا ماحول پوری طرح ان سے ہم آہنگ نہ ہو سکا۔اس کی مختلف مثالیں کلام الٰہی میں موجود ہیں چنانچہ حضرت سیدنا نوح

علیہ السلام اور ان کے باغی فرزند کا ذکر، حضرت سیدنا ابراہیم علیہ السلام اور ان کے کافر باپ کا تذکرہ اور حضرت سیدنا لوط علیہ السلام اور ان کی نافرمان بیوی کا بیان، اس بات کی دلیل ہے کہ پروردگار عالم کی قدرت وحکمت کے آگے ہر کوئی بے بس ومجبور ہے۔

علامہ اقبال نفسیاتی طور پر بڑے ہی رقیق القلب واقع ہوئے تھے۔ اور یہ حقیقت ہے کہ رقتِ قلبی نیک بندوں کا خاصہ ہوتی ہے اور اس سے کسر نفسی وخیر خواہی، مروت ومحبت جیسے صالح جذبات باطن میں جلوہ گر ہوتے ہیں، جس کے نتیجہ میں آدم زاد فرشتوں پر سبقت لے جاتا ہے۔ علامہ اقبال کی نفسیات میں چونکہ یہ عنصر غالب رہا ہے اس لیے آپ ہر نیک خصلت اور ہر عمدہ صفت سے بہت جلد متاثر ہو جایا کرتے تھے، گویا یہ انفعالی کیفیت ان کی فطرتِ ثانیہ بن گئی تھی۔ یہی سبب ہے کہ آپ نے رام، بدھ، بھرتر ہری، گرونانک، لینن، نپولین، مسولینی وغیرہ شخصیتوں میں موجود کسی نہ کسی وصفِ خاص کی تعریف کی ہے جس کی تفصیل آپ کی اردو کلیات اور فارسی مثنوی ''جاوید نامہ'' میں ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔

یہ بات صد فی صد درست ہے کہ رقت قلبی کا حامل شخص اپنے اعلیٰ اقدار و بلند کردار کے مقابل پست خیالی وتنگ نظری کو موجود پاتا ہے تو اس کے احساسات شدید طور پر زخمی ہو جاتے ہیں اور اس کا برملا اظہار بھی اس سے ہو نہیں پاتا لہٰذا وہ صبر وضبط کے دامن میں منہ چھپائے بارگاہِ الٰہی میں پہنچ جاتا ہے۔ چنانچہ علامہ اقبال کے ساتھ بھی یہی کچھ ہوا تھا جس کی تفصیل اہلِ نظر سے پوشیدہ نہیں ہے۔ الغرض علامہ کے فکر وفلسفہ کے سیلاب اور آپ کی شاعری کی تند وتیز ہواؤں میں جس طرح چند فکری وفنی اعتراضات خس وخاشاک بن کر نیست ونابود ہو گئے، اسی طرح آپ کی بعض ذاتی کمزوریاں بھی آپ کی عظمت وشہرت کے آگے کالعدم ہو گئیں۔ مذکورہ بالا بیان سے راقم کا ہرگز یہ ادعا نہیں ہے کہ علامہ اقبال فرشتہ تھے اور ان سے کوئی غلطی کا امکان ہی نہیں تھا، بلکہ عرض کرنا یہ ہے کہ علامہ بھی ایک انسان تھے اور بمصداق ''الانسان مرکب من الخطا والنسیان'' یعنی انسانی خمیر میں غلطی اور بھول چوک داخل ہے لہٰذا اس سے عصیاں کا سرزد ہونا عین تقاضائے

بشریت ہے۔

بقول مفکر اسلام و ماہر اقبالیات مولانا ابوالحسن علی ندوی:

''میں اقبال کو کوئی معصوم و مقدس ہستی اور کوئی دینی پیشوا اور امام و مجتہد نہیں سمجھتا اور نہ میں ان کے کلام سے استناد اور مدح سرائی میں حد افراط کو پہنچا ہوا ہوں جیسا کہ ان کے غالی معتقدین کا شیوہ ہے۔ ان کی نادر شخصیت میں ایسے کمزور پہلو بھی ہیں جو ان کے علم وفن اور پیغام کی عظمت سے میل نہیں کھاتے اور جنہیں دور کرنے کا موقع انہیں نہیں ملا، البتہ میں سمجھتا ہوں کہ اقبال وہ شاعر ہیں جن سے اللہ تعالیٰ نے اس زمانے کے مطابق بعض حکم و حقائق کہلوائے ہیں جو کسی دوسرے معاصر شاعر و مفکر کی زبان سے نہیں ادا ہوئے۔ میرا خیال ہے کہ پیغام محمدیؐ کے بقائے دوام، امت مسلمہ کے استحکام اور اس کی قائدانہ صلاحیت، عصری نظریات و فلسفہ کی بے مائیگی پر ان کے پختہ عقیدے سے ان کی فکر میں وضاحت اور پختگی آئی ہے اور ان کی خودی کی تعمیر ہوئی ہے، اس معاملے میں وہ خاص کر دینی علوم کے ان فضلا سے بھی آگے ہیں، جو مغربیت کی حقیقت سے واقف نہیں اور نہ انہیں اس کے حقیقی اغراض و مقاصد اور تاریخ سے گہری واقفیت ہے۔ (نقوش اقبال ص۔۳۴۔۳۵)

علامہ اقبال کی حیات کے مختلف ادوار میں صرف گرم موسم آئے، چنانچہ آپ کے کردار پر معاندین کی طرف سے انگلیاں اٹھائی گئیں حتیٰ کہ آپ پر لندن کے زمانہ طالب علمی میں اقدام قتل کا الزام بھی عائد کیا گیا جس سے آپ باعزت بری کیے گئے، ان نامساعد حالات میں کسی بھی سلیم الطبع انسان کے پرسکون دریائے جذبات میں طغیانی کا پیدا ہونا فطری امر ہے۔ علاوہ ازیں علامہ کے گھر کا ماحول دینی و روحانی ماحول اور اس کے تابندہ نقوش آپ کے ذہن و دل پر مرتسم ہو چکے تھے۔ بقول علامہ اقبال:

''جب میں سیالکوٹ میں پڑھتا تھا تو صبح اٹھ کر روزانہ قرآن کی تلاوت کرتا، والد مرحوم

اپنے درود و ظائف سے فرصت پا کر آتے اور مجھے دیکھ کر گزر جاتے، ایک صبح وہ میرے پاس سے گزرے تو فرمایا کبھی فرصت ملی تو میں تم کو ایک بات بتاؤں گا، بالآخر انہوں نے ایک مدت کے بعد یہ بات بتائی، ایک دن صبح جب میں حسب دستور قرآن پاک کی تلاوت کر رہا تھا تو وہ میرے پاس آئے اور فرمایا بیٹا! کہنا یہ تھا کہ جب تم قرآن پڑھو، تو یہ سمجھو کہ یہ قرآن تم پر ہی اترا ہے یعنی اللہ تعالیٰ خود تم سے ہم کلام ہیں۔'' (تلاش اقبال: ص ۲۴۷)

اور آپ کے ابتدائی دور کی مشرقی تعلیم و تربیت کے گہرے اثرات آپ کے مزاج میں سرائیت کر چکے تھے۔ بقول پروفیسر محمد عثمان :

''یورپ کی آزاد معاشرت نے جس میں عورت محض جسمانی حسن کی نمائش ہی کرتی نظر نہیں آتی بلکہ اپنی ذہنی کاوشوں اور کمالات کے لحاظ سے بھی بڑی حسین اور پرکشش ہے، ان کو بے حد متاثر کیا اور ان کی شاعری (گویا ان کا ذہن) ایک نئے اور انوکھے دور میں داخل ہو گئی۔'' (حیات اقبال: ص ۱۱۴)

اسی لیے جب آپ کو مغربی تعلیم، اس کے حیرت انگیز نتائج، مغربی دنیا کی آزاد فضا اور وہاں کے بے تکلف معاشرتی حالات سے سابقہ پڑا تو آپ کے باطن میں اقدار و افکار کی کشمکش اور میلانات و رجحانات کا ٹکراؤ شدت کے ساتھ ظاہر ہوا۔ اس پر قابو پانے میں آپ کو وقت تو ہوئی اور وقت تو لگا مگر آخر کار آپ نے اس پر غلبہ حاصل کر لیا، بعد ازاں آپ کو مکمل سکون و طمانیت کا احساس ہونے لگا۔ آپ کی اسی نفسیات کی بازگشت ''پیام مشرق'' میں صاف طور پر محسوس کی جا سکتی ہے۔

علامہ کو جب ''نفس مطمئنہ'' نصیب ہوا تو آپ نے پہلے تو ''زبور عجم'' میں پھر ''ارمغان حجاز'' میں جو پیغام عالم اسلام ہی کو نہیں بلکہ تمام انسانیت کو دیا وہ رہتی دنیا تک آپ کا نام اور کام باقی رکھنے کے لیے کافی ہے۔

اس مختصر مقالے سے راقم کا مقصد اہل علم کی خدمت میں یہ گزارش کرنی ہے کہ وہ کسی بھی فن

کار پر لکھنے اور اس کے مقام و مرتبہ کو متعین کرنے سے پیشتر اس کی تمام تحریروں کا بغور مطالعہ کریں اور اس کی شخصیت کے خدوخال حیطہ تحریر میں لانے سے قبل اس کی نفسیات کا بھرپور جائزہ لیں تاکہ ہمیں اس فن کار کی تخلیقات کو بخوبی سمجھنے میں مدد ملے اور ان فن پاروں کی گہرائی کا صحیح اندازہ لگانے میں ہم ناکام نہ رہیں۔

کتابیات

۱۔ کلیات اقبال۔ مطبوعہ: ۱۹۹۷ء ناشر: مکتبہ اسلامی، پبلیشرز، نئی دہلی

۲۔ اقبال: احوال وافکار۔ از ڈاکٹر عبارت بریلوی۔ مطبوعہ ۱۹۸۱ء۔ ناشر: مکتبہ نعیمیہ، دہلی ۲

۳۔ نقوش اقبال۔ از مولانا ابوالحسن علی ندوی، مطبوعہ ۲۰۰۲ء مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنؤ

۴۔ اقبال کا فن۔ مرتبہ پروفیسر گوپی چند نارنگ، مطبوعہ ۱۹۸۹ء۔ ادارہ شہادت حق، جامع مسجد، دہلی ۶

۵۔ تلاش اقبال۔ از خالد حامدی، مطبوعہ ۱۹۸۰ء۔ ادارہ شہادت حق، جامع مسجد، دہلی ۲

۶۔ حیات اقبال۔ مرتبہ ڈاکٹر طاہر تونسوی، مطبوعہ ۱۹۷۹ء اعتقاد پبلشنگ ہاؤس، دہلی ۲

۷۔ زندہ رود۔ از جاوید اقبال۔ مطبوعہ ۱۹۸۷ء شیخ غلام علی اینڈ سنز۔ لاہور

۸۔ کلیات مکاتیب اقبال۔ مرتبہ مظفر حسین برنی، مطبوعہ ۱۹۹۳ء اردو اکیڈمی، دہلی

۹۔ راقم مترجم علامہ اقبالؒ محترم جناب سید ایثار صاحب کا شکر گذار ہے کہ انہوں نے اپنے کتب خانے سے استفادے کا موقع عطا فرمایا۔

سیّدہ نغمہ زیدی

اقبال اور مغربی مُفکّر نطشے

مشہور یورپی مُفکر و فلسفی فریڈرک ولیم نطشے (۱۸۴۴ تا ۱۹۰۰ء) جرمنی میں پیدا ہوا۔ اُس کی کتابیں ''زرتشت نے کہا'' ''خیر وشر سے ماوراء'' اور ''ارادہ قوت'' وغیرہ اپنے منفرد نظریات و افکار کے باعث بہت مشہور ہوئیں۔ ۱۸۸۹ء میں فالج کا حملہ ہونے سے اس کے قویٰ مفلوج ہو گئے تھے۔ اور وہ معذوری کی حالت میں اپنے خالقِ حقیقی سے جاملا۔

نطشے کی ابتدائی تحریروں پر شوپن ہار کا گہرا اثر ہے۔ البتہ فوق البشر کی اصطلاح اُس نے گوئٹے سے مستعار لی ہے۔ جو گوئٹے کے ابتدائی رومانی دور کی نشانی ہے نطشے خُدا کا منکر تھا۔ اس کا عقیدہ یہ تھا کہ جب تک خُدا کا تصوّر پورے طور پر انسان کے دِل سے محو نہ ہو جائے۔ انسان اپنی موجودہ ذلیل غلامانہ حالت سے آگے قدم نہیں اٹھا سکتا۔ جب تک لوگ دیوتاؤں اور طلسمات کے قائل تھے۔ سائنس اور حکمت پیدا نہیں ہو سکی جب تک انسان اس آخری بُت کو نہیں توڑے گا۔ کسی بلند سطح کی طرف عروج نہیں کر سکے گا۔ نطشے عیسائیت کا جانی دشمن تھا اور اس کے لیے کسی قسم کے سمجھوتے کے لیے تیار نہیں۔ وہ کہتا ہے کہ مذہب دو قسم کے ہیں۔

(۱) اثباتِ حیات کے مذاہب، جو زندگی کو ہاں کہتے ہیں (۲) نفی حیات کے مذاہب جو زندگی کو ''نہیں'' کہتے ہیں بہ الفاظِ دیگر زندگی کو نعمت سمجھ کر اس کے حصول اور فلاح میں کوشش کرنے والے اور زندگی کو لعنت سمجھ کر اس سے بھاگنے والے عیسائیت اور بدھ مت کو وہ نفی حیات کے مذاہب قرار دیتا ہے۔ اس لیے ان کو عقلاً وعملاً تہس نہس کرنا چاہتا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ عیسائیت عاجزوں اور غلاموں کی ایک زبردست بغاوت تھی۔ اقتدار کو الٹ کر غلاموں نے اپنے حرماں و افلاس کو سب سے بڑی نعمت اور دولت قرار دیا اور یہ تعلیم دینی چاہی کہ فقط عاجز، مفلس،

بے کس، طمانچے کھانے والے اور بیگار میں پکڑے جانے والے، اور بے زر لوگ بھی خُدا کی بادشاہت میں داخل ہوسکیں گے۔ جاہل کو عالم پر فوقیت ہے۔ غریب کو امیر پر اور ناتواں کو توانا پر فطرت کا حُسن ایک دھوکہ ہے اور جسمانی اور مادی زندگی گناہِ آدم کی ابدی سزا۔ نطشے کہتا ہے کہ اس ہتھیار سے یہودیوں نے اہلِ روما کو شکست دی۔ غُلام آقاؤں پر غالب آگئے۔ شیر بکرے بن گئے نطشے کے خیال میں اخلاق کی اساس طاقت ہے نہ کہ شفقت و کرم اصل کسوٹی حیاتیاتی ہے۔ چنانچہ ہمیں چاہیے کہ اشیاء کے حسن و قبح کا فیصلہ زندگی کے سلسلے میں ان کی قدر و قیمت کی رو سے کریں۔ ضرورت ہے کہ تمام مروّجہ اقدار کو نئے سرے سے مرتب کیا جائے۔ آدمی کی آزمائش اس کی توانائی، صلاحیت اور طاقت کے ذریعے ہوتی ہے۔ انسانی کوششوں کا مقصود سب کو اونچا اٹھانا نہیں ہونا چاہیے بلکہ بہتر اور قوی تر افراد کا ارتقاء نطشے کے الفاظ یہ ہیں۔ ''بنی نوع انسان نہیں بلکہ انسان برتر مطمحِ نظر ہے''

اس کے نزدیک انسانی معاشرے کا مقصود و ملتہا تمام انسانوں کی ترقی اور نشو و نما نہیں بلکہ یہ ایک وسیلہ ہے جو مردِ برتر'' کی شخصیت کی تکمیل اور قوت میں اضافہ کے سامان فراہم کرتا ہے۔ شروع میں نطشے کا خیال تھا کہ فوق البشر بحیثیت نوع ارتقا پائے گا۔ مگر بعد میں اس نے اس نظریے میں ترمیم کرلی۔ نطشے کا فوق البشر ایک اعلیٰ فرد ہوتا ہے۔ جو معمولی اوسط درجے کے لوگوں کے ہجوم سے نموودار ہوتا ہے۔ اور اپنے وجود کے لیے محتاط پرورش، صحیح غور و پرداخت اور تربیت کا متقاضی ہوتا ہے۔ نطشے کے خیال میں اعلیٰ افراد کی پیدائش کے ذریعے بہترین خاندانوں میں ہی شادی کرنی چاہیے۔ عمدہ نسل فوق البشر کے لیے ضروری ہے۔ اعلیٰ انسان کی خصوصی تربیت اور سخت نگہداشت کے ذریعے صلاحیتوں کو ابھارنا ہوگا ذمہ دار بنانے کے لیے کم سے کم آسائشیں اور آرام مہیا کرنا ہوگا۔ تاہم طبیعی و جسمانی مطالبات کو مردود قرار نہیں دیا جائے گا۔ شخصیت کی تکمیل میں اخلاقی رکاوٹیں نہیں ہونی چاہیں۔ اُسے اپنی طاقت برتری اور صلاحیتوں کے اظہار کے لیے ہر رکاوٹ کو پار کرنے کا موقع ملنا ضروری ہے۔

نطشے کسی ازلی اور ابدی خیر و شر کی مطلق تفریق اور تقسیم کا قائل نہیں فوق البشر نیک نہیں بلکہ بے خوف ہوگا۔ نطشے کے الفاظ یہ ہیں ''خیر کیا ہے؟ ہر وہ چیز خیر ہے جو آدمی میں طاقت کا احساس پیدا کرے۔ شر کیا ہے؟ کمزوری سے مشتق ہر چیز ہے۔ نطشے کے فوق البشر کی خصوصیات میں خطر پسندی، کشمکش، بے خوفی، قوت و فراست تکبر، جاہ و جلال، ذہانت و فطانت شامل ہیں۔ اعلیٰ مقاصد کے لیے اخلاقی پابندیوں سے آزادی، تحقیقی عظمت اس ارضی زندگی کو ہی اصل زندگی کے طور پر قبول کرنا، گناہ، دوزخ، موت اور ضمیر کے خوف سے آزادی فوق البشر کے لیے ضروری ہے اخلاق دو طرح کے ہیں۔ (۱) آقائی اخلاق (۲) غلامانہ اخلاق

صداقت کی تلاش ، جرات، زندگی کو لذت و الم اور سود و زیاں کے پیمانے سے نہ ناپنا۔ ہر قسم کا اثبات اور حیات افزا فعلیت آقائی اخلاق کے مظاہر ہیں۔

ہر قسم کی بزدلی، رسوم و قیود کی پابندی، عجز، قناعت، توکل، حلم، عبرت، خیرات غرض کہ ہر قسم کی انفعالی صورتیں غلامانہ اخلاق میں داخل ہیں۔ اب تک نوع انساں نے جو اخلاق پیدا کیا وہ ایک سفید جھوٹ ہے۔ گناہ حقیقت میں کوئی چیز نہیں ہر چیز معصوم ہے۔ بدی صورت بدل کر نیکی اور نیکی صورت بدل کر بدی ہو جاتی ہے۔ حکمت شعار انسان ابھی پیدا نہیں ہوا۔ ابھی ارتقا نے اس کی طرف پہلا قدم اٹھایا ہے۔ ایک زمانہ آئے گا کہ نوع انساں کی زندگی اخلاق و مذہب کی بجائے حکمت پر مبنی ہوگی۔ نطشے کے الفاظ ہیں

''وہ شخص جو عامتہ الناس ہی کا ایک معمولی فرد رہنا نہیں چاہتا اس پر فرض ہے کہ اپنے آپ پر نرمی نہ کرے۔ کوئی ایسا مقصد رکھنا جس کی خاطر آدمی نہ صرف اوروں پر بلکہ خود اپنے آپ پر سختی کرے۔''

سیاسیات میں نطشے کا خیال ہے کہ تمام اعلیٰ درجہ کی تہذیب وہاں پیدا ہوئی ہے جہاں جماعت کے دو طبقے تھے۔ ایک جبری محنت کرنے والا دوسرا آزاد اور اختیاری محنت کرنے والا۔ نطشے جمہوریت کا دشمن ہے نطشے کو جمہوریت پر یہ اعتراض ہے کہ یہ اعلیٰ درجے کے آزاد افراد کی

سرکوبی کا ایک طریقہ ہے۔ ترقی حیات کبھی جمہور کی رائے سے نہیں ہوئی۔ جمہوریت واشتراکیت بھی عوام اور اقوامِ غلام کی ایک سازش ہے۔ جس میں اعلیٰ درجے کے آزاد افراد پیدا نہیں ہو سکتے۔ افلاطون کے نزدیک بھی وہ جمہوریت جس میں سقراط جیسے اعلیٰ انسان کو مخرب اخلاق اور دشمن انسانیت قرار دے کر زہر پلا دیا جائے۔ کسی حیثیت سے تعریف کی مستحق نہیں ہوسکتی۔

نطشے کے خیال میں پنولین بوناپارٹ انسان برتر کے تصور سے بڑی مطابق رکھتا ہے۔ اس نے نہ صرف شاندار عسکری فتوحات کیں بلکہ اپنی کمزوریوں کے باوجود ایک متحدہ یورپ اور نئے یورپی تمدن کے خواب کو تعبیر دینے کی کوشش کی۔ ایسی طرح جولیس سیزر بھی فوق البشر تھا۔ وہ ایک طاقتور حکمران تھا۔ مگر اُس نے اپنے جذبات کو منضبط کر کے تکمیل ذات کی۔

نطشے نے تکمیل ذات، ضبط نفس، خودنمائی، خودبینی وغیرہ کا پرچار کر کے انسانی خودی کو مستحکم کرنے پر زور دیا۔ نطشے کے افکار و خیالات کا تفصیلی مطالعہ کرنے کے بعد ہم اقبال کے نظریات کا جائزہ لیتے ہیں۔

علامہ اقبال نے اپنی مثنوی جاوید نامہ میں ''اشتراکیت وملوکیت'' کے عنوان کے تحت نطشے کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کچھ یوں کیا ہے۔

صاحب سرمایہ از نسل خلیل — یعنی آں پیغمبر بے جبرئیل
زانکہ حق و باطلِ او مضمراست — قلب او مومن و ماغش کافراست
غربیاں گم کردہ اند افلاک را — در شکم جویند جانِ پاک را
رنگ و بو از تن نگیرد جان پاک — جز بہ تن کارے ندارد اشتراک
دین آں پیغمبر حق ناشناس — برمساواتِ شکم دارد اساس

تا اخوت را مقام اندر دل است
بیخ او در دل نہ در آب و گل است

زندگی ایں را خروج آں را خروج — درمیانِ ایں دو سنگ آدم زجاج

ایں بہ علم و دین و فن آرد شکست　　آں بہ بردجاں رازتن ناں راز دست
غرق دیدم ہردو را با آب و گل　　ہر دو را تن روشن و تاریک دل
زندگانی سوختن با ساختن
در گلے تخمِ دلے انداختن

اقبال ۱۹۰۵ء میں انگلستان گئے۔ تو یورپ میں نطشے کی شہرت کا آفتاب چمکا ہوا تھا۔ اگرچہ اقبال نطشے سے بھی متاثر ہوئے اور اس کے افکار و خیالات کا بھی بہ نظر غائر مطالعہ کیا۔ پیام مشرق میں بھی کچھ اشعار نطشے پر لکھے اور ایک نظم شوپن ہار اور نطشے پر بھی ہے۔ جس میں دونوں کے فلسفوں کا مقابلہ ایک تمثیل سے کیا ہے۔

بعض ناقدین نے اقبال پر نطشے کے فلسفیانہ اثرات کے بارے میں غلو سے کام لیا ہے۔ سب سے پہلے اہم بات یہ ہے کہ نطشے ملحد تھا۔ جب کہ اقبال صاحب ایمان۔ اقبال دُنیا میں ربانی نظام کا داعی ہے۔ تو نطشے نے خدا کی موت کا اعلان کیا۔ پھر اقبال کشف و الہام کو انسان کا سب سے بڑا انعام تصوّر کرتا ہے۔ جب کہ نطشے نے مذہب کو ایسی افیون قرار دیا جو عوام کی اکثریت کو خواب خرگوش میں مُبتلا کر دیتی ہے۔ البتہ یہ درست ہے کہ یہ دونوں اعلیٰ ترین انسان فوق البشر کی تخلیق کے لئے کوشاں رہے۔ دونوں میں اس امر پر بھی اتفاق پایا جاتا ہے کہ ”انسان محض پل ہے“ جسے عبور کرنا ہوتا ہے۔ لیکن یہ بھی واضح رہے کہ نطشے کا فوق البشر قوت ارادی کے بے رحم اور غضبناک پہلوؤں کی تجسیم ہے۔ جب کہ اقبال کے مرد کامل کی پناہ گاہ اور مرکز قوت عشق ہے۔ اور اسی عشق سے وہ دُنیا کی قلب ماہیت کرنے کا خواہاں ہے۔

اقبال کی نظر آفاقی تھی ان کے اصولِ اخلاق میں کائنات کی گہرائی روحانیت کی ہم وسعتی تھی وہ بھلا مادی حد بندیوں کے اندر کیسے محصور رہ سکتے تھے۔ ان کے ہاں پُر معنی توازن تھا۔ نطشے کو جیسا انھوں نے پہچانا کم ہی کسی نے پہچانا ہوگا۔ اور اپنے شمشیر علم سے بھی خوب چرکے لگائے ہیں۔ وہ

اسے ایک مجذوبِ فرنگ سے آگے نہیں بڑھاتے۔

'وائے مجذوبے کہ زاد اندر فرنگ'

نطشے کے فوق البشر کا مقصد حیات اپنے جسمانی اور ذہنی قویٰ کو صیقل کرتے رہنا ہے۔ اور اس مقصد کے لیے وہ رکاوٹ بننے والی تمام چیزوں کو تباہ و برباد کر دیتا ہے۔ جب کہ اس کے برعکس اقبال کا انسانِ کامل اپنے راستے میں آنے والوں کو برباد کیے بغیر اور عملِ تطہیر جاری رکھتے ہوئے خد کو برتر وجود میں تبدیل کرتا ہے۔ نطشے اگر متشدّدانہ رویّوں کا داعی ہے تو اقبال نے قوت برداشت پیدا کرنے کی تلقین کی ہے۔ نطشے کے بموجب بنی نوع انسان آقا اور غلام کی صورت میں دو نسلوں میں منقسم ہے۔ جب کہ اقبال تمام انسانوں کی قدر و قیمت کو یکساں سمجھتا ہے۔

اقبال نے (NEW ERA) میں اسلامی جمہوریت کے بارے میں لکھتے ہوئے اس خیال کا اظہار کیا تھا۔

> ''یورپ میں جمہوریت کا آغاز بڑی حد تک یورپی معاشروں میں اقتصادی نشاۃ الثانیہ کا مرہونِ منت ہے۔ لیکن نطشے مجمع کی حکومت سے سخت دہشت زدہ ہے۔ جس کے نتیجے میں اس نے عوام کو مسترد کر کے ''ثقافت کی ارفع صورت کے لیے فوق البشروں انسانوں پر مبنی ایک طبقہ اشراف کی تشکیل و نمو پر زور دیا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا عوام کے لیے اس دنیا میں واقعی کچھ نہیں کیا جا سکتا؟

اسلام میں جمہوریت اقتصادیات سے وابستہ امکانات کی توسیع کا نام نہیں ہے۔ یہ تو ایک روحانی اصول ہے۔ جس کی اساس اس امر پر استوار ہے کہ ہر انسان میں بعض ایسی صلاحتیں ودیعت کی گئی ہیں جو اُس سے مختص ہیں۔ چنانچہ ایک خاص نوع کا کردار اپنا کر ان خوابیدہ صلاحیتوں کی نشو و نما کی جا سکتی ہے۔ اور اس سطح کے خمیر ہی سے اسلام نے عظیم اشراف کی تخلیق کی۔ اسلام کے ابتدائی دور میں جمہوریت کے جو تجربات کیے گئے کیا وہ اپنی عملی صورت میں نطشے کے تصورات کی تردید نہیں کرتے۔؟

اقبال کے نزدیک انسانی ترقی ایک لامتناہی سلسلہ ہے۔ اس کی وسعت کی کوئی حد نہیں جب کہ نطشے اسے دوری گردش گردانتا ہے۔ بالفاظ دیگر نطشے کی تعلیمات کی رو سے یہ کائنات بلا حقیقت ہے۔ یہ مقصد بالذات نہیں جب کہ اقبال کے لیے یہ ایک شعوری توانائی ہے۔ جس کے دائرے کی کبھی تکمیل نہیں ہوتی۔ لہٰذا یہ صحیح معنوں میں تخلیقی فعلیت کی حامل ہے۔

اقبال نطشے کے بارے میں پیام مشرق میں اپنے ان خیالات کا اظہار کرتے ہیں

گر نواخواہی زپیش او گریز در نئے کلکش غریو تندر است
نیشتر اندر دلِ مغرب فشرد آتش از خونِ چلیپا احمر است
خویش را در نار آں نمرود سوز زانکہ بستانِ خلیل از آذر است

اقبال کے نزدیک نطشے کا دماغ کافر ہے۔ کیونکہ وہ خدا کا منکر ہے۔ لیکن بعض اخلاقی نتائج اسلام کے بہت قریب ہیں۔ ڈارون کے نظریہ ارتقاء سے پیدا ہونے والے حیوان، انسان اور جبر و مشیت کے تصورات کے خلاف نطشے نے جو آواز بلند کی تھی۔ اقبال اس کے تو ہمنوا ہیں لیکن وہ ان تصورات کو من و عن قبول نہیں کرتے بلکہ تعلیمات اسلام کی روشنی میں ان میں ترمیم، تنسیخ اور اضافے کرتے ہیں اس بنا پر ان کا تصور مرد مومن نطشے کے انسان برتر سے یکسر مختلف نظر آتا ہے۔

اقبال مسلک گوسفندی سے بے زار ہیں۔ اور اس کی ہجو اپنی مثنوی اسرار خودی میں بیان کی ہے۔ اس سے مراد ان کی صرف بعض فرقوں اور مذہبوں کی اس تعلیم سے ہے جو انسان کو ناکارہ بنا دیتی ہے۔ اور بجائے سخت کوشش، جہد مسلسل اور ہمت و عمل کے اسے پیام مجہولیت دیتی ہے۔ اقبال کی تلقین یہ ہے کہ انسان دنیا میں اللہ تعالیٰ کا نائب بن کر آیا ہے۔ اور خدا نے اُسے بہترین صلاحیتوں سے نوازا ہے علم و عشق سے کام لے کر معرفت خداوندی حاصل کرنا اور تسخیر کائنات کا فریضہ انجام دینا اس کا مقصد حیات ہے۔ محنت و ریاضت، تجسس و آگاہی اور ان تھک جہد و جہد دنیاوی اور روحانی دنیاؤں میں کامیابی کی ضامن ہے۔ اقبال کے کلام میں عظمت آدم کے تصورات واضح ہیں۔۔ اقبال کا مرد مومن اپنی خودی کے استحکام میں آزاد ہے۔ اور ان کا مثالی

مردِ مومن حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ہے۔ جو فرق پیغمبر اسلام حضور صلعم اور نپولین کی ذات میں ہے وہی فرق اقبال کے مردِ مومن اور نطشے کے "تصور فوق البشر میں ہے۔ یہ فرق بہت بڑا ہے۔ کیونکہ نطشے کا فوق البشر روحانیت سے عاری ہے۔ فقط مادی دنیا ہی اس کا میدان عمل ہے۔ کائناتی اسرار و رموز میں ترمیم کرنا اس کے بس کا روگ نہیں۔ جب کہ نگاہِ مردِ مومن سے تقدیریں بدل جاتی ہیں۔ اقبال کا مردِ مومن یقین و آگاہی کے درجہ کمال پر ہوتا ہے۔ وہ اپنی خودی کا استحکام ضبطِ نفس، اطاعت الٰہی اور نیابت الٰہی کے مراحل طے کرنے کے بعد کرتا ہے۔ وہ زماں و مکاں کو اپنے اندر جذب کر لیتا ہے۔ وہ جلال و جمال کا مجموعہ ہے۔ اپنے باطن سے نئے جہانوں کی تسخیر اس کا شیوہ ہے۔ وہ ایام کا مرکب نہیں راکب ہے۔ تمام عالم مومن جانباز کی میراث ہے۔ اس کی جلوت میں مصطفائی اس کی خلوت میں کبریائی ہے۔ اس کی خودی کی زد میں آسمان و کرسی اور عرش و خُدائی ہے۔ پختگی کردار اور عشق اس کے رگ و ریشہ میں سمایا ہوا ہے۔ وہ عمل پیہم یقین محکم کی تصویر ہے۔ سخت کوشی اور جاں بازی میں سیرتِ فولاد رکھتا ہے۔ وہ صفات قہاری و غفاری کا جامع ہے۔ معاملات دُنیا میں حریر و پرنیاں کی مانند نرم و گداز، رفاہ عامہ اور خدمتِ خلق کے لیے مستعد و تیار، سراپا رحمت و شفقت ہوتا ہے اس کا ہر عمل بے غرض بے لوث نفسانیت سے خالی اور ابنائے زمانہ کے لیے اس کا وجود باعثِ رحمت ہوتا ہے۔ فرماتے ہیں

عشق ہے اصلِ حیات موت ہے اس پر حرام — مرد خُدا کا عمل عشق سے صاحب فراغ

جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں — یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتح عالم

رزم حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن — ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم

یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان — قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت

اقبال کا مردِ مومن 'لا' کے ساتھ الا اللہ کا بھی قائل ہے۔ وہ ایمان و یقین کی بدولت رزم حیات میں کامرانی حاصل کرتا ہے۔ وہ اعلیٰ روحانی مقاصد کا امیں ہے۔ وہ سوز و ساز زندگی کا رمز

شناس ہوتا ہے۔ اسکا منتہائے مقصود ابنائے آدم کو فیض پہچانا ہوتا ہے۔ اقبال کے فلسفے میں اصل چیز دل ہے دماغ نہیں۔ روح حیات عشق ہے۔ عقل و استدلال نہیں اور عشق کا کام آزادی، تخلیق، علوئے درجات اور ارتقائے لامتناہی ہے۔ اقبال کے نزدیک نطشے کی وہی تعلیمات قابلِ قبول ہیں جو تعلیمات اسلامی سے مماثل ہیں۔ ان کے نزدیک نطشے ایک دیوانہ ہے جو شیشہ گروں کی کارگاہ میں لٹھ لے کر گھس گیا ہے۔ اور تمام سامانِ دلفریب کو اس نے چکنا چور کر ڈالا ہے۔ اقبال فرماتے ہیں:

اگر ہوتا وہ مجذوبِ فرنگی اس زمانے میں تو اقبال اس کو سمجھاتا مقامِ کبریا کیا ہے

نطشے کے تصورِ خودی اور اقبال کے تصورِ خودی میں بھی فرق ہے۔ اس لیے خودی کے بہترین مظہر دونوں کے نزدیک مختلف ہیں۔ اقبال کے ہاں خودی کے ساتھ بےخودی کا بھی تصور ہے۔ جو اُن کے مردِ مومن کے تصور کی تکمیل کرتا ہے۔ اور فرد کا معاشرے کے ساتھ مضبوط رشتہ استوار کرتا ہے۔ نطشے کے افکار سے یورپ حد سے زیادہ متاثر ہوا۔ اگرچہ خودی کے استحکام سے عظمتِ آدم کے نظریات کو فروغ حاصل ہوا اور علم و ہنر کے ذریعے یورپ نے ناقابلِ یقین حد تک تسخیرِ کائنات کا فریضہ انجام دیا۔ انسان سورج، چاند، ستاروں کی گزرگاہوں میں سفر کرنے لگا۔ مگر فوق البشر کے اس نظریے نے زمانے کو ہٹلر، اور جارج بش جیسے سفاک اور خود غرض افراد بھی دیئے جنہوں نے یورپ کے کئی علاقوں، افغانستان، عراق، ویت نام، بوسنیا فلسطین کی اینٹ سے اینٹ بجا کر رکھ دی۔ اور ایسے انسانیت سوز و شرمناک واقعات چشمِ زماں نے دیکھے۔ جن پر ہلاکو اور چنگیز کی روحیں بھی انگشت بدنداں نظر آتی ہیں۔ اس جہان آب و گل کی بقا کے لیے اقبال کے مردِ مومن کی ضرورت ہے۔ جو انسانیت کا درد اپنے قلبِ صمیم میں محسوس کر سکے اور اس کے مداوا کے لیے جان کی قربانی دینے سے بھی دریغ نہ کرے۔ یہ مردِ مومن وہی بن سکتا ہے جو سچے دل سے حضور پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اسوۂ حسنہ پر عمل پیرا ہو کر انسانیت کی خدمت کا حق ادا کر سکے۔ بقول اقبال "بغیر کسی روحانی شخصیت کے اس دُنیا کی نجات ممکن نہیں"

کتابیات

۱ کلیات اقبال فارسی

۲ کلیات اقبال اُردو

۳ مقالاتِ حکیم از ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم

۴ فکرِ اقبال کا تعارف از ڈاکٹر سلیم اختر

۵ اقبالیات کے سو سال از ڈاکٹر رفیع الدین عثمانی

۶ اقبال نئی تشکیل از عزیز احمد

۷ سرماہی اُردو اقبال نمبر ۱۹۳۸ء

۸ اقبال ریویو کراچی

۹ سرماہی اقبالیات لاہور

۱۰ اقبال یورپ میں از ڈاکٹر سعید اختر درّانی

محمد فیصل مقبول عجز

اقبال کی شخصی نظموں کا تسلسل: (غالب، داغ، حالی)

اقبال کا پہلا مجموعۂ کلام ''بانگِ درا'' کے نام سے پہلی بار ستمبر ۱۹۲۴ء میں شائع ہوا۔ سابق مدیر 'مخزن' شیخ عبدالقادر بیرسٹر ایٹ لاء نے اس کا دیباچہ تحریر کیا۔ اقبال نے اس مجموعہ کو تین حصوں میں تقسیم کیا۔ حصہ اوّل میں ۱۹۰۵ء تک کی نظمیں اور غزلیں ہیں۔ حصہ دوم میں بھی ۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۸ء تک کی نظمیں اور غزلیں شامل ہیں۔ حصہ سوم میں ۱۹۰۸ء سے۔۔۔۔ نظموں اور غزلوں کے علاوہ ظریفانہ کلام (اکبرالہ آبادی کے تتبع میں) بھی شامل ہے۔ بانگِ درا اقبال کے ابتدائی شعری افکار کا مجموعۂ اضداد ہے جس کے بارے میں وہ خود فرماتے ہیں۔

'ہے عجب مجموعۂ اضداد اے اقبال تو'

یہ ان کی شاعری کا وہ دور تھا جس میں وہ اپنے لیے ایک نئی راہ اور منفرد فنی منصب کے حصول کے لیے کوشاں تھے لہٰذا اس دور کی شاعری میں تنوع پایا جاتا ہے۔ اس مجموعہ کلام میں اقبال نے اپنے شعری نظریات کا اظہار بھرپور انداز میں کیا ہے۔ ان کا مشاہدۂ کائنات وفطرت بہت وسیع تھا جس کا برملا اظہار انہوں نے بڑی صراحت سے کیا۔ اقبال نے اس دور میں خواہ وہ ملکی حالات ہوں یا وارداتِ قلبی، شخصی حوالے ہوں یا فطرت نگاری، ان سب کو بڑی جاں فشانی سے شعری قالب عطا کیا۔ اس دور میں اقبال کے مدِ نظر وہ شعری منصب نہیں تھا جو بعد میں کلام اقبال (بالِ جبریل، ضربِ کلیم، ارمغانِ حجاز اور دیگر فارسی کلام) میں نظر آتا ہے۔

شیخ عبدالقادر دیباچۂ بانگِ درا میں رقم طراز ہیں ''یہ دعویٰ سے کہا جا سکتا ہے کہ اردو میں آج تک کوئی ایسی کتاب اشعار کی موجود نہیں ہے جس میں خیالات کی یہ فراوانی ہو اور اس قدر مطالب و معانی یک جا ہوں اور کیوں نہ ہوں۔ ایک صدی کے چہارم حصہ کے مطالعہ، تجربہ اور مشاہدہ کا نچوڑ

اور سیر و سیاحت کا نتیجہ ہے۔ بعض نظموں میں ایک ایک شعر اور ایک ایک مصرع ایسا ہے کہ اس پر ایک مستقل مضمون لکھا جا سکتا ہے۔" (۱)

اس دور میں اقبال انسان کے سب سے بڑے نصب العین کے حصول "اپنے فکر و عمل میں اور اپنے ماحول و معاشرہ میں کامل ہم آہنگی اور توازن پیدا کرنے" کے لیے کوشاں نظر آتے ہیں۔ اس ابتدائی دور میں اقبال نے مشرق و مغرب کے حالات و مسائل اور افکار و نظریات کا تنقیدی جائزہ لیا۔ اقوام مغرب کی باہمی نفرت و عداوت، لادین سیاست (سیاستِ افرنگ) کی منافقت اور چنگیزیت، مغربی معاشرت کی بوالہوسی اور مادہ پرستی، کمزور اقوام پر افرنگی استعمار کا غلبہ و تسلط اور نظریۂ وطنیت کی (پُر فریب) حقیقت سے آگاہی حاصل کی۔ اقبال نے بانگِ درا کے تین حصوں میں تقریباً ۱۸ شخصی نظمیں (۲) لکھی ہیں جن میں ان کی پسندیدہ شخصیات حضرت ابوبکر صدیق اور بلال رضی اللہ عنہم، اُستاد آرنلڈ دوست فضل حسین صاحب اور شیخ عبدالقادر، اُردو شاعری کے تین بڑے شاعر اور نثر نگار، غالب، داغ اور حالی و شبلی فارسی کے شاعر عرفی، انگلستان کے مشہور ڈرامہ نگار شیکسپیر، مذہبی شخصیات میں گرونانک اور شری رام چندر عوام الناس میں سے سوامی رام تیرتھ اور فاطمہ بنت عبداللہ شامل ہیں۔ اقبال بہت سی مذہبی شخصیات سے متاثر ہوئے لیکن شاعری کے اس ابتدائی دور میں اقبال نے حضرت بلالؓ سے اپنی والہانہ عقیدت کا اظہار بھرپور انداز میں کیا ہے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ خلیفہ اوّل، اسلام کی مشہور و معروف شخصیت ہیں۔ اقبال آپ کے ایثار کا ذکر اپنی نظم "صدیق رضی اللہ عنہ" میں بڑے خوبصورت انداز میں کرتے ہیں۔ اقبال کبھی مرزا غالب کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہیں تو کبھی استاد داغ کی وفات پر اپنے دلی جذبات کا اظہار کرتے ہیں۔ کبھی سرسید احمد خاں کی "لوحِ تربت" پر ان کی تعلیمات کو اپنی زبان میں بیان کرتے ہیں تو کبھی عبدالقادر (سابق مدیر مخزن) کو اپنے ارادوں سے آگاہ کرتے ہیں۔ یہی نہیں اقبال مختلف مذاہب کے رہنماؤں کا بھی احترام کرتے ہیں اور ان کے لیے عقیدت مندانہ خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔ سکھوں کے گرونانک ہوں یا ہندوؤں کے مذہبی لیڈر شری رام چندر، اقبال بڑی خوب صورتی

سے ان مذہبی شخصیات کی سیرت و کردار پر روشنی ڈالتے ہیں۔ کہیں ''فاطمہ بنت عبداللہ'' نظم میں مسلمانوں کو خوابِ غفلت سے بیداری کا سبق دیتے ہیں تو کبھی غلام قادر روہیلہ کے عزم و ہمت پر اظہارِ خیال کرتے ہیں۔ شبلی و حالی کی وفات، اقبال کو تڑپا دیتی ہے۔ اقبال کا قلم حرکت میں آتا ہے اور ان دو نابغۂ روزگار شخصیات پر نظم لکھتے ہیں۔ فارسی کے مشہور شاعر عرفی کی شخصیت سے اقبال کی دلی رغبت بھی نظم کی صورت میں ملتی ہے اور شیکسپیر کی انسانی فطرت نگاری کو بھی خراجِ تحسین پیش کرتے ہیں

اسداللہ خاں غالب (جہاں آباد کا فلسفی شاعر)

فارسی اور اُردو کا عظیم شاعر ندرتِ خیال و حسن بیان میں بے مثال۔ اقبال نے اپنے فلسفیانہ افکار کے اظہار کے لیے جن شعرا کے اسالیبِ فن سے استفادہ کیا ان میں غالب کو اولیتٌ حاصل ہے چنانچہ ۱۹۰۱ء میں غالب کو ایک نظم میں خراجِ تحسین پیش کیا۔ اقبال کو غالب کی مشرقیت سے خاص لگاؤ تھا۔ غالب کی شاعری فارسیت اور فلسفیانہ افکار کے سبب وہ قدر دانی اور پذیرائی حاصل نہ کر سکی جس کے وہ حق دار تھے اقبال اس کا اظہار مختلف طریقوں سے کرتے ہیں۔

گیسوئے اُردو ابھی منت پذیرِ شانہ ہے ——— شمع یہ سودائی دل سوزیٔ پروانہ ہے

بقول اقبال غالب یقیناً ان شعرا میں تھے جن کا ذہن اور تخیل انہیں مذہب اور قومیت کی تنگ حدود سے بالاتر مقام عطا کرتا ہے۔ شیخ عبدالقادر بانگِ درا کے دیباچہ میں غالب اور اقبال میں مماثلت کو یوں بیان کرتے ہیں۔ ''غالب اور اقبال میں بہت سی باتیں مشترک ہیں۔ اگر میں تناسخ کا قائل ہوتا تو ضرور کہتا کہ مرزا اسداللہ خاں غالب کو اردو و فارسی کی شاعری سے جو عشق تھا، اس نے ان کی روح کو عدم میں جا کر بھی چین نہ لینے دیا اور مجبور کیا کہ وہ پھر کسی جسدِ خاکی میں جلوہ افروز ہو کر شاعری کے چمن کی آبیاری کرے۔ اس نے پنجاب کے ایک گوشہ میں جسے سیالکوٹ کہتے ہیں دوبارہ جنم لیا اور محمد اقبال نام پایا۔'' (۳)

بقول شیخ صاحب اقبال، صحیح معنوں میں غالب کا نیا ڈکشن بن کر دنیائے علم وادب میں بام عروج حاصل کر گئے۔

زندگی مضمر ہے تیری شوخیِ تحریر میں تابِ گویائی سے جنبش ہے لبِ تصویر میں

اقبال کو غالب کے فلسفیانہ افکار سے بھی لگاؤ تھا لہٰذا انہوں نے غالب کے فلسفیانہ طرز بیان کو اپنے انداز سے خوب نکھار کر پیش کیا۔ غالب کو انسانی فطرت نگاری پر کامل عبور حاصل تھا دیوان غالب اس کا ثبوت ہے۔ اس حوالے سے اقبال بھی غالب کے معترف نظر آتے ہیں۔

دید تیری آنکھ کو اس حسن کی منظور ہے بن کے سوزِ زندگی ہر شے میں جو مستور ہے

اُردو شاعری کے عظیم فلسفی شاعر مرزا اسد اللہ خاں غالب کا تقابل گوئٹے (۱۷۴۹ تا ۱۸۳۲ء) (۴) سے کرتے ہوئے اقبالؔ نے غالب کو خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔ گوئٹے نے دیوانِ حافظ کے ترجمہ سے متاثر ہو کر ''مغربی دیوان'' مرتب کیا تو اقبال نے اس سے متاثر ہو کر فارسی زبان میں ''پیامِ مشرق'' تصنیف کی۔ جس کا ذیلی اور وضاحتی عنوان تھا ''درجواب دیوان شاعر المانوی گوئٹے''۔

آہ تو اُجڑی ہوئی دلی میں آرمیدہ ہے گلشنِ ویمر میں تیرا ہم نوا خوابیدہ ہے

دلی جسے جہاں آباد کے نام سے بھی یاد کیا جاتا تھا علم و ہنر کا گہوارہ رہا تھا۔ غالب کا قیام بھی جہاں آباد میں تھا اور وہ اپنے آخری سانس تک اس تاریخی شہر میں قیام پذیر رہے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے الم ناک واقعات و حالات میں بھی غالب اس شہر کو خیر باد نہ کہہ سکے اور اس میں رہتے ہوئے نا مساعد حالات کا سامنا کیا جن واقعات کی تفصیل خطوطِ غالب میں بڑی صراحت سے ملتی ہے۔ اقبال اسی جہاں آباد کو مخاطب کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

دفن تجھ میں کوئی فخرِ روزگار ایسا بھی ہے تجھ میں پنہاں کوئی موتی آب دار ایسا بھی ہے

اقبال نے یہ اعتراف کیا تھا ''میں نے ہیگل، گوئٹے، مرزا غالب، عبدالقادر بیدل

اور ورڈز ورتھ سے بہت کچھ استفادہ کیا ہے۔ ہیگل اور گوئٹے نے اشیا کی باطنی حقیقت تک پہنچنے میں میری رہنمائی کی۔ بیدل اور غالب نے مجھے یہ سکھایا کہ مغربی شاعری کی اقدار اپنے اندر سمو لینے کے باوجود اپنے جذبے اور اظہار میں مشرقیت کی روح کیسے زندہ رکھوں اور ورڈز ورتھ نے طالب علمی کے دور میں مجھے دہریت سے بچالیا۔'' (۵)

اقبال نے غالب سے استفادہ کیا جس کا اعتراف کیا۔ حقیقت بھی یہی ہے کہ غالب کی فلسفیانہ شاعری کو اقبال نے اپنے مخصوص اندازِ بیان اور منصب شعری سے پروان چڑھایا۔ غالب کے سامنے شاعری کا کوئی خاص مقصد نہیں تھا لیکن فلسفیانہ اندازِ فکر نے انہیں زندہ جاوید بنا دیا۔ اقبال نے اپنے فلسفیانہ اندازِ فکر سے مسلمانوں کو خوابِ غفلت سے جگانے کا کام لیا۔ نثر ہو یا نظم اقبال نے مسلمانوں کے عصری وسیاسی مسائل کو موضوع بنا کر عوام الناس میں شعور پیدا کیا۔ اقبال نے زندگی کے لیے ایک نصب العین کا تعین کیا اور اپنی تمام تر کوششوں کا رُخ اس جانب موڑ دیا۔ اس راہ میں کئی پڑاو آئے، ان میں ایک اہم پڑاو غالب کی فلسفیانہ شاعری سے ہو کر گزرتا تھا۔ اقبال دلی گئے تو اس عظیم شاعر کی قبر پر حاضر ہوئے اور نابغہ روزگار کو خراجِ تحسین پیش کیا (۶)

فصیح الملک داغ دہلوی (اُردو زبان کا بے مثل شاعر)

فصیح الملک مرزا داغ دہلوی، ۱۴ فروری ۱۹۰۵ء کو اس دنیائے فانی سے کوچ کر گئے۔ اقبال نے داغ کی وفات پر ان کے دیگر شاگردوں کی طرح نظم ''داغ'' لکھ کر انہیں خراجِ تحسین پیش کیا۔

چل بسا داغ آہ! میت اس کی زیبِ دوش ہے ۔۔۔۔ آخری شاعر جہاں آباد کا خاموش ہے

داغ کی شخصیت اصلاحِ زبان کی اس روایت سے منسلک تھی جس کا آغاز حاتم سے ہوا اور سودا، قائم، شاہ نصیر، ذوق سے ہوتے ہوئے داغ تک پہنچی تھی۔ اقبال خوش قسمت تھے کہ داغ کی شاگردی کے حوالے سے اصلاحِ زبان کی اس روایت کے امین تھے، جسے اقبال نے اپنے منفرد فلسفیانہ اندازِ فکر سے چار چاند لگائے۔

شیخ عبدالقادر ''بانگِ درا'' کے دیباچے میں داغ کے حوالے یوں رقم طراز ہوئے:

''شعرائے اُردو میں ان دنوں نواب مرزا خاں صاحب داغ کا بہت شہرہ تھا اور نظام دکن کے اُستاد ہونے کی حیثیت سے ان کی شہرت اور بھی بڑھ گئی تھی۔ لوگ جوان کے پاس جا نہیں سکتے تھے۔ خط وکتابت کے ذریعے دور ہی سے ان سے شاگردی کی نسبت پیدا کرتے تھے؛ غزلیں ڈاک میں اُن کے پاس جاتی تھیں اور وہ اصلاح کے بعد واپس بھیجتے تھے۔ پچھلے زمانہ میں جب ڈاک کا یہ انتظام نہ تھا۔ کسی شاعر کو اتنے شاگرد کیسے میسر آسکتے تھے۔ اب اس سہولت کی وجہ سے یہ حال تھا کہ سینکڑوں آدمی ان سے غائبانہ تلمذ رکھتے تھے اور انہیں اس کام کے لیے ایک عملہ اور محکمہ رکھنا پڑا تھا۔ شیخ محمد اقبال نے بھی انہیں خط لکھا اور چند غزلیں اصلاح کے لیے بھیجیں۔ اس طرح اقبال کو اُردو زبان دانی کے لیے بھی ایسے اُستاد سے نسبت پیدا ہوئی جو اپنے وقت میں زبان کی خوبی کے لحاظ سے فنِ غزل میں یکتا سمجھا جاتا تھا۔ گو اس ابتدائی غزل گوئی میں وہ باتیں تو موجود نہ تھیں جن سے بعد ازاں کلام اقبال نے شہرت پائی مگر جنابِ داغ پہچان گئے کہ پنجاب کے ایک دور افتادہ ضلع کا یہ طالب علم کوئی معمولی غزل گو نہیں۔ انہوں نے جلد کہہ دیا کہ کلام میں اصلاح کی گنجائش بہت کم ہے اور یہ سلسلہ تلمذ کا بہت دیر قائم نہ رہا۔۔ لیکن داغ کو ہمیشہ اس بات پر فخر رہا کہ اقبال بھی ان لوگوں میں شامل ہیں جن کے کلام پر انہوں نے اصلاح دی۔'' (۷)

اقبال کی کلام میں داغ دہلوی کی سلاستِ زبان (روزمرہ اور محاورہ) اور معاملہ بندی بھی ہے اور امیر مینائی کی مضمون آفرینی بھی ہے۔ علامہ نے داغ اور امیر دونوں سے کسب فیض کیا۔ اس زمانے میں داغ دہلوی کا کلام روزمرہ اور محاورہ، سلاستِ زبان کی وجہ سے مقبول تھا اور امیر مینائی اپنی مضمون آفرینی کے لیے دبستانِ لکھنؤ کی طرف سے مشہور تھے۔

داغ کے رنگ میں کہے گئے چند اشعار:

کم بخت اک نہیں کی ہزاروں ہیں صورتیں — ہوتے ہیں سو جواب سوالِ وصال کے

کہتے ہیں ہنس کے جائیے ہم سے نہ بولیے — قربان جاؤں طرزِ بیانِ ملال کے

اور کہیں امیر مینائی کی سی مضمون آفرینی ملتی ہے۔

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چن لیے　　قطرے جو تھے مرے عرقِ انفعال کے

لیا مغفرت نے تڑپ کر بغل میں　　کرامت تھی شرمِ گنہگار کیا تھی

کشادہ دستِ کرم جب وہ بے نیاز کرے　　نیاز مند نہ کیوں عاجزی پہ ناز کرے

اس دور کی غزلوں میں کہیں داغ کے لب ولہجہ کی شوخی اور زبان کی برجستگی وسلاست ہے تو کہیں امیر مینائی کی مضمون آفرینی اور صناعی نظر آتی ہے۔ اصلاحِ زبان کے حوالے سے ایک طرف اقبال داغ سے اور دبستانِ دہلی سے فیض حاصل کرتے رہے تو دوسری طرف جدت طرازی فن کاری، صنعت گری اور لب ولہجہ کی لطافت کے گر امیر مینائی سے سیکھتے رہے۔ یوں اقبال کی شاعری ابتدا ہی سے دبستانِ دلی ولکھنؤ کا حسین سنگم رہی۔

اور دکھلائیں گے مضموں کی ہمیں باریکیاں　　اپنے فکر نکتہ آرا کی فلک پیمائیاں
تلخیِ دوراں کے نقشے کھینچ کر رلوائیں گے　　یا تخیل کی نئی دنیا ہمیں دکھلائیں گے

داغ دہلوی کی شاعری پورے ہندوستان میں زبان زدِ عام ہو چکی تھی۔ رام پور کے دورانِ قیام داغ نے اپنے مخصوص انداز و بیان کا لوہا دلی ولکھنؤ کے شعرا سے منوالیا تھا۔ یہاں تک کے اس دور کے بیشتر شعرا داغ کے رنگ میں شاعری کی طرف مائل ہوئے۔ ان میں لکھنوی شعرا سرِفہرست تھے۔ بقول جوش ملسیانی: ''رام پور میں ان کی شاعرانہ شخصیت کا یہ عالم تھا کہ ہر مشاعرے پر چھا جاتے تھے۔ امیر مینائی خود کہا کرتے تھے غزل پر محنت کرنے سے کیا فائدہ مشاعرہ تو داغ ہی کے ہاتھ رہے گا۔ کہتے ہیں کہ ایک بار امیر مینائی نے داغ سے کہا: ہم تم ایک ہی زمین میں غزل لکھتے ہیں، ایک ہی زبان ہے ایک ہی توفی ہیں، ایک سے مضامین ہیں پھر یہ کیا بات ہے کہ تمہاری غزل میں جو چٹخارا ہے وہ ہماری غزل میں نہیں آتا۔ داغ نے کہا: مولانا کیا آپ نے کبھی کسی سے عشق کیا ہے؟ امیر مینائی نے کہا: لاحول ولاقوۃ۔ داغ بولے: بس تو پھر ایسی ہی غزل کہی جاسکتی ہے جیسی آپ کہتے ہیں۔'' (۸)

داغ کی شاگردی کے باوجود وہ اپنے اسلوبِ بیان کے لیے مخصوص لغوی اور لسانی شعور کے لیے منفرد اندازِ بیان کے طالب تھے۔

اقبال لکھنؤ سے نہ دلی سے ہے غرض ہم تو اسیر ہیں خمِ زلفِ کمال کے

''علامہ اقبال اعتدال وتوازن کے قائل تھے، نومشقی کے دور میں انہوں نے داغ سے اصلاح ضرور لی مگر تنہا داغ ہی ان پر اثر انداز نہیں ہوئے۔ انہوں نے اُردو اور فارسی کے قدیم اور جدید اساتذہ کے دواوین کا گہرا مطالعہ کیا جو محنت و ریاضت کا نتیجہ تھا۔'' (۹) آخرکار اقبال داغ اور امیر کی تقلید سے دُور ہوتے گئے۔

غالب کی طرح داغ دہلوی کو بھی دہلی سے دلی محبت تھی، دہلی اُجڑی تو انہوں نے ''شہر آشوب'' (۱۰) لکھ کر اپنے جذبات کا اظہار کیا۔ جہاں آباد کی محبت ہر باشندے کے دل میں جاں گزیں تھی۔ داغ بھی ان میں سے ایک تھے۔ دہلی میں انہوں نے اپنا بچپن گزارا تھا۔ مرزا فخرو کی وفات کے بعد وہ اپنے کنبہ کے ساتھ رام پور جا بسے۔ لیکن دہلی کی یاد ہمیشہ اُن کے دل ودماغ میں تازہ رہی۔ داغ کی وفات سے اردو شاعری میں جو خلا پیدا ہوا پھر اُسے کوئی شاعر نہ پورا کرسکا۔

پھر صبا سے کون پوچھے گا سکوتِ گُل کا راز کون سمجھے گا چمن میں نالۂ بلبل کا راز

تھی حقیقت سے نہ غفلت فکر کی پرواز میں آنکھ طائر کی نشیمن پر رہی پرواز میں

اقبال کے فلسفیانہ اندازِ فکر نے اُسے طائرِ لاہوتی بنا دیا اور پھر یہی طائر بزبانِ اقبال شاہین یعنی ملتِ اسلامیہ کی طاقت وقوت کی علامت بن کر اُبھرا۔ داغ نے جہاں آباد کے تعیش پسندانہ معاشرے کو (نہ صرف بہت قریب سے دیکھا تھا بلکہ وہ خود اس کا حصہ تھے) اپنے اشعار میں زندگی بخشی۔ داغ کے شعری محاسن جن میں ان کی شعری حقیقت نگاری بہت مشہور تھی، اقبال کے لیے بہت اہمیت کی حامل تھی۔ داغ نے صحیح معنوں میں دہلی کی تہذیب ومعاشرت کی عکاسی کی ہے۔ گو داغ معاملہ بندگی کا سہارا لیتے ہیں لیکن دوسرے معنوں میں وہ جہاں آباد کی تاریخ کے اہم

واقعات کو شعری قلب عطا کرتے رہے۔ اقبال داغ دہلوی کے اس فنی و فکری پہلو کی نہ صرف قدر کرتے تھے بلکہ ان کے اندازِ بیان اور سلاستِ زبان کے بھی قائل تھے لہٰذا ان کی وفات نے اقبال کو بھی سوگوار کر دیا۔ اقبال نے اپنے اشعار میں داغ مرحوم کو خراجِ تحسین پیش کیا۔ غالب مرحوم کی یاد میں بھی اقبال اسی قسم کے جذبات کا اظہار کر چکے تھے۔

اے جہاں آباد اے سرمایۂ بزمِ سخن ہو گیا پھر آج پامالِ خزاں تیرا چمن
وہ گلِ رنگیں ترا رخصت مثالِ بو ہوا آہ! خالی داغ سے کاشانۂ اُردو ہوا

داغ حیدر آباد (دکن) میں وفات پا گئے تو انہیں وہیں دفن کر دیا گیا۔ جہاں آباد کے اس آخری شاعر کو اس کے ہر دل عزیز شہر میں قبر بھی نصیب نہ ہوئی۔ اقبال اس حوالے سے یوں راقم طراز ہوئے۔

تھی نہ شاید کچھ کشش ایسی وطن کی خاک میں وہ مہ کامل ہوا پنہاں دکن کی خاک میں
اُٹھ گئے ساقی جو تھے مے خانہ خالی رہ گیا یادگارِ بزمِ دہلی ایک حالی رہ گیا

مولانا الطاف حسین حالی (اصلاحِ قوم و ملت کا داعی):

شیفتہ اور غالب کے شاگردِ رشید مولانا الطاف حسین حالی ۱۸۳۷ء میں بمقام پانی پت پیدا ہوئے اور ۱۹۱۴ء میں انتقال ہوا۔ ۱۹۰۴ء میں انہیں شمس العلما کا خطاب عطا کیا گیا۔ اپنے کلام کے لیے مقدمہ لکھا جو بعد میں علیحدہ سے کتابی شکل میں بعنوان ''مقدمہ شعر و شاعری'' شائع ہوا۔ یہ کتاب اُردو تنقید کی پہلی باقاعدہ کتاب تسلیم کی جا چکی ہے۔ حالی سر سید احمد خاں کی تحریک سے متاثر تھے۔ یہی وجہ ہے انہوں نے سر سید احمد خاں کی حیات پر ''حیاتِ جاوید'' کے نام سے کتاب لکھی۔ سر سید کی طرح حالی بھی اپنی قوم کو ترقی کی راہ پر گامزن دیکھنا چاہتے تھے۔ حالی ابتدا میں روایتی طرز پر شاعری کرتے رہے پھر ان کا قلم اصلاح قوم کی طرف مائل ہو گیا۔ حالی کا شعری نظریہ اور عقیدہ یہ تھا کہ اصلاحی اور مذہبی شاعری ہی اصلی شاعری ہے۔ بے مقصد شاعری کی کوئی

وقعت نہیں ہے۔ مقصدیت ہی ادب کی جان ہے بے مقصد ادب بے کار ہے۔ حالی کی نظر میں شعر کا کام قوم کو اصلاح کی طرف متوجہ کرنا اور اس کو پستی سے نکال کر ترقی کی راہ پر ڈالنا اس میں اچھا ذوق اور اچھے کام کی قدر پیدا کرنا ہے۔

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں　　اب دیکھیے ٹھہرتی ہے جا کر نظر کہاں
ہم جس پہ مر رہے ہیں وہ ہے بات ہی کچھ اور　　عالم میں تجھ سے لاکھ سہی تو مگر کہاں

اقبال اس دور کے جن شعرا سے متاثر تھے ان میں مولانا حالی کا نام سرفہرست تھا۔ حالی اصلاحِ قوم وملت کے بہت بڑے داعی اور سرسید احمد خاں کی تحریک کے علم بردار تھے۔ سرسید احمد خاں نے اُردو زبان کی ترویج کے لیے جو خدمات سرانجام دیں، اقبال ان کے سچے دل سے معترف ہیں جس کا اظہار انھوں نے اپنی نظم بنام "سرسید کی لوحِ تربت پر" (ماہنامہ مخزن لاہور کے شمارہ جنوری ۱۹۰۳ء میں شائع ہوئی) میں بھرپور طور پر کیا ہے۔ اقبال کو اس بات کا بخوبی اندازہ تھا کہ سرسید احمد خان نے جس اصلاحی کام کا ذمہ اپنے سر لیا تھا اسے مولانا نے بخوبی انجام دیا اور اپنی نظم ونثر میں ان اصولوں پر ہمیشہ کاربند رہے۔ اقبال نے مولانا کو ایک رباعی میں ان الفاظ کے ساتھ خراجِ تحسین پیش کیا

مشہور زمانے میں ہے نامِ حالی　　معمور مئے حق سے ہے جامِ حالی
میں کشورِ شعر کا نبی ہوں گویا　　جاری ہے مرے لب پہ کلامِ حالی

اقبال مولانا حالی اور مولانا شبلی کی ادبی اصلاحی وملی خدمات کے معترف تھے۔ ان دنوں حضرات نے شاعری کے علاوہ نثر میں بھی تاریخی، ادبی اور اصلاحی کتب تصنیف کیں جن میں اصلاحِ قوم اور عصر حاضر کے مسائل سے بحث کی گئی۔

قرآن پاک کا ارشاد ہے کہ "ہر ذی روح کو موت کا ذائقہ چکھنا ہے۔ جو اس دنیا میں آیا ہے اسے کچھ وقت گزارنے کے بعد اس دُنیائے فانی سے بالآخر جانا ہی ہے۔ دنیا کا قیام عارضی اور آخرت کا قیام ابدی ہے۔ انسان کا اصل اور حقیقی مقام جنت تھا جہاں سے وہ نکالا گیا۔ ہر مسلمان کا

عقیدہ ہے کہ وہ موت کے بعد اپنے اصلی مسکن (ٹھکانے) جنت میں جائے گا اور ہمیشہ کے لیے اس میں رہے گا۔ جب کوئی انسان اس دنیائے فانی سے چلا جائے تو بہت سے لوگوں کو سوگوار چھوڑ جاتا ہے۔ اقبال بھی ان نابغہ روزگار شخصیات کی وفات پر سوگوار تھے لہٰذا انہوں نے اپنے دکھ اور غم کا اظہار نظم ''شبلی وحالی'' میں کیا۔

شبلی کو رو رہے تھے ابھی اہلِ گلستاں حالی بھی ہو گیا سوئے فردوس رہ نورد

بقول ڈاکٹر سید عبداللہ ''سید صاحب کے اسلوب کی تین خصوصیات حالی کے اسلوب میں ملتی ہیں۔ اول سادگی، دوم منطقیت، سوم بے تکلفی۔ سرسید کے بیان کی سادگی، بے رنگ اور کرخت سادگی ہے مگر حالی کے بیان میں سادگی ہونے کے باوجود لطافت اور نفاست کا عنصر بھی ہے۔'' (۱۱)

حالی نے ''مدوجزر اسلام'' کے مقاصد پر روشنی ڈالتے ہوئے جو دیباچہ لکھا اس کا مفہوم کچھ یوں ہے۔ نظم جو کہ بالطبع سب کو مرغوب ہے۔ قوم کو بیدار کرنے کے لیے اب تک کسی نے نہیں لکھی۔ قوم کے لیے اپنے بے ہنر ہاتھوں سے ایک آئینہ بنایا ہے جس میں ملتِ اسلامیہ کے افراد اپنے خدوخال دیکھ سکتے ہیں کہ ہم کون تھے اور کیا ہوگئے۔ جو آج کل قوم کی حالت ہے اس کا صحیح صحیح نقشہ کھینچا گیا ہے۔ نظم کی تدوین مزے لینے اور داد لینے کے لیے نہیں کی گئی بلکہ عزیزوں اور دوستوں کو غیرت اور شرم دلانے کے لیے کی گئی ہے۔

اقبال نے اپنی نظموں 'شکوہ' اور جوابِ شکوہ میں جو حالی کی مسدس کو مدنظر رکھ کر ہی لکھی گئیں، ان ہی مقاصد کو موجودہ دور کے حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے اپنے مخصوص انداز بیان میں پیش کیا۔ حالی نے اپنی نظم مدوجزر اسلام مسدس کی ہیئت پر لکھی اقبال نے بھی اپنی نظموں کے لیے اسی ہیئت کا انتخاب کیا۔ یہ اقبال کی تخلیقی صلاحیتوں کا اعجاز تھا جس نے حالی کے بعد مسدس کی ہیئت پر دو لازوال نظمیں تخلیق کیں۔ صحیح معنوں میں مسدس کی ہیئت کو شہرت مرثیوں سے ملی اور آخر کار یہ ہیئت صرف مرثیوں کے لیے مخصوص ہو کر رہ گئی۔ انیس و دبیر نے مرثیے کے ساتھ ساتھ مسدس

کے فن کو اس بلند بام تک پہنچا دیا کہ کہ مرثیہ اور مسدس یک جان دو قالب ہو گئے اور یہ روایت بھی فروغ پائی کہ مرثیہ صرف مسدس کی صورت میں ہی کہا جا سکتا ہے۔

بانگ درا (اول، دوم، سوم) میں شامل تمام شخصی نظموں میں تنوع اور وسعت مطالعہ پایا جاتا ہے۔ اقبال نے جس کسی ادبی سیاسی یا مذہبی شخصیت پر نظم لکھی انہوں نے ان کے افکار اور تصانیف کا نہ صرف گہرا مطالعہ کیا بلکہ اس کی قدر و قیمت کا اندازہ کرنے میں اپنے ملی اور اصلاحی افکار سے بھی مدد لی۔ یہی وجہ ہے انہوں نے نو مشقی کے دور میں ایسے اشخاص پر نظمیں لکھیں جن سے وہ متاثر ہوئے تھے یا جن کے افکار و شخصیت میں اقبال کو اسلامی روایات کی جھلک نظر آتی تھی۔ ان شخصیات کے افکار سے متاثر ہو کر اقبال نے اپنے لیے ایک مربوط فلسفیانہ نظام مرتب کیا۔

حوالہ جات

۱ علامہ محمد اقبال (کلیاتِ اقبال اُردو) بہ اہتمام: اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، ناشر نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ص ۴۵۔۴۶

۲ بانگِ درا (حصہ اول، دوم، سوم)

۳ علامہ محمد اقبال (کلیاتِ اقبال اُردو) بہ اہتمام: اقبال اکادمی پاکستان لاہور ناشر نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ص ۳۵

۴ گوئٹے شاعر ڈرامہ نگار دانش ور اور سیاست دان تھا۔ اس کا مشہور ڈراما ''فاوسٹ'' جرمن ادب کا شہ کار تسلیم کیا جاتا ہے۔

5 ''شذرات، فکرِ اقبال'' مرتبہ ڈاکٹر جسٹس جاوید اقبال مترجم ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی۔ مجلس، ترقی ادب کلب روڈ لاہور، ص ۱۰۵

۶ خط بنام (مولوی انشاءاللہ خاں) ''کلیاتِ مکاتیب اقبال'' جلد اول، مرتبہ سید مظفر حسین برنی، پبلی شرز میاں مارکیٹ غزنی ۳، سٹریٹ اُردو بازار لاہور ص ۸۴۔۹۷

۷ علامہ محمد اقبال (کلیاتِ اقبال اُردو) بہ اہتمام: اقبال اکادمی پاکستان لاہور، ناشر نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ص ۳۷۔۳۸

۸ جوش ملسیانی، نقوش ۲ ص ۷۰

۹ پروفیسر لیاقت علی چوہدری اقبال کی لغوی اور لسانی بحثیں، اسد بشارت، وزیر آباد، ص ۲۹۹

۱۰ داغ کا 'شہر آشوب'

۱۱ ڈاکٹر سید عبداللہ رسالہ: کریسنٹ' اسلامیہ کالج ریلوے روڈ لاہور، ۱۹۶۹ء ص ۶۳۔۶۴

۱۲ ڈاکٹر سلیم اختر ''اقبال کا نفسیاتی مطالعہ اور دوسرے مضامین'' سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، ص ۱۳۶

پروفیسر ڈاکٹر محمد معز الدین

ہمارا تعلیمی محاذ اور موجودہ صورتحال

تعلیمی محاذ، صورتحال اور اصلاحی اقدامات پر گفتگو کرنے سے پہلے ہمیں ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں مسلمانوں کی شکست و ریخت کے بعد مسلمانوں کی کسمپرسی، بے سروسامانی اور قیام پاکستان کے عوامل پر نظر ڈالنا ہوگی۔ انگریزوں نے مسلمانوں کو مورد الزام ٹھہرا کر ان کے ساتھ ہر قسم کا ناروا سلوک روا رکھا۔ چنانچہ مسلمان معاشی بدحالی، کم ہمتی، بے علمی اور احساس کمتری کا شکار ہو کر نفسیاتی طور پر مغلوب ہو گئے۔ وہ انگریزی حکومت سے لاتعلق ہو کر اور انگریزی تعلیم کا بائیکاٹ کر کے مزید زبوں حالی میں مبتلا ہو گئے۔ ان کا مستقبل تاریک ہو گیا۔ ایسے پر آشوب دور میں سر سید علیہ الرحمہ جیسے دور اندیش مدبر اور مرد مجاہد نے ذلت و خواری کے منجدھار میں پھنسی ہوئی مسلمانوں کی کشتی کو ساحل مراد تک پہنچایا۔ بقول پروفیسر رشید احمد صدیقی ''بہ حیثیت مجموعی سر سید سے بڑا مسلمانوں کا محسن پچھلے دو سو سالوں میں ہندوستان میں پیدا نہیں ہوا۔'' مسلمانوں کو محرومیوں مستقبل کی ہولناکیوں اور خطرناک صورتحال سے محفوظ رکھنے کے لیے سر سید احمد خاں نے ایک تعلیمی اور اصلاحی پروگرام بنا کر ان کی بروقت رہنمائی کی۔ بلاشبہ اینگلو اورینٹل کالج کا قیام ان کا ایسا عظیم الشان کارنامہ تھا جو آگے چل کر مسلمانان ہند کی ایک بہت بڑی علمی درسگاہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی شکل میں ہماری تعلیمی تہذیبی ثقافتی اور ملی سرگرمیوں کا مرکز تحریک پاکستان اور تشکیل پاکستان میں سنگ میل ثابت ہوا اور برصغیر پاک و ہند میں مسلم ثقافت کا آئینہ دار بن گیا۔ یہاں جدید تعلیم کے ساتھ دینی تعلیم کو بھی مقدم رکھا گیا۔ وائسرائے ہند لارڈ کرزن نے بھی کالج کے دینی نصاب کو سراہتے ہوئے اپنی تقریر میں کہا تھا کہ ''تعلیم بغیر مذہبی بنیاد کے لاحاصل ہے۔''

سرسید احمد خاں کا یہ فقرہ ضرب المثل بن گیا کہ "فلسفہ ہمارے دائیں ہاتھ میں ہوگا۔ نیچرل سائنس ہمارے بائیں ہاتھ میں اور کلمہ لا الہ الا اللہ کا تاج ہمارے سر پر" انہوں نے انگریزی تعلیم اور جدید سائنسی علوم کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے کہا کہ تعلیم کے ساتھ تربیت بھی لازمی ہے۔ ان کے یہ الفاظ ملاحظہ ہوں۔ "صرف تعلیم سے آدمی انسان نہیں بنتا بلکہ تربیت سے بنتا ہے۔"

علامہ اقبالؒ کا بھی یہی خیال تھا کہ

"اگر علم کی قوت دین کے تابع ہو جائے تو انسانوں کے لیے سراپا رحمت ہے"

جدید انگریزی تعلیم نے ہمارے دین سے دوری پیدا کر دی ہے۔ ہم دین و دنیا میں توازن برقرار نہ رکھ سکے۔

گلا تو گھونٹ دیا اہل مدرسہ نے ترا   کہاں سے آئے صدا لا الہ الا اللہ

اس پس منظر میں ہم اگر اپنا جائزہ لیں تو دیکھیں گے کہ قیام پاکستان کے بعد تعلیمی محاذ پر ہم نے صحیح طور پر اپنا رول ادا نہیں کیا۔ پاکستان عصر حاضر کی واحد مملکت ہے جو اسلامی نظام کی تجربہ گاہ ہے۔ دو قومی نظریہ دراصل ہمارا نظریہ حیات ہے۔ پاکستان کی تشکیل جذبہ ایمانی اور جذبہ حریت پر مبنی ہے۔ پاکستان کی ترقی اور فروغ علم اسی پر منحصر ہے۔ افسوس کا مقام ہے کہ پاکستان کے وجود میں آتے ہی جدیدیت، ترقی پسندی، مغربیت حتیٰ کہ سیکولرازم کے نعرے بلند ہونے لگے۔ ہماری بنیاد ہی میں نقب لگائے گئے۔ اغیار کی شعبدہ بازی بیرونی سازشوں، عوام کی سادگی اور احساس محرومی کے سبب ہمارا ایک بازو ہم سے جدا ہو گیا۔ سقوط ڈھاکہ کا المیہ نہایت دلخراش تھا۔

تھے بہت بے درد لمحے ختم درد عشق کے   تھیں بہت بے مہر صبحیں مہرباں راتوں کے بعد

(فیض)

قیام پاکستان کو چھ دہائیوں سے زیادہ مدت گزر جانے کے بعد بھی ہم طرح طرح کے مسائل کے گرداب میں پھنسے ہوئے ہیں۔ زندگی کے دوسرے شعبوں کی طرح پاکستان میں ہمارا شعبہ تعلیم اور نظام تعلیم بھی گوناگوں مسائل و مشکلات سے دوچار ہے۔ شاید ہمیں اپنی صحیح سمت کا

پتہ نہیں۔ حد تو یہ ہے کہ ابھی تک ہم اپنی قومی زبان کو ذریعہ تعلیم نہ بنا سکے اور نہ ہی اسے دفتری زبان کی حیثیت سے رائج کر سکے۔

بریں عقل و دانش بہ باید گریست ☆

ابھی اس محاذ پر ہمیں بڑے بڑے کام سرانجام دینے ہیں۔ ہمارے تعلیمی منصوبے بنتے رہے مگر ان پر عمل درآمد نہ ہونے کے سبب ہماری شرح خواندگی بعد میں آزاد ہونیوالی ریاستوں سے بھی کم ہے۔ جنرل ضیاء الحق مرحوم نے ایک سیمینار میں خود فرمایا کہ ہم جب کوریا گئے تو ان کے وزیر تعلیم سے پوچھا کہ آپ نے کون سی تعلیمی پالیسی بنائی کہ آپ کی شرح خواندگی اتنی زیادہ ہے۔ جواب ملا کہ پاکستان کی تعلیمی پالیسی پر عمل کر کے۔ جنرل صاحب نے فرمایا کہ کاش ہم ان سے یہ سوال نہ کرتے! غالباً یہ پروفیسر شریف کی تعلیمی پالیسی تھی۔ الغرض ہمیں تعلیمی محاذ پر ابھی بہت کچھ کرنا ہے۔ فعال قومیں ترقی یافتہ ہیں ہم ذہنی و فکری پس ماندگی کے بھنور سے باہر نہیں نکل سکے ہیں۔ ''بہ بیں تفاوت رہ از کجاست تا بہ کجا''۔ بقول مولانا حالی

تن آسانیاں چاہیں اور آبرو بھی ۔۔۔۔۔ وہ قوم آج ڈوبے گی گر کل نہ ڈوبی

تاریخ شاہد ہے کہ ہمارے اسلاف نے تعلیمی میدان میں کیسے کیسے کارنامے انجام دیئے۔ انہوں نے اپنی تحقیقی کاوشوں سے دنیا میں بلند مقام حاصل کیا۔ مغربی دنیا آج انہیں کی تقلید کر کے بام ترقی پر پہنچ گئی ہے اور ہم پسماندہ رہ گئے۔ ابلیس نے اپنے سیاسی مریدوں کو ہدایت کی کہ

فکر عرب کو دے کے فرنگی تخیلات ۔۔۔۔۔ اسلام کو حجاز و یمن سے نکال دو

اہل حرم سے ان کی روایات چھین لو ۔۔۔۔۔ آہو کو مرغزار ختن سے نکال دو

(ابلیس کا فرمان۔ ضرب کلیم از علامہ اقبال)

☆ بات اب تو عقل و دانش پر رونے سے بھی آگے ماتم کرنے تک پہنچ چکی ہے کہ معاصر سیاسی قیادت جو علاقائیت گزیدہ اور تفرقہ نہاد ہی نہیں بلکہ تدبر باختہ بھی ہے ملک میں آٹھ قومی زبانیں آئین کے ذریعہ نافذ کرنے پر کمربستہ نظر آتی ہے جس کے لئے پاکستان کی قومی اسمبلی میں بل پیش کیا جا چکا ہے۔ (ادارہ)

کہا اقبال نے شیخ حرم سے — تہہ محراب مسجد ہو گیا کون ؟
صدا مسجد کی دیواروں سے آئی — فرنگی بتکدوں میں کھو گیا کون ؟
(اقبال)

آج بھی ہماری تعلیم ہماری قومی ضروریات سے ہم آہنگ نہیں۔ تعلیم، زراعت، تجارت، طب، انجینئرنگ، کمپیوٹر سائنس کے کس شعبے میں کتنے افراد کی کھپت ہوگی۔ اس کی باضابطہ پلاننگ یا اعداد وشمار نہیں۔ ہم ہوا میں تیر چلا رہے ہیں۔ ہماری علمی، فنی اور تکنیکی مہارت اس وقت تک بہتر اور مفید نہیں ہوگی جب تک کہ ہم اپنی قومی زبان کو ذریعہ تعلیم وتدریس نہیں بناتے۔ ضرورت ہے کہ انگریزی کی بالادستی کو ختم کر کے اور اس مسئلے پر سنجیدگی سے غور کر کے اس سے نبرد آزما ہوں۔ تعلیم کو ملی ضروریات ومقاصد کا ماحصل بنانا ہوگا۔ انگریزی زبان بلاشبہ ایک ترقی یافتہ اور بین الاقوامی زبان ہے۔ اس سے مفر نہیں۔ اسے ایک ثانوی زبان کی حیثیت سے ضرور پڑھایا جائے۔ مگر قومی زبان کو اس کا صحیح مقام دینا ہوگا۔ اولیت اسی کو دی جائے تعلیمی محاذ پر اس ناگفتہ بہ صورت حال کے پیش نظر اس میں مناسب تبدیلیاں لانی ہونگی۔ افسوس کہ تعلیمی محاذ پر ہمارا کردار قابل رشک نہیں۔ ذہنی اور فکری آزادی کا آفتاب ہمیشہ تعلیم گاہوں سے ہی طلوع ہوتا ہے۔

جب تک ہم مغرب کے بنائے ہوئے نظام تعلیم سے نجات حاصل کر کے اپنے معتقدات وضروریات کے مطابق ایک نیا نظام تعلیم مرتب نہیں کرتے ہم حقیقی آزادی سے بہرہ مند نہیں ہو سکتے۔ ممتاز قانون دان اور دانشور اے۔ کے بروہی مرحوم نے ایک بار کہا تھا کہ ''میرا ایمان ہے کہ پاکستان کی ترقی، خوشحالی اور شان وشوکت کی جنگ خواہ اس کے نتائج کچھ بھی ہوں، اس کے اسکولوں، اس کے کالجوں اور اس کی یونیورسٹیوں میں لڑی جائے گی۔ ان کی لائبریریاں ان کی لیبارٹریاں ہی میدان جنگ بننے والی ہیں'' اس محاذ پر حقیقی معنوں میں جنگ ہم نے باضابطہ شروع ہی نہیں کی ہے۔ یہ ایٹمی توانائی کا دور ہے۔ ایک دوسرے سے مسابقت کا دور ہے۔ سست گام پیچھے رہ گئے۔ ورنہ

رفتم کہ خار از پا کشم محمل نہاں شد از نظر　　　یک لحظہ غافل گشتم وصد سالہ راہم دُور شد

ہمیں اپنی موجودہ حالت پر محض سوچتے رہنا نہیں ہے بلکہ بر وقت عمل کی ضرورت ہے۔ قائد اعظم کے فرمان کے مطابق کام، کام اور فقط کام کرنا ہے۔ رنگ چمن بدل رہا ہے۔ فوری طور پر آبیاری کی ضرورت ہے۔

باغباں کچھ تو نے دیکھا بھی چمن کے رنگ کو　　　زرد پتے ہو چلے ہیں، پھول مرجھانے لگے

خدا کرے ہم اپنے نظام تعلیم میں بنیادی اور انقلابی تبدیلیاں لاسکیں تا کہ ہم اس آزاد و خود مختار پاکستان میں آبرو مندانہ زندگی گذارتے ہوئے منزل مقصود تک جلد پہنچ سکیں۔ اور کوئی طاقت ہمیں آنکھیں نہ دکھا سکے۔ دراصل ہم اپنے مسائل سے اب تک صرفِ نظر کرتے رہے ہیں ورنہ یہ مسئلہ عقدہ لاینحل نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ

ہر چارہ گر کو چارہ گری سے گریز تھا　　　ورنہ ہمیں جو دُکھ تھے بہت لا دوا نہ تھے　(فیض)

قلمی معاونین سے التماس

ہماری بہترین کوشش کے باوجود 'الاقربا' کی سطور میں حرفی و لفظی اغلاط کہیں کہیں رہ جاتی ہیں، جس کے لئے ہم معذرت خواہ ہیں۔ تاہم ان اغلاط کے اسباب میں ایک سبب یہ بھی ہے کہ ہاتھ سے لکھے مسودات پڑھنے میں اکثر دشواری پیش آتی ہے۔ ہم از حد ممنون ہوں گے اگر ہمارے فاضل قلمی معاونین اپنے مسودات ٹائپ شدہ صورت میں ارسال فرمائیں۔ (ادارہ)

محمد طارق غازی (آٹوا۔ کینیڈا)

سلطنتِ عثمانیہ کے بانی عثمان خاں کا خواب اور مورخین

بڑے خواب ارادہ کر کے نہیں دیکھے جاتے، اور نہ وہ سگمنڈ فرائڈ کے نقطۂ نظر والی نفسیاتی بدہضمی کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ وہ ایک الگ دنیا کی مروجہ زبان ہے جسے جاننے والے دنیا میں اسی طرح موجود ہوتے ہیں جیسے چین میں انگریزی بولنے والے اور برازیل میں ترکی سمجھنے والے مل جاتے ہیں یعنی ترکی کا وزیراعظم برازیل کے دورے پر آئے تو اس کی ترجمانی کے لیے کسی ماہر نفسیات کو نہیں بلایا جاتا، بلکہ ترکی زبان جاننے والے کی خدمات حاصل کی جاتی ہیں۔

سلطنت عثمانیہ کے بانی عثمان خاں غازی نے بھی ایک خواب دیکھا تھا یہ خواب بسیار خوری کے بعد کی بدہضمی کا نتیجہ نہیں تھا۔ کچھ افسانہ طرازوں نے اس اس میں شاعری ڈھونڈنے کی کوشش بھی کی لیکن شاعرانہ بات بجائے خود خواب آفریں نہیں ہوتی پھر جس نوعیت کی افسانہ طرازی عثمان خاں سے منسوب کی گئی ہے اس میں آدمی کی نیند تو اڑ سکتی ہے، خواب وہ کہاں سے دیکھے گا کہانی یہ بیان کی جاتی ہے کہ عثمان خاں اپنے دور کے ایک بزرگ شیخ اَدِہ بالی (۱) کی بیٹی سے شادی کرنا چاہتا تھا مگر شیخ اَدِہ بالی کسی حاکم وقت سے بیٹی کا نکاح کرنے پر رضامند نہ تھے۔ وہ عثمان خاں کے مربی اور مرشد بھی تھے اور اسی لئے عثمان خاں اکثر ان کے ہاں بلیجک میں قیام کرتا تھا ایک روز عثمان خاں نے ان کی خانقاہ میں قیام کے دوران ایک خواب دیکھا جس کو سن کر شیخ اَدِہ بالی نے اپنی بیٹی کی شادی مستقبل کے ایک عظیم شاہی خاندان کے ہونے والے سربراہ سے کر دی۔

یہ کہانی فقط اتنی بھی ہوسکتی ہے کہ اپنے شیخ کے زاویہ میں قیام کے دوران عثمان خاں کو مستقبل کی ایک جھلک دکھا دی گئی تھی۔ مغربی مورخین عموماً اس قسم کی راوایات کو مضحکہ خیز سمجھتے ہیں۔ اس

کے کئی اسباب ہیں اوّل تو وہ مشرقی تاریخ کے بارے میں عادتاً بدگمانیاں پیدا کرنے کو کار لائقہ سمجھتے ہیں (۲) ان کے مفسدہ پرداز قلم کے تیزاب سے شائد ہی کسی نمایاں اور ممتاز مشرقی، خصوصاً مسلم یا عرب تاریخی شخصیت یا حکمراں خاندان کو پناہ ملی ہو۔ بات شکایت کی نہیں کیونکہ شکایت اس بات کی کی جاتی ہے جس کی اصلاح اور درستی کا امکان ہو۔ بات محض ذکر واقعہ کی ہے اگرچہ یہ بھی حقیقت ہے کہ بہت سے مسلم مورخین نے تاریخی دیانتداری کے ساتھ معقول اور منطقی انداز میں ان غلط فہمیوں کا پردہ چاک کیا ہے اور تاریخ کو اس کے اصل پس منظر میں پیش کیا ہے، مگر بایں ہمہ اس پر حیرت نہیں کہ رد ہونے کے باوجود اس قسم کی مغربی تاریخیں متداول ہیں اور ان کو حوالہ کی کتابوں میں شمار کرنے کی غیر علمی جسارت بدستور جاری ہے۔

تاریخ کی تاریخ بطور علم

اہل مغرب کو تاریخ سے بطور علم کبھی کوئی دلچسپی نہیں رہی ابتدا میں ان کے ہاں بھی دنیا کے دیگر خطوں کی طرح کچھ وقائع نویسی کا رواج تھا، جس کے تحت کبھی کبھی ان قوموں کے احوال بھی بیان ہو جاتے تھے جن سے وقائع نویس کی قوم کو کچھ سابقہ پڑتا رہتا تھا، تاریخ ایک فن کے طور پر مسلم اہل علم کی دریافت ہے اور اس کا سبب یہ تھا کہ دنیا کی تمام دیگر مذہبی کتب کے برعکس مسلمانوں کی کتاب میں اس علم کی جانب بار بار توجہ مبذول کرائی جاتی رہی ہے اس موضوع پر دنیا کی پہلی سائنسی مذہبی کتاب قرآن حکیم، میں کم از کم ۲۷ آیات میں سے ۲۳ میں واضح حکم دیا گیا ہے کہ دنیا میں سیاحت کرو اور پتہ لگاؤ کہ تم سے پہلے جو قومیں ہوئی ہیں وہ کون تھیں، کیا تھیں، ان کی زندگی کیسی تھی، وہ لوگ مجرم تھے، فسادی تھے، ظالم تھے، جھوٹے تھے یا مصلحین، راست باز تھے؟ ان کے بعد ان کے وطنوں اور رہائشی زمینوں کا کیا حال ہوا؟ کیا ان کی بستیاں تباہ و برباد ہو گئیں، دنیا سے مٹ گئیں، یا وہ باقی رہ گئے اور ترقی پذیر رہے، یا وجود یا عدم دونوں صورتوں میں بس اپنے بعد آنے والوں کے لیے عبرت کی نشانیاں چھوڑ گئے؟

اس متواتر حکم نے بے شمار مسلمانوں کو دنیا کی سیاحت پر اکسایا، جن میں یعقوبی (م ۸۹۷)

،خورداد بہ (م ۹۱۲)، ابن فضلان (سفر شمالی یورپ ۹۲۰)، المسعودی (۹۵۶۔۸۹۶) البیرونی (۱۰۴۸۔۹۷۳۔ہندوستان و چین)، ابو زید (۹۷۶۔کمبوڈیا)، المقدسی (۱۰۰۰۔۹۴۵)، الادریسی (۱۱۶۵۔۱۱۰۰)، یاقوت حموی (۱۲۲۹۔۱۱۷۹)، ابوالفد (۱۳۳۱۔۱۲۷۳)، ابن بطوطہ (۱۳۶۹۔۱۳۰۴) شامل ہیں جن کا تعلق شمالی افریقہ، حجاز، شام، عراق، فارس خراساں، ہندوستان، چین سے تھا انھوں نے نہ صرف دنیا کے مختلف ملکوں کے سفر کئے بلکہ وہ ان کی معاشرت وعادات، کردار، تاریخ، جغرافیہ، عمرانی حالت، مقامی موسموں، پیداوار وغیرہ کے بارے میں بیش قیمت معلومات پر مشتمل ضخیم کتابیں دنیا کے واسطے چھوڑ گئے کہ آج تک عوام خواص ان سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ انسانی تاریخ میں اس سے پہلے اس قسم کے اکتشافی سفر وسیاحت کی باقاعدہ روایت نہیں پائی جاتی مورخین اعتراف کرتے ہیں کہ ان مسلم مسافروں اور سیاحوں سے پہلے کسی غیر ملکی نے چین، شمالی یورپ، روس، سکینڈینیویا، زنج (جنوبی افریقہ)، جزائر شرق الہند (ملایا، انڈونیشیا فلپین، کمبوڈیا) کا پتہ نہیں لگایا تھا۔

جس قوم کو بار بار دنیا کے احوال، ماضی کی کھوج کرنے کا حکم دیا جارہا ہو تو کیسے ممکن تھا کہ وہ تاریخ نویسی کی ذمہ داری بھی قبول نہ کرتی۔ چنانچہ مسلم اہل علم نے تاریخ نویسی کی سائنس مرتب کی، اس کے اصول وضوابط طے کئے، اور تحقیق کا حق ادا کیا ظاہر ہے اس کام کے لیے جہاں انہوں نے قدیم آثار کا معائنہ کیا، وہاں مختلف قوموں کی سینہ بسینہ روایات کی کھوج بھی لگائی۔ چونکہ اس کا قوی امکان تھا کہ لوگ اپنے ماضی کے بارے میں بات بڑھا چڑھا کر بیان کریں گے تو ان بیانات کی تنقیح اور صحت کا درجہ معلوم کرنے کے لئے مسلم اہل علم نے علم تاریخ میں بھی انہی اصول فن سے ایک درجہ میں استفادہ کیا جو وہ پہلے ہی فن حدیث کی تدوین کے وقت مرتب کر چکے تھے یعنی روایت کی صحت کا انحصار راوی کے ثقہ یا عدم ثقہ ہونے پر رکھا گیا۔ البتہ تاریخی بیانات کے سلسلہ میں فن اسماء الرجال کا یہ اصول مکمل طور پر منطبق نہیں ہوسکتا تھا، کیونکہ احادیث صرف مسلم راویوں سے حاصل کی جاتی تھیں اور حدیث کے ان راویوں کے صدق، راست بازی دیانت داری،

ثقاہت وغیرہ کی تمام شرائط کا اطلاق تاریخ ماضی کے ایسے راویوں پر ممکن نہیں تھا جو مسلمان نہ ہوں اور جو اپنے قومی ماضی کے احوال بیان کر رہے ہوں پھر بھی ایسے راویوں کے بارے میں بھی مسلم مورخین اتنا اطمینان تو کر ہی سکتے تھے کہ ان کے راوی سچ بولتے تھے یا عادی جھوٹے مشہور تھے، کردار کے اچھے تھے یا فریب اور مکر سے کام لینے کے عادی تھے، لوگوں میں ان کی بات کا اعتبار تھا یا بے اعتباری میں مشہور تھے۔

مسلم مورخین نے چونکہ تاریخ نگاری سے پہلے سوانح نگاری کا فن ایجاد کر دیا تھا تو اس ضمن میں ان کی توجہ کی مرکز سب سے پہلی شخصیت تو ظاہر ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تھی، کیونکہ سچائی، دیانت، حق پسندی کا معیار اور قابل تقلید نمونہ تو وہی ایک ذات والا صفات تھی آپؐ کے بعد صحابہ اور تابعین اور بعد کی نسلوں کے راویوں کے احوال جمع کیے گئے ان اولین انسانی سوانح کی تدوین میں مسلم مورخین نے ابتدا میں فن حدیث ہی کے اصول برتے بعد میں جب اس فن کی توسیع ہوئی تو مسلم مورخین کے اولین ماخذ قرآن، روایات رسول، ایام العرب، توراۃ کے بیانات اور اسرائیلیات اسی ترتیب میں قرار پائے اس طرح عرب مورخین نے جزیرۃ العرب، عراق و شام، اناطولیہ، قبرص، یونان، مصر، نوبیا، حبشہ، سواحل مشرقی افریقہ، زنج (جنوبی افریقہ) فارس، کرمان، خراسان، بلوچستان، سندھ مغربی سواحل ہند، سراندیپ (سری لنکا) چین، ملایا، جاوا، سماترا، کمبوڈیا، روس، بلغاریہ، فن لینڈ اور دیگر شمالی یورپی ممالک کے واقعات بھی ان خطوں سے قدیم تجارتی روابط و تعلق کی بنا پر جمع کر لیے۔ ایک اہم بات یہ ہے کہ ان ابتدائی مسلم مورخین نے ان تمام قوموں کے اساطیر، ان کے اصنام، اوثان اور بتوں پر مشتمل معبودوں کی تفصیلات کو نظر انداز کیا کیونکہ وہ ہدایت اور سرکشی کا فرق جانتے تھے ان کی نظر ان قوموں کی معاشرت، عمرانی اور سیاسی حالت، نیز تاریخی اور جغرافیائی تفصیلات اور ان کی ارتقائی یا تنزلی کیفیات کے اسباب پر مرکوز رہتی تھی۔

مغربی فلسفۂ تاریخ

مغربی تاریخ نویسی کا فلسفہ یہ ہے کہ تاریخ میں ذاتی خیالات اور پسند و ناپسند نیز رائے زنی کی اتنی آمیزش کر دی جائے کہ پھر حقیقت کا سراغ نہ لگ سکے اس فلسفہ کا شکار صرف اجنبی، دشمن اور ایشیائی افریقی اقوام ہی نہیں ہوئیں بلکہ خود یورپی اقوام کو بھی اس کے شر سے پناہ نہ مل سکی چنانچہ جہاں یہ مستشرقین اور جدید معاربین (arabists) کا امتیاز رہا ہے وہاں مثلاً ہسپانوی اور ہسپانوائی جنوبی امریکی اقوام کی تاریخ کو یا تو سرے سے نابود کر دیا گیا یا اس میں بھی تاریخ بالرائے کے نقطۂ نظر نے اتنی شرکاری کر دی کہ بسا اوقات خود متعلقہ قوم کے مؤرخیں اور اہل دانش کو بھی سچائی کا سراغ لگانا ممکن نہیں رہتا اور وہ اس جھوٹ کو سچ سمجھنے لگے ہیں جسے ان سے منسوب کر دیا جاتا ہے مغربی فلسفہ تاریخ کے اساطین میں خود بعض مغربی مورخین آرنلڈ ٹائن بی کو بھی شمار کرتے ہیں

جس طرح ۱۸۷۳ء میں مسلم ہندوستان کے بارے میں سر ہینری ایلیٹ کی ''یادداشتوں'' پر مبنی آٹھ جلدوں میں ''تاریخ ہند'' (بقول اس کے مورخین کے) (۳) نے وہ غیر تاریخی زہر بویا کہ آج تک اکثر مورخین ہند اس کے اثر سے جاں بر نہ ہو سکے، اسی طرح سلطنت عثمانیہ کی ایسی ہی ایک متداول تاریخ جو پچھلے سو سال سے مغربی درسگاہوں، تاریخ خوانوں اور تاریخ نویسوں کے پاس رائج ہے ہربرٹ ایڈمز گبنس کی دی فاؤنڈیشن آف دی اوٹومن امپائر (۴) ہے گبنس کی کتاب میں سب سے پہلے تو اس بات پر اعتراض کیا گیا ہے کہ عثمانی ترکوں کا کوئی بھی تعلق ترکان غز کے کئی قبیلہ سے تھا اس کا بلا دلیل گمان ہے کہ عثمانی ترک منگولوں کی طرح بت پرست یا فطرت پرست (Pagan) تھے اور منگولوں کے شامانی مذہب پر عمل پیرا تھے، نیز اناطولیہ پہنچنے کے بعد عثمان خاں نے اسلام قبول کر لیا تھا دوسری بات جو گبنس کہتا ہے وہ اپنی اصل میں برطانوی نسل پرستی کا شہکار کہی جا سکتی ہے گبنس کا خیال ہے کہ دولتِ عثمانیہ کی توسیع ایشیائی قوم کا کام نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ اس قابل کہاں ہو سکتے تھے کہ یورپ پر حکمرانی کریں۔ بلکہ یہ تو ان یورپی اقوام اور افراد کی کرشمہ کاری تھی جو مسلمان ہو کر عثمانیوں کی تائید میں اٹھ کھڑے ہوئے تھے اس مفروضہ کو سچ

ثابت کرنے کے لئے اور سلطنت عثمانیہ کی توسیع کا ادنیٰ سا بھی فائدہ اسلام یا مسلمانوں کو نہ دینے کے جذبے کی وجہ سے گبنس نے عثمان خاں اور اس کے اجداد کو کافر، شامانی، اور غیر غز ترک قرار دینے کی متواتر حماقتیں کیں۔

چند مغربی مورخین کے اعتراضات

عثمان خاں کے متذکرہ خواب کو بھی یہی مغربی مورخین 'بچگانہ قصے قرار دینے کی بچگانہ حرکتیں کرتے ہیں (۵) اس کا مقصد بھی سلطنت عثمانیہ کے عزت مندانہ وجود سے انکار یا کم از کم اس کی اہانت کا ایک پہلو تراشنے کی ایک مجہول خواہش کے سوا کچھ نہیں ہوتا گبنس کی اس بچگانہ کتاب کی غیر منطقی عبارت آرائی پر عہد جدید کے ایک محترم ترک مورخ محمد فواد کوپرولو نے مہذب پیرائے میں سخت گرفت کی ہے (۶) لیکن اس کے باجود عثمانیوں کی اصل کے بارے میں مغرب آج تک اپنے پیدا کردہ شبہات کا آپ ہی شکار ہے۔

پہلی بات تو یہ کہ اگر عثمان خاں اور اس کے باپ اور دادا منگولوں کے مذہب پر تھے تو انہیں منگولوں کے عروج و اقتدار کے زمانے میں وسطی ایشیا چھوڑ کر اناطولیہ آنے اور وہاں ایک مسلمان سلجوقی سلطنت کی ملازمت کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ ان لوگوں کو چین، ایران اور روس کے منگول درباروں میں بہت عزت کی جگہ مل سکتی تھی دوئم تاریخ میں ایسی کوئی روایت نہیں ملتی کہ اپنے ابتدائی دور اقتدار میں چنگیز، قبلائی، باتو اور ہلاکو وغیرہ نے اپنے ہم مذہبوں یا خود منگولوں کے خلاف جنگیں لڑی ہوں یا ان کی جاگیروں کو تاراج کیا ہو اس کے برعکس چنگیز نے ان چھوٹے چھوٹے منگول قبائل اور سرداروں کو یکجا کر کے ہی تو چین سے اناطولیہ اور روس سے پنجاب تک اپنی حکومت پھیلائی تھی سوئم، تو، کیا وجہ ہے کہ سلیمان شاہ، ارطغرل اور عثمان کو اُس نظام اور ان شہنشاہیتوں میں کوئی جگہ نہ ملی اور وہ منگولوں سے بچتے بچاتے ہوئے سلجوقیوں کے پاس نوکری کرنے پر مجبور ہوئے، چہارم، جنگ سیواس کے موقعہ پر ارطغرل کے لیے اپنے ہم مذہب منگولوں کی حمائت کی بجائے ترکوں کی تائید بھی گبنس کی کاریگری سے مشتبہ ہو جاتی ہے پانچواں سوال یہ

اٹھتا ہے کہ اگر ارطغرل نے نادانستگی میں منگولوں کے خلاف مسلم سلجوقی سلطان کی مدد کر دی تھی تو منگولوں سے مستقل نبرد آزما رومی سلجوقی سلطان علاء الدین کیقباد اور اس کے جانشینوں نے منگول مذہب پر عمل پیرا اس غیر مسلم قبیلہ پر کیسے اعتماد کر لیا اور پہلے سے قائم شدہ ترک بیلیقوں کے درمیان ایک نئی بیلیق قائم کر کے اس پر ایک غیر مسلم قبیلہ کو کیوں متعین کر دیا تھا؟ چھٹے غیر مسلم ہونے کے باوجود ارطغرل کو غازی کا لقب کیونکر ملا کیونکہ یہ لقب تو مسلم سپاہ کے لیے خاص ہے تاریخ میں ایسی کوئی روایت نہیں ہے جب غیر مسلموں کو جہاد کے لیے بھیجا گیا ہو اسلام میں غیر مسلم رعایا کو اصلاً اسی سے بری الذمہ کرنے کے لیے ہی تو زکوٰۃ کے مقابل کم تر رقم کا جزیہ عائد کیا جاتا ہے ساتویں ارطغرل اور عثمان خاں کا غیر مسلم شامانی ہونا پڑوسی غیر مسلم بیلیقوں سے چھپا نہیں رہ سکتا تھا تو کیا وجہ ہے کہ ان دیگر گیارہ مسلم بیلیقوں نے اس شامانی غیر مسلم قبیلہ کے خلاف اسی طرح جہاد نہیں کیا جس طرح وہ بیزنطینی حکام کے خلاف کرتے چلے آ رہے تھے آٹھویں، یہ بات تو ارطغرل اور عثمان خاں سے ڈھکی چھپی نہیں تھی کہ رومی سلجوقی سلطنت بھی اسی طرح کمزور ہو چلی تھی جیسے مغرب میں بیزنطینی سلطنت تھی اس کے مقابل تبریز میں مرکوز ایلخانی منگول حکومت ابھی طاقت ور تھی اور جنگ کوسی داغ (۶۴۱/ ۱۲۴۳) کے بعد تو سلجوقی رومی سلطنت ایلخانی منگول حکومت کی باج گزار بھی بن گئی تھی عثمان خاں شامانی رہتا تو وہ یورپ میں داخلہ کے منگول خواب کی تعبیر بن سکتا تھا تو اس نے اور ارطغرل نے ایک کمزور سلطنت کی باجگواری کیوں قبول کر لی، جب کہ ایلخانی حکومت کی سرپرستی کو ترجیح دینا شامانیوں کے لیے زیادہ معقول بات تھی۔

سوال یہ ہے کہ اگر گبنس اور اس کے خوشہ چیں (۷) نسبتاً غیر معروف تاریخ نویس اپنے تجزیوں میں درست تھے اور ہیں تو بھلا عثمان خاں کو اسلام سے رغبت کیوں ہوئی اس کا یہ فیصلہ ان تاریخوں کی رو سے بجائے خود ایک معمہ بن جاتا ہے جس کی کوئی دلیل نہیں بنتی۔ دراصل یہی وہ بنیادی بات ہے جس کے لیے ان مغربی افسانہ طرازوں نے تاریخ کے نام پر فساد پیدا کیا ہے اور اس کو برقرار رکھنے پر آج تک مصر ہیں۔

گبنس جیسے فاتر العقل تاریخ نویسوں کے نزدیک ارطغرل کو ایک بیلیق کا حاکم بنانے کے علاء الدین کیقباد اول کے اقدام کو شاید سیاست کہا جاتا ہوگا، لیکن کوئی غیر مسلم دانشمند سیاست داں بھی اس قسم کی حماقتیں کر کے بہت دیر اقتدار میں نہیں رہ سکتا تو یہ کیسے ممکن تھا کہ کیقباد اول نے ذرا بھی یہ نہ سوچا کہ ایک شامنی قبیلہ کا اس طرح جنگ میں مدد کر کے سلجوقیوں کا اعتماد حاصل کرنے کا مقصد سلطنت کے خلاف منگول سازش ہو سکتی تھی، کیونکہ اناطولیہ میں منگول استیلا میں رومی سلجوقی سلطنت ہی بڑی رکاوٹ تھی۔

مورخ بننے سے پہلے گبنس پہلی عالمی جنگ کے دوران کا ایک برطانوی سفارتکار افسر اور افسانہ طراز تھا جو دل سے سلطنت عثمانیہ کا کٹر دشمن تھا کیونکہ سلطنت عثمانیہ اس جنگ میں برطانیہ کے خلاف جرمنی کی حمایت میں شامل تھی۔ اس قسم کی نفرت کسی شخص کو مورخ کے پایۂ اعتبار سے گرا دیتی ہے اس حقیقت کے کھل جانے کے بعد گبنس کی روایات مشتبہ اور ساقط الاعتبار ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ سنجیدہ مورخین کے نزدیک اس کا مقام کہانیاں گڑھنے والے شخص کا سا رہ گیا ہے، تاریخ نویس کا نہیں اور اس لحاظ سے اس کی تمام روایات کو رد کر دینا لازم ٹھہرتا ہے خواہ اس کی دسیسہ کاریوں کی اشاعت آکسفرڈ جیسے ادارے ہی نے کیوں نہ کی ہو زیادہ حیرت بلکہ افسوس کی بات یہ ہے کہ اس عصر کے بعض مغربی مورخین کو بھی گبنس ہی کی بات سچی لگتی ہے، جس کا رد شریفانہ اسلوب میں کوپرولو نے کیا ہے مثلاً کوپرولو کے بیان کے مطابق پال وٹیک (Paul Wittek) نے گبنس کو مکمل طور پر مسترد نہیں کیا، مگر وہ اصرار کرتا ہے کہ سلطنت عثمانیہ کی توسیع کا بنیادی سبب غزو تھا، ترک اقبال مندی نہیں (۸)

خوابوں کے مختلف نظریات

عثمان خاں نے بلیجک میں واقع شیخ اَدہ بالی کی خانقاہ میں قیام کے دوان وہ متذکرہ خواب نہ بھی دیکھا ہو تو اس کی قائم کردہ ایک نہایت عظیم الشان سلطنت کی مجموعی حیثیت پر کوئی اثر نہیں نہیں پڑتا خواب دیکھا گیا ہو یا نہ دیکھا گیا ہو، اسے رد کرنے کے بعد بھی وہ سلطنت قائم ہوئی اور سات

سو برس تک یورپ کو سیاسی، اقتصادی، معاشرتی اور مذہبی طور پر متاثر کرتی رہی لہٰذا مغربی مورخین کا اس خواب کو بیگانہ قرار دینا خود کوئی معقول بات نہیں تاہم ان کے اس رویہ کا ایک نسلی اور مذہبی سبب ضرور ہے جسے سامنے رکھے بغیر اس ذہن کو سمجھنا دشوار ہے اور اسی وجہ سے ان کی لکھی ہوئی تاریخوں میں حقیقت وافسانہ کے مابین فرق کرنا ممکن نہیں

یہ تاریخی بیانیہ خوابوں کی منطق اور ان کی قسموں کے بیان سے راست تعلق نہیں رکھتا لیکن چونکہ مغربی مورخین نے خود ہی یہ موضوع چھیڑا ہے اور عثمان خاں کے خواب کی نفی کو ضروری سمجھا ہے اور اس ذیل کی روایات کی نکیر کی ہے، نیز بعد کے کچھ عثمانی سلاطین نے بھی سچے خواب دیکھے تھے اس لئے مناسب ہے کہ اس موضوع پر کچھ مختصر بات کی جائے۔

خواب دو قسم کے ہوتے ہیں، اور خوابوں کے سلسلہ میں دو نظریات ہیں۔ قسموں کے اعتبار سے ایک نوع سچے خوابوں کی ہوتی ہے جن کو تشریح وتعبیر کی ضرورت ہوتی ہے، اور دوسرے برے خواب ہوتے ہیں جن کے دیکھنے میں، بقول قاضی ابوب علی، شیطان کا دخل ہوتا ہے۔ یہ اسلامی نظریہ اسلام ہے جس کا ذکر احادیث نبوی میں آتا ہے، دوسرا حالیہ مادی نقطۂ نظر سے جو سگمنڈ فرائڈ نے پیش کیا تھا اس کی رو سے خواب نفسیاتی کیفیات کا آئینہ ہوتے ہیں۔ اس توضیح کی وجہ یہ ہے کہ مادی، نفسیاتی اور مذہبی ہر اعتبار سے مغربی اقوام سچے خواب دیکھنے کی اہل نہیں ہیں، یہی وجہ ہے کہ ان کے تجربہ میں یہ بھی نہیں کہ کوئی بھی شخص سچے خواب دیکھ سکتا ہے۔ سچے خواب دیکھنے کی پہلی بنیادی شرط دل کی سکینت ہے اور اس کی شرط اول دل میں ایمان کی موجودگی ہے۔ چونکہ خواب کو نبوت کا چھیالیسواں حصہ قرار دیا گیا تو یہیں یہ معاملہ طے ہو جاتا ہے کہ نبوت چونکہ ایمان سے مشروط ہے اس لیے رویائے صادقہ بے ایمانی کی کیفیت کے ساتھ نہیں دیکھے جا سکتے اور اسی بنا پر اہل مغرب رویائے صادقہ نہیں دیکھ سکتے۔

یہی وجہ ہے کہ جب اسلامی تاریخ میں مختلف مشہور لوگوں کے خوابوں کا تذکرہ آتا ہے تو مغرب کے اہل دانش بھی ان کو ایک ارفع انسانی خصوصیت کے طور پر قبول کرنے کی صلاحیت سے

عاری ہوتے ہیں اور ان کا انکار کر دیتے ہیں۔ اسی لئے ان مورخین نے مسلم علماء اور حکمرانوں کے خوابوں کو رد کرنے میں تامل محسوس نہیں کیا حالانکہ تمام مغربی ملکوں میں تقریباً سب لوگ ستاروں اور مفروضہ آسمانی برجوں سے قسمت کا حال جاننے، کانچ کے گولے میں مستقبل کی شبیہ دیکھنے والوں کی پیش گوئیوں پر احمقانہ حد تک یقین رکھتے ہیں یہ باور نہ کرنے کی کوئی عقلی وجہ نہیں کہ توہم پرستوں کے اس سفیہانہ گروہ میں وہ سارے مغربی مورخین بھی شامل ہیں جو مسلم حکمرانوں کے خوابوں کے بیانات کو مسلم تاریخ کے بچگانہ قصے سمجھتے ہیں۔

عثمان خاں کا خواب خاصا واضح تھا اس نے دیکھا کہ شیخ اُدہ بالی کے سینہ سے ایک ہلال طلوع ہوا جو عثمان کے سینہ میں داخل ہو گیا پھر عثمان کے سینہ سے ایک درخت نمودار ہوا جس کا سایہ ساری دنیا میں پھیل گیا اور اس کے سائے میں چار دریا اور مختلف قوموں کے لوگ اور گھوڑے دکھائی دئے اس خواب میں اور بھی کچھ اشارات کی روایات بیان کی جاتی ہیں۔ بیدار ہونے پر عثمان خاں نے اپنا خواب شیخ ادہ بالی کو سنایا، انہوں نے تعبیر دی کہ ہلال سے مراد ان کی صاحبزادی ،ملہون خاتون (مال خاتون بالا خاتون یا ربیعہ خاتون) تھیں اور درخت ایک عظیم الشان سلطنت کی علامت تھا جس پر عثمان خاں کی اولاد حکمراں ہوگی۔ چار دریا دجلہ، فرات، نیل اور ڈینوب تھے جو عثمان خاں کی سلطنت میں شامل ہوں گے اور ان دریاؤں کے علاقوں میں بسنے والی مختلف اقوام اس سلطنت کے سایۂ عاطفت میں رہیں گی۔ اس خواب کے بعد شیخ ادہ بالی نے اپنی صاحب زادی کا نکاح عثمان خاں سے کر دیا جس کے بطن سے علاء الدین کی ولادت ہوئی جو عثمان کا بڑا بیٹا اور دوسرے عثمانی سلطان ارخان کا وزیر اعظم تھا۔

دین و دنیا کے امتزاج کا منفرد سلسلہ

شیخ ادہ بالی کا تعلق اخی سلسلہ سے تھا وہ اپنے سلسلہ کے شیخ تھے یہ منفرد سلسلہ صرف اناطولیہ میں پایا جاتا تھا جو بیک وقت صوفیاء اور اہل دین کا سلسلہ بھی تھا اور اہل حرفہ کی انجمن بھی اور ممکن ہے بعد میں جب یورپ میں صنعتیں بننی شروع ہوئیں تو وہاں ٹریڈ گلڈز کا سلسلہ اناطولیہ کے اسی اخی سلسلہ کا چربہ ہو۔

اخی سلسلے سلجوقی رومی دور میں ہی قائم ہو چکے تھے ان سلسلوں سے وہی لوگ وابستہ ہوتے تھے جن کا تعلق کسی حرفت یا صنعت سے ہوتا تھا اور ان کی یہ بظاہر دنیادارانہ انجمنیں صفائے قلب اور پاکیزگیٔ نفس کا بھی یکساں اہتمام کرتی تھیں ان کا کام اور نظام دینی، تجارتی اور سیاسی انتظامی، ہمہ قسم کا تھا سلجوقی رومی دور میں جب وسطی ایشیا سے ترک مہاجرین اور پناہ گزین اناطولیہ کا رخ کر رہے تھے تو ان کے قیام وطعام نیز آبادکاری کے ذمہ دار یہی اخی سلسلے ہوتے تھے نقل وطن کرنے والے انہی اخوان کی خانقاہوں اور زاویوں میں قیام کرتے جہاں ان کو بلا قیمت کھانا اور قیام گاہ مہیا کی جاتی تھی اور پھر انفرادی ذوق اور مزاج کے مطابق ان کے روزگار اور مستقل قیام کا انتظام کیا جاتا تھا مختلف حرفتوں اور مختلف قسم کے تاجروں کے اپنے اپنے اخی سلسلے تھے جن کو مسلم سلاطین کے طرف سے معافی کی زراعتی زمینیں فراہم کی جاتی تھیں زاویوں میں غیر شادی شدہ اخی رہتے تھے جو دن میں ان زمینوں پر زراعت کرتے یا تجارتوں اور حرفتوں میں مشغول رہتے اور دن ڈھلے آمدنی شیخ سلسلہ کے پاس جمع کروادیتے جن سے خود ان افراد کے کھانے اور دیگر ضروریات کی تکمیل بھی ہوتی تھی اور مہمانوں اور مہاجروں اور پناہ گزینوں کی کفالیت بھی کی جاتی تھی (۹)

عثمان خاں نے بھی مختلف اخی بزرگوں کی خانقاہوں کے لیے جاگیریں اور زمینیں عطا کی تھیں شیخ اَدہ بالی کو بلیجک کا علاقہ دیا گیا تھا وہیں ان کی خانقاہ اور قیام تھا اسی خانقاہ میں ایک بار قیام کے دوران عثمان خاں نے ایک شب وہ خواب دیکھا تھا جس کو اسلامی اصطلاح میں مبشرات میں شمار کیا جاتا ہے۔

کتابیات

۱۔ مقاتل ڈاٹ کوم (www.moqatil.com) پر دولۃ عثمانیہ کے باب میں ان کا نام شیخ ادہ بالی لکھا گیا ہے۔ رابطہ ادباء الشام (www.odabasham.net) میں نام شیخ ادب عالی لکھا گیا ہے۔

۲۔ ایلیٹ، ہیزی ایم، دی ہسٹری آف انڈیا ایز ٹولڈ بائی اٹس اون ہسٹوریئنس، آٹھ جلد، (بعداز مرگ یا دداشتیں، مرتب کردہ از جان ڈاسن، لندن، ۱۸۷۳، Elliot, Henry M.The History of India as told by its own historians,(Posthumous Papers,edited and continued by prof John Dowson, London,1873.

۳۔ دیکھئے حوالہ بالا

۴۔ کلیمنٹ ہوارٹ Clement Huart: Thanks to Gibbons' work "we have escaped from the childish tales surrounding the The Foundation of the Ottoman Empire بحوالہ کوپرولو، محمد فواد، دی اوریجنس آف دی اوٹومن امپائر، ص ۱۔۲ (beginning of Ottoman history (Oxford/by H[erbert] Gibbons

۵۔ کوپرولو، ایضاً

۶۔ دیکھئے کوپرولوص ۱۔۲: جرمن ترکیاتی الیف گیزی، رڈولف چوڈی، ڈبلیو لینگر، آر پی بلیک، جے ایچ کریمرس، سب گبنس کے ہمنوا ہیں اگرچہ ان میں کسی کا کوئی مقام بطور سنجیدہ مورخ کے نہیں ہے۔ German Turkologist F Giese,Rudolf Tschudi, W L Langer, R.P. Blake, J H Kramers ہے۔

۷۔ پال وٹیک، دی رائز آف دی اوتومن امپائر: سٹڈیز اون دی ہسٹری آف ٹرکی، تھرٹینتھ۔ ففٹینتھ سینچریز Wittek,Paul: The Rise of the Ottoman Empire: Studies on the History of Turkey 13th-15th centuries(1938)

۸۔ ایضاً

۹۔ انالجک، دی اوٹومن امپائر، ص ۱۵۲۔۱۵۱

شفق ہاشمی

ہند آریائی تہذیب کا تاریخی پس منظر اور دیومالائی شخصیات

گزشتہ دنوں کسی جریدے میں ایک تحریر نظر سے گزری جس میں بابری مسجد تنازعہ کے حوالے سے ہندو تہذیب کو لاکھوں برس قدیم ثابت کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ حقیقت جبکہ یہ ہے کہ ہندومت اور اس کی مذہبی کتابوں اور شخصیات سے متعلق جو کچھ ہم تک پہنچا ہے اس میں ''حقائق'' کم اور افسانے زیادہ ہیں۔ اگر ہندو ودوانوں نے اپنی تہذیب کو لاکھوں سال کے مختلف ادوار پر تقسیم کیا ہے تو یہ بھی انہی افسانہ طرازیوں کا تسلسل ہے

آریا اور ان کا تاریخی پس منظر: حالات وواقعات کا تاریخی پہلو سے جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اغلباً یہ قوم سام ابن نوحؑ کی نسل سے ہے۔ تقریباً ساڑھے تین ہزار برس قبل یہ لوگ ایشیائے کوچک میں واقع سلسلۂ کوہ ارارات کے دامن میں آباد تھے۔ جس کی سب سے اونچی چوٹی جُودی پر کشتی نوحؑ آ کر ٹھہری تھی۔ آریا بنیادی طور پر دشت نورد یا خانہ بدوش تھے۔ اپنے مال مویشی کے لیے چراگاہیں کم پڑ جاتیں یا پانی اور غذا کا مسئلہ ہوتا تو پڑوسی علاقوں کی طرف نکل جاتے۔ اس طرح صدیوں پہلے اس کی ایک شاخ مغربی یورپ میں جرمنی کی جانب کوچ کر گئی بعد میں جس سے انڈو جرمینک نسل چلی۔ اسی دوران یا اس کے بعد ان کا دوسرا بڑا جتھہ نقل مکانی کرتا ہوا مشرقی سمت چل پڑا۔ تعداد میں زیادہ ہونے کی بناء پر یہ لوگ جہاں جاتے وہاں کے وسائل اور اقوام کو تہس نہس کرتے اور جب تک پانی، غذا اور چارے کی فراوانی رہتی اسے بے دریغ استعمال میں لاتے اور جب یہ وسائل کم پڑنے لگتے تو بچی کھچی مقامی ثروت کا نگراں بنا کر اپنی نسل کا ایک حصہ وہاں چھوڑتے ہوئے یہ آگے بڑھ جاتے۔ اس نسل کے جو لوگ پیچھے رہ جاتے وہ قدرتی طور

پر وہیں کی بود و باش اختیار کر لیتے لیکن بجائے مغلوب اقوام میں ضم ہونے یا انہیں خود میں ضم کرنے کے انہیں اپنا باج گزار اور محکوم بنا کر رکھتے تا آنکہ وہ یا تو ان کا ایک پس ماندہ طبقہ بن کر زندگی کے دن کاٹنے پر مجبور ہو جاتے یا پھر دست برد زمانہ کی نذر ہو جاتے۔

گھاٹ گھاٹ کا پانی پیتا آریاؤں کا یہ ٹڈی دل تقریباً ۱۳ صدی قبل مسیح سے دو صدی قبل مسیح کے دوران ایران، خراسان، بجستان (موجودہ افغانستان) کو تہ و بالا کرتا وادی سندھ میں داخل ہوا۔ ان کی مسلسل آمد کا یہ طویل دورانیہ اس بات کا گواہ ہے کہ کسی سرزمین کو اس عرصے میں اپنی سرزمین سمجھ کر یہ کہیں ٹِک کر نہیں رہے تا آنکہ وادی گنگ و جمن ان کا مستقل ٹھکانہ ٹھہرا۔ دوآبۂ گنگ و جمن کے برعکس وادی سندھ ہزاروں سال پرانی تہذیب و تمدن کا گہوارہ تھی۔ ہم میں سے بہت کم لوگ اس حقیقت سے واقف ہیں کہ چار ہزار سال قبل مسیح سندھ اور وادی نیل معاصرانہ تہذیبی رشتوں میں مربوط تھے۔ رمسیس دوئم عہد کے مصر کو کپاس، کپاس کی مصنوعات اور کپاس کے بیج پہلے پہل یہیں سے پہنچے جہاں نیل کے پانیوں نے وہ فصل اُگائی کہ دنیا نے دیکھا۔ بادبانی کشتیوں کی آمد و رفت میں وہاں سے جو چیزیں وادی سندھ پہنچتیں ان میں سیپ اور موتیوں کے ہار، زیوات اور بناؤ سنگھار کے سامان شامل ہوتے۔ مگر بھلا ہو آریا یلغار کا کہ وہی تہذیب پھر موئن جو دڑو اور ہڑپہ کے کھنڈروں میں تبدیل ہو گئی۔ یہ الگ بات کہ قسام ازل کو کچھ اور ہی منظور تھا اور پھر چند صدی بعد اسلام کی ضیاء پاش کرنوں سے یہ خطہ یوں جگمگایا کہ رفتہ رفتہ پورے برصغیر کی دنیا بدل گئی۔ ۱۰ رمضان مبارک ۹۳ ہجری (۷۱۲ سنہ میلادِ مسیح) میں فتح سندھ کے بعد یہی تباہ حال سرزمین جو بحری قزاقوں کی آماجگاہ تھی باب الاسلام بن کر آنے والے درخشاں دور کی نوید بن گئی۔

وادی سندھ سے آخر کار آریا قوم دوآبۂ گنگ و جمن میں اُتری اور پھر اُسے یہ دھرتی اپنی آئندہ نسلوں کے لیے بہترین ٹھکانہ نظر آئی۔ تہذیبی لحاظ سے قلاش او معاشی لحاظ سے استحصالی اس قوم کے لیے یہ دوآبہ جو پسماندہ اقوام کا مسکن تھا اور جہاں غذائی اجناس کی فراوانی تھی بہترین مرکز ثابت ہوا۔ یہیں ان کا صنمیاتی زدہ طبقاتی نظام پھلا پھولا اور اُس تہذیب نے جنم لیا جسے مورخ ہند

آریائی تہذیب کے نام سے تعبیر کرتا ہے۔ اسی تہذیبی اور سیاسی مرکز کو بعدازاں آریہ ورت کا نام ملا۔ سیاسی لحاظ سے ان کی عملداری شمالی اور وسطی ہند تک محدود تھی لیکن اپنے عہد کی غالب تہذیب ہونے کے ناطے ان کے اثرات آہستہ آہستہ دیار ہند کے طول وعرض تک پھیل گئے۔ مقامی پس ماندہ اقوام جو نسلاً کول، بھیل، سنتھال اور دراوڑ وغیرہ پر مشتمل تھیں انہیں رگید کر مشرق اور جنوب کی دشوار گزار گھاٹیوں، جنگلوں اور دلدلی علاقوں تک محدود کر دیا گیا۔ جنہوں نے انہیں آقا تسلیم کر کے ان کے زیرِ تسلط رہنا غنیمت جانا کہ ان کے پاس کوئی دوسرا متبادل تھا ہی نہیں ان قوموں کے افراد کو آریا معاشرے میں سب سے نچلی سطح پر شودر، ملیچھ اور اچھوت بن کر زندہ رہنے کا حق عطا کیا گیا۔ یہی وہ اقوام ہیں جو عددی لحاظ سے ہندوؤں کا اکثریتی طبقہ ہونے کے باوجود آج ''دلیت پنتھرز'' اور دیگر ناموں سے بھارت کے حکمران برہمن اور اس کے دست و بازو کھشتری اور ویش طبقات کے خلاف اپنے حقوق کی مسلح جنگ لڑنے پر مجبور ہیں۔ کہنے کو ان پس ماندہ طبقات میں سے چند شخصیات نے آزادی ہند کے بعد اپنی ذاتی صلاحیتوں یا سیاسی کاسہ لیسی کی بدولت بھارتی معاشرے میں کسی حد تک نمایاں مقام حاصل کرنے میں کامیابی بھی حاصل کی، جیسے دستور ہند کے مصنف ڈاکٹر امبیدکر اور نہرو کے قریبی ساتھی جگ جیون رام، لیکن ان کے لیے عمومی فضا آج بھی کم وبیش ویسی ہی ہے جیسی صدیوں پہلے تھی ان کی آبادیاں الگ، پن گھٹ الگ اور دھارمک استھان الگ۔ گاندھی کی بخشی ہوئی عرفیت ''ہری جن'' (اولادِ خداوند) بجائے خود اب اچھوت کا مترادف بن گئی ہے۔ یہی وہ اعزاز تھا جس کی پاداش میں بنیاذات کے گاندھی جی کو ایک برہمن ناتھورام گوڈسے نے ہلاک ڈالا۔

''انسائیکلو پیڈیا آف ریلیجن اینڈ ایتھکس'' کی شہادت کے مطابق آریا تہذیب ابتداء ''ایک خدانا آشنا ثقافت تھی۔ ان کے پاس چند ویدی روایات کے سوا کوئی باضابطہ پوجا پاٹ کا نظام نہیں تھا۔ ان کا موجودہ صنمیاتی نظام مرہون منت ہے ان مذہبی رسوم ورواج کا جو انہوں نے اپنی بادیہ

پیمائی کے دوران مغربی ایشیا یعنی سرزمین عراق و فلسطین اور مصر کی اپنے وقتوں کی تہذیب یافتہ اقوام سے مستعار لیا:

("Encyclopaedia of Religion and Ethics, Article, vol. 2, pp.12-57)

درج بالا حقائق کی روشنی میں یہ تصور تو از خود غلط ثابت ہو جاتا ہے کہ آریا دنیا کی قدیم ترین نسل، قوم یا تہذیب تھے یا ہیں۔ طوفانِ نوح کے بعد ابھرنے والی قوموں کی کسی شاخ سے ان کے پُرکھوں اور مہاپرکھوں کی کڑی تو ملائی جا سکتی ہے کہ ان کا اصل مرز بوم وہی خطہ ہے اور سیّدنا نوح علیہ السلام کا حوالہ دیگر قدیم تہذیبوں کی طرح ان کی قدیم ترین کتاب رِگ وید میں بھی پایا جاتا ہے۔ مگر اس صحرا نورد قوم کا تہذیبی وجود کسی طور تین ہزار برس سے زیادہ نہیں جس کا دستاویزی ثبوت اس مضمون میں بھی موجود ہے۔

تہذیبی شناخت:

لفظ ''آریا'' کا لسانیاتی پہلو جو ''ہند'' اور ''ہندو'' کی طرح عجیب ہے اس قوم کی تہذیبی شناخت کا بھی بنیادی حوالہ ہے۔ مگر یہ شناخت انہیں کب اور کہاں ملی؟ کیا چاروں ویدوں یا اِن کی دیگر مقدس کتابوں میں بھی لفظ ''آریا'' موجود ہے۔ کسی ہندو وِدوان سے پوچھ کر دیکھیے وہ کیا کہتا ہے اور کیا اس کے پاس اس ضمن میں کوئی ٹھوس ثبوت بھی ہے؟ میرا غالب قیاس ہے کہ جس طرح ''ہند''، ''ہندو'' اور ہندوستان عربی الاصل الفاظ ہیں۔ بالکل اسی طرح آریا اصلاً عربی زبان کا لفظ ''عاریہ'' سے ماخوذ ہے۔ نہ صرف صوتی لحاظ سے اور اپنی ساخت میں یہ دونوں کلمات بہت قریب ہیں بلکہ تاریخی پس منظر میں دیکھا جائے تو اپنے وقتوں کی مہذب ترین ترقی یافتہ اور انتہائی قدیم دوآبۂ دجلہ و فرات، شام اور فلسطین میں آباد سُمیرین، عکادین، اور کنعانی اقوام جو تمام کی تمام سامی الاصل تھیں اور جن سے آریاؤں کا سب سے پہلے سابقہ پڑا اور جن کی زبان عبرانی اور ارامی تھی جو اُمّ اللغات عربی ہی کی ابتدائی شکلیں ہیں، انہیں یہ نیم وحشی اور نیم برہنہ گروہ ''عاریہ''

یعنی عریاں ہی نظر آیا ہوگا۔ برہنگی کے حوالے سے برصغیر کے باسی اچھی طرح جانتے ہیں کہ ہندو روایات اور پوجا پاٹ کی رسموں میں برہنگی کبھی معیوب نہیں رہی حتیٰ کہ اس قوم کی بہت سی دیویاں اور دیوتا مختلف مقامات پر مندروں اور گپھاؤں میں برہنہ دیکھے جاسکتے ہیں۔ برہنہ مورتوں کے لیئے دیار ہند میں کھجوراہو کا مندر اور ایلورا اور اجنتا کے غار سیاحوں کی دلچسپی کے خصوصی مراکز رہے ہیں۔ اس کے لیے غالباً ''عاریہ'' یا اس کا ہندوستانی روپ ''آریا'' سے زیادہ موزوں عرفیت ہو ہی نہیں سکتی۔

عبرانی اور عربی کی یگانگت کے حوالے سے ایک واضح مثال وہ نام ہے جو سیّدنا ابراہیمؑ نے اپنے فرزند اکبر اسماعیلؑ ذبیح اللہ کو دیا۔ وہ اسم علم جو بعد ازاں الف کے آگے پیچھے ہونے سے ''اسماعیل'' ہوگیا وہ اصلاً ''اِسمَع ایل'' تھا یعنی ''الٰہی سُن لیجیے'' وہ دعا جس کی باریابی سیدنا اسماعیلؑ کے ظہور سے پوری ہوئی۔ عربی زبان و ادب کی قدامت کے ضمن میں مختصراً اتنا کافی ہو کہ سیّدنا ابراہیم علیہ السلام جس تہذیبی ورثہ کے ساتھ تقریباً ساڑھے چار ہزار برس پہلے سرزمین فلسطین تشریف لائے تھے اُسے نام دینے کے لیے 'ابراھیم العبری' کی تہذیب وثقافت کہا گیا تھا جس کا مطلب ہے دریائے فرات عبور کر کے آنے والے ابراہیم علیہ السلام۔ یہی ''العبری'' بعد میں ''ہبریو'' یا عبرانی کہی جانے لگی جو عربی زبان کا ایک قدیم روپ ہے۔ دونوں زبانوں کی یگانگت کا اندازہ اس سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ دونوں کے ابجدی حروف کم وبیش ایک سے ہیں، مثلاً عبرانی میں الف، ب اور جیم کے لیئے الفا، بیٹا، جیمل'' وغیرہ یہ الگ بات کہ قرآن عظیم الشان نے ایک جانب عربی کو اُم اللغات بنا دیا اور مشرق و مغرب کی زندہ زبانوں میں اُسے سیادت و قیادت کا منصب عطا کر دیا تو یہودی اقوام کی بداعمالیوں نے سنسکرت کی طرح عبرانی کو بھی ان کی مذہبی کتابوں تک محدود کر کے قدیم زبانوں کے مردہ خانے کی نذر کر دیا۔

اس تاریخی حقیقت کا یہاں جان لینا بھی مناسب ہوگا کہ عبرانی شروع ہی سے عربی رسم الخط میں لکھی جاتی تھی مگر جب عباسی خلیفہ مامون الرشید کے دور میں یہود کی ریشہ دوانیاں عروج پر

پہنچیں اور انہوں نے قرآن کریم کی کتابت میں تحریف کر کے اسے پھیلانا شروع کر دیا تو خلیفہ نے اپنے وزیر اور معروف دستاویز نویس، بغداد نژاد ابن مقلعؔ کو (ابو علی محمد ابن علی ابن مقلع شیرازی: ۲۷۲/۱۰ شوال ۳۲۸/۸۸۶ـ۲۰ جولائی ۹۴۰) عبرانی کے لیے نیا رسم الخط ایجاد کرنے پر مامور کیا کہ آئندہ یہود عربی کا رخ نہ کریں۔ ابن مقلع اس سے قبل خطِ ثلث ایجاد کر کے فنِ خوش نویسی میں شہرت پا چکے تھے۔ ابن مقلع نے عبرانی کے لیئے جو رسم الخط وضع کیا اُسے چوکور ہونے کی بنا پر ''الخط المربع'' کہا گیا جسے بائیں سے دائیں جانب لکھا جاتا تھا۔ یہی وہ رسم الخط ہے جو جس میں ہبریو آج تک لکھی جارہی ہے جب کہ اصل عبرانی زبان قصہ پارینہ بن چکی ہے۔ عہد نامہ قدیم میں گم شدہ تورات کی روایات اور انبیاء کے تذکرے اپنے موجودہ افسانوی روپ میں آج دیکھے جاسکتے ہیں جب کہ اصل عبرانی مُسودۂ تورات ناپید ہے۔

ان شواہد کی موجودگی میرے اس خیال کو تقویت بخشنے کے لیے کافی ہے کہ اپنے وقتوں کے نیم وحشی اور تقریباً عریاں گروہ کو اُس دور کی ترقی یافتہ اقوام نے ''عاریہ'' ہی کہا ہوگا جو آریا لسانیات میں ''ع'' کی غیر موجودگی سے ؤریا ہو گیا۔ اس قوم نے اس عرفیت کو اس لیئے بھی ہنسی خوشی قبول کر لیا کہ عریانیت ان کے یہاں نہ کل معیوب تھی اور نہ آج ہے۔

بنیادی اوصاف: آریا قوم کے بنیادی خصائص اگر ایک فقرے میں بیان کرنے ہوں تو برصغیر کے طول و عرض میں زبان زدِ خاص و عام یہ مقولہ کافی ہوگا ''بغل میں چھری اور منہ میں رام رام''۔ اس قوم نے بالا دست قوتوں کے آگے ہمیشہ ماتھا ٹیکا ہے۔ سکندر اعظم ہوں کہ محمود اعظم، مغل فاتحین ہوں کہ ایسٹ انڈیا کمپنی بہادر، اکا دُکا مزاحمتوں کو چھوڑ کر اطاعت قبول کرنے میں یہ ہمیشہ پیش پیش رہے۔

گزشتہ دو صدیوں پر محیط اسلامیانِ ہند کی جاں گسل جدوجہد آزادی اور اس کا نقطۂ عروج قیام پاکستان کو جب ہم اس تناظر میں دیکھتے ہیں تو بہت سی تلخ حقیقتیں واشگاف انداز میں سامنے آجاتی ہیں اور بارگاہ ربّ العزت میں سربسجود ہونے کے سوا چارہ کار نہیں رہتا کہ اگر ہمارے

قائدین کی جدوجہد کامیاب نہ ہوتی اور پاکستان نہ بنتا تو سیاسی انتشار اور معاشی زبوں حالی کے شکار اسلامیان برصغیر کا کیا بنتا جو سامراجی اور رام راجی چکیوں کے دو پاٹوں کے درمیان پس رہے تھے اور کیا یہاں بھی اندلس کی تاریخ دہرائی نہ جاتی!

آریا قوم اور ہند آریائی تہذیب کے خدوخال واضح انداز میں دیکھنے ہوں تو دوسری صدی قبل مسیح کی ''مہابھارت'' نامی رزمیہ داستان پڑھ لی جائے۔ ہندو دھرم کی اہم ترین اور مقبول عام لوک کتھا ''مہابھارت'' وہ خوں آشام خانہ جنگی تھی جو آریا پُرکھوں کے عم زاد کورو اور پانڈو کے درمیان برپا ہوئی۔ محدود ذاتی مفادات کے سوا اس جنگ میں کسی اعلیٰ وارفع مقصد کی بطور محرّک نشاندہی نہیں کی جاسکتی۔ اس طویل لوک داستان کا سب سے اہم اور ہندوؤں کے نزدیک تقدس میں لاثانی اٹھارہ ابواب اور ہزاروں اشلوک پر مشتمل ''بھگوت گیتا'' یا مقدس نغمہ وہ حصہ ہے جس میں اس کے مرکزی کردار یا ہیرو سری کرشن جی اپنے عقیدت منداور پانڈوں کے سردار ارجن دیو کو میدانِ جنگ میں فریق مخالف کو تہس نہس کرنے کی ترغیب دیتے ہیں۔ آریا فلسفۂ جنگ وامن کا یہی اصول ہے جس پر یہ قوم صدیوں سے آج تک کاربند ہے۔

دیومالائی شخصیات: آریا قوم وادی گنگ وجمن میں آریہ ورت قائم کرنے میں جب کامیاب ہوگئی تو پھر ان کا وہ اساطیری نظام وجود میں آیا جس سے ہندومت عبارت ہے۔ ہندو مذہبی روایات پر مشتمل اوّلین اساطیر چار ''وید'' ہیں جن کے بارے میں حتمی طور پر کوئی نہیں جانتا کہ وہ کب ترتیب پائے اور کس نے انہیں موجودہ شکل دی۔ مختلف ذرائع سے جو معلومات اکٹھی کی جاسکی ہیں ان کی رو سے ساتویں اور چھٹی صدی قبل مسیح میں ان کا ظہور ہوا۔ رگ وید، یجروید، اتھروید اور سام وید میں قدیم ترین رگ وید ہے۔ معروف محقق شمس نوید عثمانی کے مطابق اس میں ایسے اشلوک بھی ملتے ہیں جو توحید، ذات باری کے اسمائے صفات اور اخلاقی تعلیمات کے حوالے سے اسلام سے قریب تر کہے جاسکتے ہیں۔ مگر اس قوم کی کم نصیبی کہیے کہ خود انہیں ان تعلیمات کی روح تک پہنچنا مشکل ہوگیا ہے چونکہ اُن کی زبان وبیان کی صحیح تعبیر وتشریح کرنے والا

ان کے پاس کوئی نہیں۔ جو باتیں وحی والہام سے القاء ہوئی ہوں ظاہر ہے ان کی عملی تفسیر کے لیئے کسی نبی مُرسَل کا ہونا لازمی ہے ورنہ تمام مندرجات بے معنی الفاظ کا گورکھ دھندہ بن جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر اللہ تبارک وتعالیٰ کے اسمائے صفات میں ایک صفت رگ وید میں ''اگرِنی'' درج ہے۔ ہندو وِدوانوں نے اُسے آگ سے تعبیر کیا اور لگے اس کی پرستش کرنے۔

انسائکلو پیڈیا آف ریلیجن اینڈ اتھکس (جلد ۱۲ ص ۶،۸) میں "Heroes of Rigveda" کے عنوان سے ہمیں یہ عبارت ملتی ہے: ترجمہ

''رگ وید کے تمام مرکزی کردار قدیم دور کے مفکرین یا پروہت ہیں۔ (۱) ان میں سب سے نمایاں مَنُو یا مَنش ہے (جس کا لفظی مطلب ہے انسان)۔ وہ نسل انسانی کا جد اعلیٰ ہے اور جسے لوک کوی ہمارے بابا کہہ کر پکارتے ہیں اور اپنے دور کے قربانیاں دینے والوں کو مَنُو کے نام لیوا قرار دیتے ہیں۔۔۔ سَت پتھ براھمن میں منو کا کردار (حضرت) نوحؑ کا ہے جنہیں ایک طوفان میں جو سب کچھ بہالے جاتا ہے ایک کشتی کے اندر مچھلی کے ذریعہ بچایا جاتا ہے (بعد از ویدیو مالاؤں میں مچھلی وِشنُو کا ایک اوتار ہے)۔ اس کے بعد مَنُو انسانی نسل کے جدّ اعلیٰ بنتے ہیں اپنی بیٹی ایلا کے ذریعہ جس کی تخلیق (دیوتاؤں کی) نذر نیاز سے عمل میں آتی ہے۔)

رام (سری رام چندر) رام چندر جی کی رام کہانی بھی کرشن کتھا کی طرح ایک داستان گورشی بالمیکی کے توسط سے ہم تک پہنچی ہے۔ لوک کوی ویاس کی طرح جن کے نام سے ''بھگوت گیتا'' اور ''مہابھارت'' نے شہرت پائی، بالمیکی کی شہکار ''رامائن'' ہندوؤں کی دوسری مقدس ترین رزمیہ داستان ہے مگر خود اس کے مصنف کے حدود اربعہ کا کچھ اتہ پتہ نہیں۔ اندازہ ہے کہ رام چندر جی کا ظہور کرشن جی سے کم وبیش تین صدی قبل یعنی پانچویں قبل مسیح میں ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ ویاس نے ''مہابھارت'' کے آخری باب میں نسبتاً مختصر ''رام گیتا'' کا بھی اضافہ کیا ہے۔ وہ شخصیت جو ابتداً ایک مقبول لوک کتھا کے مرکزی کردار کی حیثیت سے معروف تھی بعد میں خدائی کے منصب پر فائز

کردی گئی۔اسے وشنو (الحفیظ/the Preserver) کے دو آخری اوتاروں میں سے ایک کی حیثیت سے پوجا جانے لگا جب کہ بعد میں آنے والے کرشن جی سب سے آخری اوتار ٹھہرے۔ مہابھارت میں جنگ دو انسانی گروہوں کے درمیان برپا ہوئی۔ جب کہ رامائن میں یہ جنگ ایک خدا نما انسان اور ایک دیو نما خبیث (اراکھشس) کے درمیان لڑی گئی۔ یہ راکھشس لنکا کا راجہ راون ہے جس پر رام جی کی چہیتی بیوی سیتا کو بھگا کر لنکا لے جانے کا الزام ہے۔ لنکا اور اس کے راجہ راون کا جو غیر انسانی اور Devilish روپ پیش کیا گیا ہے اس کی ایک بڑی وجہ اس کا غیر آریائی تہذیب سے تعلق اور آریا قوم پرستی کے بالمقابل ایک خود مختار ریاست اور قوم کا فرماں روا ہونا بھی ہے، ورنہ عقل و خرد کے پیمانے سے ناپا جائے تو نہ یہ دیو مالائی کہانی اور نہ اُس کے ہیرو اور ولن کسی کو متاثر کرنے کے قابل دکھائی دیتے ہیں۔

رام چندر جی کے نام پر سیکولر بھارت میں سولہویں صدی میلادی کی ایودھیا میں واقع بابری مسجد کو آج کے "ترقی یافتہ" دور میں مسمار کیا گیا اور اس پُر تشدد واقعے پر پُر امن احتجاج کرنے والے کم و بیش دو ہزار بے گناہ مسلمانوں کو اپنی جانوں سے ہاتھ دھونا پڑا۔

وہ رزمیہ جو رامائن کی مرکزی کہانی ہے اُسے بڑے چٹخارے دار انداز سے نہ صرف ہندوؤں کی محافل میں سنا اور سنایا جاتا ہے بلکہ دس روزہ تہوار دسہرہ اور اس کا نقطۂ عروج "رام لیلا" کا جلوس اور آخر میں راون کے سینکڑوں فٹ بلند خصوصیت سے تیار کیئے گئے پتلے کا نذر آتش کیا جانا اس کے اہم پہلو ہیں اور آریا تہذیب و ثقافت کا ناگزیر حصہ بھی جہاں تک رام جنم بھومی کا تعلق ہے تاریخی شواہد یا سائنسی بنیادوں پر کی گئی کسی تحقیق سے اب تک یہ بات ثابت نہیں ہو سکی کہ رام چندر جی کی پیدائش ایودھیا ہی میں ہوئی تھی اور ہوئی بھی تھی تو کیا وہ عین وہی جگہ تھی جہاں صدیوں بعد مسجد تعمیر ہوئی؟ کیا منہدم بابری مسجد کے ملبے تلے اس مفروضہ جنم بھومی کے آثار بھی ملے ہیں ؟۔ اگر نہیں ملے تو کن بنیادوں پر وہاں کی اعلیٰ عدلیہ نے اس تاریخی مسجد کا ایک بڑا حصہ رام کے نام پر وقف کر دیا؟ ہندوؤں کا یہ دعویٰ فی الحقیقت ایسا ہی ہے جس طرح یہود نے مسجد اقصیٰ کی

سنگلاخ پہاڑی کے عین نیچے ہیکل سلیمانی اچانک دریافت کرلی اور پھر لگے دیوار گریہ پر آہ وبکا کے ساتھ ساتھ زیر زمین کھدائی کرنے ظاہر ہے رُومیوں کا تو وہ کچھ بال بیکا نہیں کر سکے جنہوں نے ھیکل کی یوں اینٹ سے اینٹ بجا دی کہ اس کے آثار تک باقی نہیں چھوڑے البتہ محکوم و مجبور فلسطینی مسلمانوں کی ملّی غیرت کو زمین بوس کرنا غالباً وہ بائیں ہاتھ کا کھیل سمجھتے ہیں۔ یہی صورت حال ان کے روحانی برادران عزیز کی ہے جو مغل فاتح بابر اور اس کے جانشینوں کا تو کچھ نہیں بگاڑ سکے بلکہ مغل تاجداروں سے وزارت اور جاگیروں جیسی مراعات حاصل کرتے رہے لیکن اچانک چار صدی بعد ان کی رگِ حمیت پھڑک اٹھی اور انہوں نے بابری مسجد کے مقام پر رام جنم بھومی دریافت کرلی۔

مہاویر جین: مہاتما بدھ کے سینئر ہمعصر مہاویر جین پٹنہ شہر سے ۲۷ میل شمال میں ویشالی نامی بستی کے قریب کھشتری گھرانے میں پیدا ہوئے۔ جلد ہی ایک پارسا کے طور پر انہیں شہرت حاصل ہوگئی۔ مزاج میں گوشہ گیری تھی۔ انھوں نے ۱۲ برس کی تپسیا کے لیئے جنگلوں اور دور افتادہ مقامات کی راہ لی۔ اپنی ریاضت کے دوران وہ اس مقام پر پہنچے جہاں وہ لباس سے بے نیاز ہو گئے۔ اس گیان دھیان سے انہوں نے جو کچھ سیکھا اس میں ذات باری کے وجود کا اثبات تو وہ نہ کر سکے مگر ترکِ دنیا کو نروان کا واحد ذریعہ قرار دیا۔ مہاتما بدھ کی طرح وہ بھی طبقات میں بٹے آریائی معاشرے کی اصلاح چاہتے تھے مگر اُس میں تو انہیں کوئی خاطر خواہ کامیابی نہیں ہوئی ہاں یہ ضرور ہوا کہ عام لوگوں کو ان کی جانب راغب ہوتا دیکھ کر عیّار برہمن نے انہیں بھی اوتار کا روپ دے کر جلد ہی آریا معاشرے میں ضم کرلیا۔ نتیجہ یہ ہے کہ ہندوازم کے ایک بدعتی فرقے کے طور پر جین مت آج محدود پیمانے پر بھارت میں موجود ہے اور اس کے متبعین زیادہ تر ایک کامیاب کاروباری طبقے کے طور پر وہاں پائے جاتے ہیں۔

مہاتما بدھ: تاریخی لحاظ سے ہند آریائی تہذیب کا غالباً سب سے معتبر نام مہاتما گوتم بدھ کا ہے جن کی شخصیت دیومالائی کم اور حقیقی زیادہ ہے۔ بدھ مت سے منسوب روایات نسبتاً مستند اور ان کا

اخلاقی پہلو کہیں زیادہ مفید کہا جا سکتا ہے۔ ان کی پیدائش ۵۶۰ قبل مسیح اور بعض روایات کے مطابق ۵۶۳ ق م اور وفات بعمر ۸۰ برس ۴۸۰ یا ۴۸۳ میں کپل وستو نامی قدیم شہر میں ہوئی۔ اس شہر کے محل وقوع سے متعلق ۱۸۹۵ء میں دریافت شدہ مہاراجہ اشوک کے نصب کردہ ایک ستون سے بعض محققین نے اسے ہمالیہ کی ترائی میں واقع جنوبی نیپال کا ایک شہر قرار دیا ہے، جب کہ بعض کا خیال ہے کہ وہ ہند آریائی تہذیب کا مرکزی شہر پاٹلی پتر عرف پٹنہ ہی ہے جو موریہ سلطنت کے بانی چندر گپت اور برصغیر کے طول و عرض کے اولین حکمران اشوک اعظم کی راجدھانی رہا ہے۔ مہاتما بدھ کے حالات زندگی سے بھی اسی خیال کی تصدیق ہوتی ہے۔ جہاں تک اشوک کے سنگی ستون یا لاٹ کا تعلق ہے تو وہ بدھ مت کی تعلیمات کی کندہ کاری کے ساتھ نیپال کی ترائی ہی نہیں بلکہ ہندوستان اور پاکستان کے اس دور کے تمام اہم تہذیبی مراکز میں نصب کیے گئے تھے اور مسلم حکمرانوں کی اعلیٰ ظرفی کی بدولت اُنہی مقامات پر آج بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔

مہاتما بدھ نے خود کو کبھی دیوتا کے روپ میں پیش نہیں کیا اور نہ ان کے قریبی جانشینوں نے یہ جسارت کی مگر جیسا کہ ہوتا آیا ہے۔ بعد ازاں ان کے ماننے والوں نے ان کی مُورت بنا کر پوجنا شروع کر دیا۔ آریائی دیو مالاؤں کے برعکس بدھ مت کا تمام مذہبی مواد اُس دور کے مشرقی ہند کی عوامی زبان پالی میں مُدوّن ہوا۔ مگر یہ زبان بھی سنسکرت کی طرح چند صدی بعد ماضی کی بھولی بسری داستان بن گئی۔

مہاتما بدھ اور ان کے پیروکاروں نے جو اخلاقی تحریک برپا کی اس سے معاشرے میں برہمن کی قیادت اور سیادت براہ راست زد پر آ گئی، طبقاتی تقسیم کا نظام متزلزل ہو گیا اور پس ماندہ اقوام نے سر اٹھانا شروع کر دیا۔ یہ بات بھلا برہمنی سامراج کہاں برداشت کر سکتا تھا۔ ان پر آریہ ورت کی دھرتی اتنی تنگ کر دی گئی کہ رفتہ رفتہ بدھ مذہب کا اپنے مرکز سے دیس نکالا ہو گیا۔ دلچسپ تاریخی حقیقت یہ بھی ہے کہ برصغیر کا وہ حصہ جو کچھ عرصہ بدھ مت کے زیر اثر رہا وہ آریہ ورت سے باہر شمالی پنجاب اور خیبر پختون خوا کا علاقہ تھا جہاں اس فکر پر مبنی گندھارا تہذیب ایک

مختصر عرصے کے لیے پھلی پھولی اور پھر یہاں سے مزید شمال میں لدّاخ اور تبت کو اس نے اپنا ٹھکانہ بنایا۔ مہاتمابدھ کے پیغام امن و صلح سے متاثر ہو کر ممتاز موریہ حکمران مہاراجہ اشوک (۲۳۲-۳۰۴ ق م) جس نے کم و بیش پورے ہندوستان پر بشمول مغربی افغانستان پچاس برس حکمرانی کی، کالنگا (موجودہ اڑیسہ) کی خون آشام جنگ جیت کر کشت و خون کی آریائی روایت سے ہمیشہ کے لیے ایسا تائب ہوا کہ نہ صرف اس نے بدھ مت اختیار کر لیا بلکہ اس کی دعوت کو عام کرنے کے لیے اپنی وسیع و عریض مملکت کے طول و عرض میں اس نے اس اصلاحی تحریک کی تعلیمات فولادی اور سنگی ستونوں (اسٹوپا یالاٹ) پر کندہ کروا کر اہم مقامات پر نصب کروایا۔ مگر اس کے ساتھ بھی برہمن رام راج نے وہی کیا جو ہمیشہ غیر برہمنوں کے ساتھ اس کا وطیرہ رہا ہے۔ مسلم ادوار میں یہ ستون تو اپنی اپنی جگہوں پر محفوظ کر دیئے گئے مگر اشوک کے بعد بدھ مت کا کوئی پیروکار اس سرزمین کا حکمران نہ بن سکا سوائے راجہ کنشک کے جس نے مختصر عرصہ کشمیر اور شمالی علاقوں کے بعض حصوں پر حکومت کی اور بدھ مت کے احیاء کی کوشش بھی کی۔ مہاتمابدھ کی طرح اس کی تعلیمات کا علمبردار مہاراجہ اشوک ہندوستان کا وہ پہلا انصاف پسند اور سلیم الفطرت حکمران ہے کہ اگر وہ برہمن ہوتا تو شاید اس کے نام کے مندر بھارت کے طول و عرض میں پائے جاتے۔ آزاد بھارت نے اُس کے نشان ''اشوک چکر'' کو اپنے ترنگے میں جگہ تو دے دی مگر جو مقام قبولیت کٹر ہندو قوم پرست حکمران بکرماجیت اوّل (۶۵۵م) اور اس کے پوتے بکرماجیت دوئم (۷۴۰م) کو وہاں حاصل ہے وہ کسی اور کو نہیں جبکہ ان دونوں کے راجواڑے کا حدوار بعہ قنوج، مالوہ اور بھارتی گجرات تک محدود تھا اور انہوں نے اپنے پیچھے کوئی اخلاقی یا سیاسی کارنامہ بھی نہیں چھوڑا سوائے اس کے کہ وہ آریائی تہذیب کی بالادستی چاہتے تھے۔ ہندوؤں نے اپنی جنتری (تقویم) کو اُسی کی طرف منسوب کیا ہے جسے وہ ''بکرمی'' کہتے ہیں۔

حاصل کلام: ہند آریائی تہذیب و ثقافت کے اس جائزے کے تناظر میں لازمی طور پر ہم جن نتائج تک پہنچتے ہیں وہ یہ ہیں (۱) آریا وہ قوم ہے جو داخلی طور پر زبردست اور زیردست طبقات

میں ہمیشہ منقسم رہی ہے۔ (۲) خارجی طور پر یہ جہاں جہاں پہنچی وہاں کی مقامی آبادی اور تہذیب و ثقافت کو اس نے تہس نہس کر کے چھوڑا۔ (۳) وادی گنگ و جمن اور اپنے حلقۂ نفوذ میں اس نے کسی حریف طاقت کو کبھی پنپنے کا موقع نہیں دیا۔ (۴) سکندر اعظم سے لارڈ ماؤنٹ بیٹن تک تمام بیرونی عناصر کے آگے بالعموم یہ سجدہ ریز رہی ہے تا آنکہ ان کے ذریعہ اپنے مخصوص نسلی اور گروہی مفادات کو تقویت نہ دے ڈالی۔ (۵) اسلام وہ واحد طاقت ہے جسے نہ یہ کبھی زیر کر سکی نہ خود میں ضم کر کے تحلیل کرنے میں کامیاب ہوئی اور اسی بناء پر ہمیشہ اس کے خلاف شدید نفرت کی حکمتِ عملی پر کار بند رہی جب کہ دوسری جانب اسلام نے اس عاریہ (عریاں) قوم کو خوش لباسی اور تہذیب وثقافت کا جامہ پہنا کر اس کی قلب ماہیت کی کوشش کی جس میں اُسے تاریخ ساز کامیابی نصیب ہوئی۔ (۶) ہند اسلامی تہذیب اور ہند آریائی تہذیب کی یہی وہ ہزار سالہ کشمکش تھی جو منطقی طور پر ظہور پاکستان پر منتج ہوئی۔ (۷) یہی وہ کشمکش اور نفرت ہے جس نے بھارت کو آج تک پاکستان کے وجود کو صدق دل سے قبول کرنے سے باز رکھا ہے اور مستقبل میں بھی اس کا امکان نظر نہیں آتا الّا یہ کہ قسامِ ازل پردۂ غیب سے اس برعظیم کے باسیوں کی قسمت جگا دے جو اسلام کی نشاۃ ثانیہ کی شکل ہی میں ممکن ہے۔ (۸) گذشتہ ہزار برس میں آزادی کی نعمت پہلی بار اسلامیانِ ہند کی جاں گسل جدوجہد کے نتیجے میں برطانوی سامراج کے عطیہ کے طور پر برہمنی استبداد کی جھولی میں آ گری تھی مگر اس کا حاصل یہ ہے کہ پچھلے ۶۳ برسوں سے اس کے جارحانہ طرزِ عمل نے ایک جانب بھارت کے مظلوم اور پس ماندہ طبقات واقوام کو بغاوت پر آمادہ کر دیا ہے تو دوسری جانب پاکستان کا ناطقہ بند کرنے کے لیئے آئے دن نت نیا فساد برپا کیا جاتا ہے۔

بنیادی نوعیت کے یہ وہ حقائق ہیں جن سے ہماری نسل کو لازماً واقف ہونا چاہیے کہ ہمارے جداگانہ ملی تشخص اور قومی وجود کے لیے یہ معلومات بے حد ضروری اور ناگزیر ہیں۔

یہ کام تو اسے خود کرنا ہوگا۔ جھک کر نہیں سینہ تان کر اور سر اونچا کر کے۔۔۔

ڈاکٹر یاسمین سلطانہ

فیض احمد فیض کی شاعری میں کرب ذات کا احساس

بیسویں صدی کے قدآور شعرا کے درمیان ایک شاعر دھیمی لے میں درد اور کسک کا اظہار کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ اس صدی کے بین الاقوامی شہرت و مقبولیت کے حامل شعرا میں اقبال کے بعد اُسی نے سب سے زیادہ شہرت پائی اور فیض احمد فیض کے نام سے پہچانا گیا۔ فیض کو اپنی آدرش کی صداقتوں پر یقین تھا اس لیے انھیں اپنے آپ کو یا دوسروں کو یقین دلانے کے لیے کسی جدوجہد کی کبھی ضرورت نہیں پڑی۔ ان کی شاعری میں انسان دوستی اور جمال پرستی کے اوصاف نمایاں ہیں۔ زندگی کی سنگلاخ حقیقتوں کے درمیان ان کا احساس جمال اس طرح پھوٹتا ہے جیسے چٹان کے سینے سے ٹھنڈے پانی کا چشمہ ابل رہا ہو۔ فیض کی شاعری میں جہاں احساس جمال کے ذریعے آرزو اور حصول آرزو کی حدِ فاصل کو پاٹنے کا انداز ملتا ہے وہیں اپنے اجداد کی غلامانہ میراث کے خلاف بغاوت کا اظہار بھی ہے۔ فیض اردو ادب کے ان باشعور نمائندہ شاعروں میں سے تھے جنھوں نے حیات انسانی کے پیچیدہ روابط پر گہری نظر ڈال کر اپنی فکر و آگہی کو اس انداز سے ترتیب دیا کہ خود ان کے جذبات سماج کے تمام دردمند اور شکستہ تن افراد کے احساسات بن گئے۔ ان کے ذاتی مصائب سماجی مسائل نظر آنے لگے۔

ترقی پسند تحریک جدیدیت کے لحاظ سے اردو ادب کا ایک نیا موڑ ثابت ہوئی۔ فیض کا اس تحریک سے نہ صرف قلبی، ذہنی اور روحانی رشتہ تھا بلکہ وہ اس کے بانیوں میں سے تھے انھوں نے مارکسی، اشتراکی اور فرائیڈین نظریات سے استفادہ کیا اور ان کو اپنی شاعری کے لیے مشعل راہ بھی بنایا۔ ان کی فکر میں غم جاناں پر غم دوراں غالب نظر آتا ہے۔ تمام انسانوں کا دکھ انھوں نے اپنے

سینے میں محسوس کیا اس لیے یہ کرب اشعار میں جگہ پانے لگا۔

کسی بھی معاشرہ کا ادب اس معاشرے کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ ایک حساس ادیب پہلے اپنی ذات کے اندر جھانکتا ہے اس کے بعد معاشرے میں وہ پہلے اپنے ذاتی کرب کو محسوس کرتا ہے۔ اس کے بعد معاشرتی آلام اس پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ چونکہ ادب ادیب کے احساسات کا ترجمان ہوتا ہے اس لیے ہم اس کی تخلیق میں اس کے ذاتی کرب کا عکس دیکھ سکتے ہیں۔ فیض احمد فیض کا کلام بھی ان کے ذاتی کرب کی ترجمانی کرتا ہے۔

نظم و غزل عشق و محبت کی داستانوں سے مزین ہوتی ہیں عشق اور غم عشق کی وارداتیں شاعری کا سب سے طاقتور موضوع ہے۔ اس میں اگر حقیقت کی چاشنی شامل ہو اور شاعر اپنی حقیقی کیفیات کا ذکر کرے تو اشعار دلوں کو چھونے لگتے ہیں۔ فیض نے نوعمری میں ہی عشق کی اذیتوں کا ذائقہ چکھا۔ عشق کا یہ جذبہ اٹھارہ سال کی عمر میں ان پر حاوی ہوا جس کے بارے میں وہ کہتے ہیں کہ ''نقش فریادی'' کے اشعار تقریباً ایک ہی ذہنی اور جذباتی واردات سے تعلق رکھتے ہیں اور اس واردات کا ظاہری محرک تو وہی ایک حادثہ ہے جو اس عمر میں اکثر نوجوان دلوں پر گزر جایا کرتا ہے، یعنی ''عشق'' (۱) ان کے عشق میں ایک والہانہ پن ہے اپنی دلی کیفیت کا اظہار وہ بڑے شگفتہ اور دلکش انداز میں کرتے ہیں۔

ترا جمال نگاہوں میں لے کے اٹھا ہوں — نکھر گئی ہے فضا تیرے پیرہن کی سی
نسیم تیرے شبستاں سے ہو کے آئی ہے — مری سحر میں مہک ہے ترے بدن کی سی (۲)

حسن و عشق کے قصیدے یوں تو ہر دور میں لکھے گئے ہیں لیکن فیض کے ہاں یہ عشق ایک کسک کی شکل میں جلوہ گر ہے۔ وہ عشق کے درد سے تلملاتے نہیں ہیں بلکہ اسے ایک تحفہ سمجھ کر دل سے لگاتے ہیں۔

جو تیرے حسن کے فقیر ہوئے — ان کو تشویش روزگار کہاں
درد بیچیں گے گیت گائیں گے — اس سے خوش وقت کاروبار کہاں؟ (۳)

محبوب تو سدا سے سنگدل اور بے مروت ہوتا ہے۔ محبوب کی کج ادائیوں کے آگے عاشق بے بس اور مجبور ہوتا ہے۔ مگر فیض کی بے بسی اور مجبوری کا انداز منفرد ہے۔

اپنے بس کی بات ہی کیا ہے؟ ہم سے کیا منواؤ گے ‏ ‏ عہد وفا یا ترک محبت، جو چاہو سو آپ کرو
(۴)

فیض کی شاعری میں ہجر محبوب کا ذکر بھی ہے لیکن اس ذکر میں ایسا حزن و ملال، ایسا درد والم اور ایسی غم انگیزی ہے جس میں قنوطیت نہیں پائی جاتی۔ ان کا غم حسین اور خواب آور ہے۔ وہ ہجر کے دنوں میں درد و رنج میں ڈوب کر صبر کا دامن ہاتھ سے جانے نہیں دیتے بلکہ خوش آئند دنوں کا انتظار کرتے ہیں۔ عشق کی ناکامی سے دل برداشتہ ہو کر ناامید نہیں ہوتے

دشنام تو نہیں ہے، یہ اکرام ہی تو ہے ‏ ‏ ہم پر تمہاری چاہ کا الزام ہی تو ہے

لمبی ہے غم کی شام مگر شام ہی تو ہے ‏ ‏ دل ناامید تو نہیں، ناکام ہی تو ہے (۵)

جب انسان کو تدبیر کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تو وہ جاگتی آنکھوں سے خواب دیکھنے لگتا ہے۔ خواب میں اسے کامیابی کی آسودگی نصیب ہوتی ہے۔ ان خوابوں کے بدولت نہ صرف ذاتی آسودگی حاصل ہوتی ہے بلکہ خواب زندگی کی تلخیوں اور انتشار کو سہنے کا جواز بھی فراہم کرتا ہے۔ فیض بھی محبوب کو حاصل نہ کر سکے تو خوابوں کو اپنا مسکن بنا لیا۔

برف گرے پربت پر، میں تیرے سپنے دیکھوں ‏ ‏ برکھا برسے چھت پر، میں تیرے سپنے دیکھوں (۶)

محبوب کی دوری انھیں مایوس نہیں کرتی، وہ منتظر رہتے ہیں خوش آئند وقتوں کے محبوب کے رنگین آنچل کے چاندنی راتوں کی ٹھنڈی چھاؤں کے، تپتے ہوئے صحرا میں سایہ دار درختوں کے دل میں کھوئی ہوئی یاد سے لے کر آنکھوں سے بہتے لہو تک ان کا انتظار قائم رہتا ہے۔

وہ آنکھ جس کو ترا انتظار اب بھی ہے ‏ ‏ وہ دل کہ تیرے لیے بے قرار اب بھی ہے (۷)

نہ شب کو دن سے شکایت نہ دن کو شب سے ہے ‏ ‏ تری، امید ترا انتظار جب سے ہے (۸)

وہ انتظار کی آخری امیدوں سے کبھی مایوس نہ ہوئے لیکن اس انتظار نے انھیں دھیرے دھیرے تنہائی کے خول میں بند کر دیا۔ ان کی تنہائی لمحہ بہ لمحہ بوجھل ہوتی جاتی ہے ان کی بہت سی نظمیں اور اشعار اس کیفیت کی غمازی کرتے ہیں۔ ''تنہائی'' اور ''انتظار'' فیض کی شاعری کی مرکزی خصوصیت ہے اس لیے ان کی ساری نظمیں اس ایک نظم ''تنہائی'' کے گرد گھومتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ (۹) تنہائی میں انتظار کی کیفیت یوں ہوتی ہے کہ خفیف سی آہٹ پر محبوب کے قدموں کا گماں ہوتا ہے۔ محبوب کا سراپا ایک سراب بن کر شاعر سے آنکھ مچولی کھیلتا ہے۔

دشت تنہائی میں اے جان جہاں لرزاں ہیں   تیری آواز کے سائے ترے ہونٹوں کے سراب
دشت تنہائی میں دوری کے خس و خاک تلے   کھل رہے ہیں، ترے پہلو کے سمن اور گلاب
(۱۰)

محبوب کی یادوں نے فیض کو تنہائی کے غار میں دھکیل دیا اور وہ دنیا سے غافل ہو کر ایک خاص جذبے کے تحت مدہوش نظر آنے لگے۔ اس انتظار کی شدت نے فیض کو تھکن اور اضمحلال میں مبتلا کر دیا۔ وہ انتظار کی تھکن سے نڈھال ہو کر محبوب سے فریاد کر بیٹھے۔

قسم تمہاری بہت غم اٹھا چکا ہوں میں   غلط تھا وعدہ صبر و شکیب، آ جاؤ   (۱۱)

اب شاعر کے دل سے انتظار کا اضطراب گھٹتا جاتا ہے اور مایوسی بڑھتی جاتی ہے۔ وہ امید و ناامیدی کی جانکاہ کیفیت سے گزرنے لگتا ہے۔ یہ کیفیت فیض پر جھنجھلاہٹ طاری کر دیتی ہے اور وہ اس جھنجھلاہٹ میں محبوب کو محبت کا دوسرا رخ دکھلاتے ہیں۔

ابھی تک دل میں تیرے عشق کی قندیل روشن ہے   کہ اب بھی روح تنہائی میں تجھ کو یاد کرتی ہے
مگر جان حزیں صدمے سہے گی آخرش کب تک؟   تری بے مہریوں پہ جان دے گی آخرش کب تک؟
مبادا یاد ہائے عہد ماضی محو ہو جائیں   یہ پارینہ فسانے موج ہائے غم میں کھو جائیں
حریم عشق کی شمع درخشاں بجھ کے رہ جائے   مری جاں اب بھی اپنا حسن واپس پھیر دے مجھ کو
(۱۲)

اب شاعر کے دل میں عشق کی طرف سے مایوسیاں اترنے لگتی ہیں، امید کی لو بجھنے لگتی ہے۔ انھیں یقین ہو جاتا ہے کہ اب ان کی صدا پر کوئی نہیں آئے گا۔ حسن نے عشق کو ٹھکرا دیا ہے۔ ان کے دل میں یہ احساس اترنے لگتا ہے کہ عشق سے انھیں کچھ حاصل نہ ہوا سوائے سوختہ سامانی کے

حسن سے دل لگا کے ہستی کی   ہر گھڑی ہم نے آتشیں کی ہے   (۱۳)

انھیں اب وہ ناصح یاد آنے لگتے ہیں جنھوں نے انھیں عشق سے باز رکھنے کی کوشش کی تھی فیض امرتسر کے ایم، اے، او کالج میں لیکچرار تعینات ہوئے تو اس وقت عشق کے تجربے کے تحیر نے گومگو کی کیفیت طاری کر رکھی تھی۔ ان کی اس کیفیت کو ڈاکٹر رشید جہاں کی دوررس نگاہوں نے بھانپ لیا۔ انھوں نے مخلصانہ مشورہ دیا کہ "یہ عشق وشق چھوڑو یہ حادثہ تمہاری ذات کا بڑا حادثہ ہو سکتا ہے، مگر اتنا بڑا نہیں کہ زندگی بے معنی ہو جائے۔" (۱۴)

فیض نے ترک عشق کا ارادہ کر لیا

ویرانی حیات کو ویران تر کریں   لے ناصح آج تیرا کہا مان جائیں ہم

آؤ کہ آج ختم ہوئی داستان عشق   اب ختم عاشقی کے فسانے سنائیں ہم (۱۵)

فیض اپنے لہو سے جس عشق کی آبیاری کر رہے تھے وہ صرف یاد بن کر رہ گیا۔ وہ بھولنے کے باوجود عشق کی کسک کو دل سے نکالنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔

کبھی کبھی یاد میں ابھرتے ہیں نقش ماضی مٹے مٹے سے

وہ آزمائش دل ونظر کی، وہ قربتیں سی وہ فاصلے سے (۱۶)

آ کہ وابستہ ہیں اس حسن کی یادیں تجھ سے   جس نے اس دل کو پری خانہ بنا رکھا تھا

جس کی الفت میں بھلا رکھی تھی دنیا ہم نے   دہر کو دہر کا افسانہ بنا رکھا تھا   (۱۷)

فیض کے عشق کا انجام ناکامی پر ہوا۔ وہ اس ناکامی کو عمر بھر سینے سے لگائے رہے لیکن اس ناکامی نے انھیں اندھیرے میں پناہ لینے کے بجائے حوصلہ مندی اور امید کی ایک نئی روشنی عطا

کی۔ دراصل عشق نے انھیں جس روحانی اذیت سے دوچار کیا تھا اس کی سرحدیں بنی نوع انسان کے کرب سے جاملیں۔ ان کے دل کے دروازے پر محبت کی دستک تو اب بھی سنائی دیتی تھی لیکن اب انھوں نے محبت کے معاملے میں اپنے دل کا دروازہ ہمیشہ کے لیے بند کر دیا اور یہ کہنے پر مجبور ہو گئے۔

مجھ سے پہلی سی محبت مرے محبوب نہ مانگ (۱۸)

اب فیض محبت کی نئی شاہراہ پر چل نکلے، جہاں نہ محبوب کے رنگین وحریری ملبوسات کی خوشبو تھی نہ کیف شراب، نہ اس کی ساحر آنکھیں تھیں نہ رخسار کے عشرت آلود غازے۔ اس شاہراہ پر ٹھوس حقیقتیں اپنی بدنمائی کے ساتھ کھڑی ہیں۔ جہاں زرد رخسار اور سرد آہوں کے ساتھ غربت کھڑی ہے خاک وخون میں لتھڑے ہوئے جسم پڑے ہیں، جہاں کھیتوں میں بھوک اگتی ہے، جہاں مزدوروں کا گوشت بکتا ہے، جہاں اجنبی ہاتھوں کا ستم اور بے کس دلوں کی تڑپ نظر آتی ہے۔ اب ان کی اپنی کم عقلی پر افسوس ہوتا ہے، وہ محبت کو زندگی کا مقصد سمجھ بیٹھے تھے اور اس کی ناکامی کو دنیا کا سب سے بڑا دکھ لیکن جب انسانیت کی طرف نظر اٹھی تو اندازہ ہوا کہ "اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا" اب زاویۂ نظر بدل چکا تھا۔ دل اب بھی دکھ سے بوجھل تھا لیکن اب اس دکھ میں زمانے کا غم تحلیل ہوتا نظر آتا ہے۔

اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا (۱۹)

جس طرح بیج سے نیا پودا نکلنے کے لیے مٹی کا نرم ہونا ضروری ہوتا ہے بالکل اسی طرح کسی کے درد و کرب کو محسوس کرنے کے لیے دل کا درد سے آشنا ہونا ضروری ہے۔ فیض کا یہ بڑا کارنامہ ہے کہ وہ اپنی ذات پر رُکے نہیں بلکہ اپنی ذات کے اندر ہونے والے کرب سے دوسرے آدمی کو پہچانا اور اس کرب کو جانا ہے جہاں تنہائی پسند ایہام پسندوں کی نظریں ٹھہر جاتی ہیں وہاں سے فیض نے ایک قدم آگے بڑھا کر درد کے شکار دوسرے آدمی تک اپنی حسیت اور شعور کا دائرہ پھیلایا کہ کرب و نشاط دونوں ایک ہی عمل کے دو رخ ہو گئے ہیں۔ ان کے نزدیک دوسرا آدمی انتہائی

دردو کرب کا وسیلہ ہے اور خود اپنی ذات کی اور اس کے نجی درد اور کرب کی پہچان بھی ہے۔ (۲۰) اور درد و کرب کی یہی انتہائیں ان کے کلام میں جلوہ گر ہیں۔

میں نے اس عشق میں کیا کھویا ہے اور کیا پایا — جز ترے اور کو سمجھاؤں تو سمجھا نہ سکوں
عاجزی سیکھی غریبوں کی حمایت سیکھی — یاس اور حرماں کے، دکھ درد کے معنی سیکھے
زیر دستوں کے مصائب کو سمجھنا سیکھا — سرد آہوں کے رخ زرد کے معنی سیکھے (۲۱)

ان کے دل میں اٹھنے والا یہ اجتماعی درد دراصل اس نظام جبر کی وجہ سے ہے جو استحصالی نظام کی دین ہے۔ اس دکھ کو دور کرنے کے لیے انھیں دکھ درد کی پوری مشینری اور طبقہ وارانہ استحصالی نظام سے نبرد آزما ہونا ہے اس جدوجہد میں وہ دکھ اٹھاتے رہے لیکن انسانیت کی خاطر جہاد کرتے رہے۔

جب کبھی بکتا ہے بازار میں مزدور کا گوشت — شاہراہوں پہ غریبوں کا لہو بہتا ہے
آگ سی سینے میں رہ رہ کے ابلتی ہے نہ پوچھ — اپنے دل پر مجھے قابو ہی نہیں رہتا ہے (۲۲)

مفلوک الحال اور غریب محنت کشوں سے جذباتی تعلق نیا نہ تھا اس کی جڑیں فیض کے دل میں ان کے بچپن سے موجود تھیں۔ ان کے والد گاؤں ''کالا قادر'' کے غریب کسان گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ فیض ہمیشہ اپنے مقدر کو غریب محنت کش انسانوں کے مقدر سے وابستہ کرتے رہے۔ یوں بھی غربت کو انھوں نے قریب سے دیکھا تھا فیض ابھی زیر تعلیم تھے کہ ان کے والد کا انتقال ہو گیا۔ تجہیز و تدفین کے فوراً بعد قرض خواہوں کے تقاضے شروع ہو گئے۔ فیض کے بڑے بھائی نے جائیداد فروخت کر کے یہ قرض چکایا، تھوڑی بہت جو جائیداد بچ گئی تھی وہ بھی دوسروں کے قبضے میں تھی اس لیے یہ خاندان مفلسی اور غربت کا شکار ہو گیا۔ (۲۳)

ہر منزل غربت پہ گماں ہوتا ہے گھر کا — بہلایا ہے ہر گام بہت دربدری نے (۲۴)

فیض بہتر زندگی کی جدوجہد میں غریب طبقے کا ساتھ دیتے رہے۔ اس کے لیے انھوں نے ہر طرح کی قربانی دی حتیٰ کہ جیل کی سلاخوں کے پیچھے قید تنہائی کی سزا کاٹی۔ یہ ان دنوں کی بات

ہے جب یورپ میں فاشزم کا عفریت آگ اور خون کی ہولی کھیل رہا تھا۔ ہٹلر نے جرمنی میں برسر اقتدار آتے ہیں جمہویت پسند سیاستدانوں اور روشن خیال ادیبوں، مفکروں، موسیقاروں اور سیاستدانوں پر عرصہ حیات تنگ کر دیا تھا۔ ان واقعات نے دنیا بھر کے حریت پسند ادیبوں کو چونکا دیا تھا۔ ان کو محسوس ہونے لگا کہ آزادی اور جمہوریت کے دشمنوں کا اگر آج جم کر مقابلہ نہ کیا گیا تو پرورش لوح و قلم کے امکانات باقی نہ رہیں گے اور فیض جیسے حساس شاعر کا ان حالات سے متاثر ہونا قدرتی بات تھی (۲۵) ایک باشعور اور حساس شاعر ہونے کی حیثیت سے انھیں اس ظلم وستم کا احساس تھا جو ہندوستان کی سیاسی تحریکوں پر روا رکھا جا رہا تھا۔ آواز اٹھانے والے کو ستم کا نشانہ بنایا جا رہا تھا۔ ایسے میں فیض سامراجی قوتوں کے آگے گھٹنے ٹیکنے کو تیار نظر نہیں آتے بلکہ ان کے لہجے کی لو اور تیز تر ہو جاتی ہے۔

منظور یہ تلخی یہ ستم ہم کو گوارا ــــ دم ہے تو مداوائے الم کرتے رہیں گے (۲۶)

انھیں یقین ہے کہ سامراجی نظام کے یہ سفاک اصول چند روز میں ٹوٹ کر بکھرنے والے ہیں اس لیے وہ عوام کو تسلی دینے کے انداز میں یہ کہتے ہیں

لیکن اب ظلم کی معیاد کے دن تھوڑے ہیں ــــ اک ذرا صبر کو فریاد کے دن تھوڑے ہیں (۲۷)

چند لوگوں کی جدوجہد بالکل ایسی ہوتی ہے جیسے بپھرے ہوئے سمندر میں زندگی کی جدوجہد کرتا اکیلا تنکا، جب کہ یہی جدوجہد اگر مل کر کی جائے تو بڑے سے بڑے طوفان کا رخ موڑا جا سکتا ہے۔ فیض نے اپنی نظم ''کتے'' میں عوم کی خفیہ قوتوں پر روشنی ڈال کر انھیں متحد ہونے کے لیے اُکسایا ہے۔ انھیں یقین ہے کہ عوام متحد ہو جائیں تو جابر حکومت کی مضبوط سے مضبوط بنیاد ہلائی جا سکتی ہے۔

یہ مظلوم مخلوق گر سر اُٹھائے ــــ تو انسان سب سرکشی بھول جائے

کوئی ان کو احساس ذلت دلا دے ــــ کوئی ان کی سوئی ہوئی دُم ہلا دے (۲۸)

قیام پاکستان کے بعد نئی سامراجی قوتیں اپنی ریشہ دوانیوں کے ساتھ معصوم عوام کے استحصال کے لیے وارد ہوگئیں۔ محنت کش طبقہ جو پہلے بھی پس رہا تھا اب بھی پستا رہا، فرق صرف اتنا ہے کہ پہلے غیروں کے ہاتھ تھے اب اپنوں کے۔ اب شاعر کو شدت سے احساس ہوتا ہے کہ یہ وہ سحر تو نہیں جس کے لیے انقلابیوں نے اپنا خون بہایا تھا اور وہ بے اختیار کہہ اٹھے۔

یہ داغ داغ اُجالا، یہ شب گزیدہ سحر　　وہ انتظار تھا جس کا، یہ وہ سحر تو نہیں (۲۹)

قیام پاکستان کے بعد فیض ''پاکستان ٹائمز'' کی ادارت سے وابستہ ہوگئے۔ اب فیض اپنے اخبار اور اداریوں میں پاکستان کی حکمران جماعت کے عمل اور لائحہ عمل کو کڑی تنقید کا نشانہ بنانے لگے۔ یہی نہیں بلکہ ایشیا اور افریقہ کے دوسرے ملکوں میں آزادی کی جدوجہد کی جو تحریکیں سر اٹھا رہی تھیں، فیض روحانی اور ذہنی طور پر ان میں شریک تھے۔ یہ زمانہ فیض کے سیاسی فکر و شعور کے عروج کا زمانہ تھا، اب فیض پہلے عشق سے نکل کر دوسرے عشق (سیاست) میں دل و جان سے مبتلا ہو چکے تھے۔

اس عشق، نہ اُس عشق پہ نادم ہے مگر دل　　ہر داغ ہے، اس دل میں بجز داغ ندامت (۳۰)

اس عشق کے نتیجے میں فیض احمد فیض اور ان کے دوسرے رفقا کو راولپنڈی سازش کیس میں ملوث قرار دے کر ۹ مارچ ۱۹۵۱ کی صبح گرفتار کر لیا گیا (۳۱) اپنی اس نا کردہ گناہی کی سزا پر ان کے لبوں پر طنز ابھر آیا۔

سر مقتل چلو بے زحمتِ تقصیر بسم اللہ　　ہوی پھر امتحان عشق کی تدبیر بسم اللہ (۳۲)

اس قید تنہائی میں فیض صاحب سے ان کے عزیزوں دوستوں کو ملنے کی اجازت نہیں تھی۔ نہ ہی وہ کسی سے خط و کتابت کر سکتے تھے (۳۳) کاغذ، قلم۔ دوات ایک ادیب یا شاعر کا سرمایہ ہوتی ہے۔ فیض سے یہ سرمایہ بھی چھین لیا گیا تو یہ درد شعر کی شکل میں یوں ابھرا۔

متاع لوح و قلم چھن گئی تو کیا غم ہے　　کہ خون دل میں ڈبولی ہیں انگلیاں میں نے (۳۴)

قید و بند کا یہ تجربہ فیض کی زندگی اور شاعری دونوں کے لیے انقلابی جہات کا حامل بن گیا۔ بظاہر وہ دنیا کے سارے رشتوں، ہنگاموں اور تحریکوں سے منقطع ہو کر تنگ و تاریک قید خانوں کے اسیر ہو گئے تھے لیکن اس تنہائی نے ان کی پنہاں صلاحیتوں اور حسی قوتوں کو بیدار کر دیا تھا۔ اس تنہائی میں اشعار ان پر وحی کی طرح نازل ہوتے رہے، فن کے سوتے پھوٹتے رہے۔ وطن کی محبت، غریبوں کی آہیں، مظلوموں کی پکار اور پھر آنے والے پر مسرت دور کی آہٹیں، سبھی کچھ ان پر اثر انداز ہو رہی تھیں۔ یہ شعور و آگہی ان کے فن کو اور جلا بخش رہی تھی۔ وہ اپنے شعور و ادراک سے جیل کی چار دیواری کے دوسری طرف کی چہل پہل منور منور شہر کو دیکھ رہے تھے۔

دور افق تک گھٹتی، بڑھتی اٹھتی گرتی رہتی ہے کہر کی صورت بے رونق دردوں کی گدلی لہر

بستا ہے اس کہر کے پیچھے روشنیوں کا شہر (۳۵)

راولپنڈی سازش کیس میں فیض کی گرفتاری کا سانحہ، ان کے لیے معمولی سانحہ نہ تھا، اس زمانہ کے اخبارات اور دستاویزات سے اندازہ ہوتا ہے کہ فیض اس سازش کا سرکردہ ہی نہیں، اس کے گرفتاروں میں سب سے خطرناک بانی سمجھا جا رہا تھا۔ ۹ مارچ ۱۹۵۱ء کی صبح کو جب وہ گرفتار ہوئے اس دن وزیر اعظم نے پارلیمنٹ میں یہ بیان دے کر سنسنی پھیلا دی کہ سازشی افراد کمیونسٹ اور انقلابی ذرائع کی کمک سے بذریعہ تشدد حکومت کا تختہ الٹنا چاہتے تھے۔ ان الزامات کے پیش نظر بیشتر اخبارات نے فیض کو ملک و قوم کا غدار کہا اور بقول میجر اسحاق کچھ اخباروں نے ''غدار نمبر'' شائع کر دیئے۔ (۳۶) فیض کو اپنوں سے اس بے رحمی کی امید نہ تھی اس لیے ان کے دل سے شعر کی شکل میں ایک آہ نکلی۔

چھوڑا نہیں غیروں نے کوئی ناوک دشنام چھوٹی نہیں اپنوں سے کوئی طرز ملامت (۳۷)

اس سے بڑھ کر بے بسی اور کیا ہو گی کہ شہر کے وہ لوگ جو ان کے مدّاح تھے اور ان کا کلام سن کر سر دھنتے تھے اب فیض کی رسوائی اور بے بسی کا تماشہ دیکھنے کے لیے جمع تھے۔ جب لاہور جیل سے ریمانڈ کے لیے فیض اور ان کے ساتھیوں کو جج صاحب کی کوٹھی لے جایا گیا تو وہاں چھتوں پر

بہت سے لوگ تماشہ دیکھنے کے لیے جمع ہو گئے تھے۔(۳۸) ان کے چہروں پر فیض کے لیے ہمدردی کے بجائے سرد مہری تھی۔ایسے میں فیض اپنی کیفیت چھپا نہ سکے۔

اس راہ میں جو سب پہ گزرتی ہے وہ گزری   تنہا پس زنداں، کبھی رسوا سر بازار (۳۹)

آج بازار میں پابجولاں چلو   آج حاکم بھی ہے، مجمع عام بھی (۴۰)

قید تنہائی کے کرب سے انسان چڑچڑا ہو جاتا ہے۔جیل کی چار دیواری انسانوں پر حیوانی بندشیں عائد کر کے اس کی حرکات وسکنات، اس کے فکر ونظر کو محدود کر دیتی ہے۔اپنی اس بے بسی پر انسان خود لہو کے آنسو رو رہا ہوتا ہے۔اس پر مستزاد یہ کہ جیل کے بعض افسران کا رویہ قیدیوں کے ساتھ نہایت ہتک آمیز ہوتا ہے، وہ ان کی دل شکنی کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔لیکن فیض جیسے پر عزم انسان نے ان حالات کو اپنے اوپر حاوی نہیں ہونے دیا بلکہ اپنی تخلیقی لو تیز تر کر دی۔اس ذہنی فشار سے بچنے کے لیے انھوں نے شاعری میں پناہ ڈھونڈ نکالی لیکن شاعری بذات خود دل وجگر کے ایندھن سے جلا پائی ہے۔

جب کج قفس مسکن ٹھہرا اور جیب وگریباں طوق ورسن

آئے کہ نہ آئے موسم گل اس درد جگر کا کیا ہو گا (۴۱)

جیل کے ماحول میں رہ کر بھی فیض نے ہمت نہیں ہاری لیکن اس بلند ہمتی کے باوجود ان کے اشعار مین غم زدگی اور آزردگی کی ایک چھبتی ہوئی لہر ملتی ہے۔اس کا محرک صرف گوشۂ زنداں کی تنہائی نہ تھی بلکہ اپنی محبوب بیوی اور بچیوں سے دوری کا احساس بھی تھا۔

شرح فراق، مدح لب مشکبو کریں   غربت کدے میں کس سے تری گفتگو کریں (۴۲)

قفس اداس ہے یار و صبا سے کچھ تو کہو   کہیں تو بہر خدا آج ذکر یار چلے (۴۳)

لیکن یہ فیض کا کمال ہے کہ تنہائی میں بھی انجمن سجا لیتے ہیں اور یہ تخیلاتی انجمن انھیں فراق میں بھی وصال یار کا لطف دیتی ہے۔

کب یاد میں تیرا ساتھ نہیں، کب بات میں تیرا بات نہیں
صد شکر کہ اپنی راتوں میں اب ہجر کی کوئی رات نہیں (۴۴)

فیض کو صرف اپنی بیوی بچوں سے جدائی کا دکھ نہیں تھا بلکہ دوست احباب کی کج خلقی نے ان کی روح کو گھائل کر دیا تھا۔ ان کی بیٹی سلیمہ نے ڈاکٹر ایوب مرزا کو بڑے دکھ سے یہ بتایا کہ فیض کے تمام دوست احباب نے ان کے گھر آنا جانا ترک کر دیا تھا۔ اسکول میں اُستانیاں سات آٹھ سال کی ننھی سلیمہ کے سامنے فیض کو ملک وقوم کا غدار کہہ کر گالیاں دیتیں۔ بچی کے کانوں تک یہ افواہیں پہنچائی جاتی تھیں کہ فیض کے ہاتھوں کی انگلیاں کاٹ دی گئیں ہیں، ان کی ٹانگوں کی ہڈیاں توڑ دی گئیں اور آنکھوں کو کھرچ کر نکال دیا گیا ہے۔ (۴۵) یہ باتیں ننھی بچی کے دل کو چیر جاتی تھیں اور اپنے معصوم بچوں پر ہونے والے اس ظلم نے ان کی تنہائی میں مزید اضافہ کر دیا۔

یہ دل کے داغ تو دکھتے تھے یوں بھی پر کم کم　　کچھ اب کے اور ہے ہجرانِ یار کا موسم (۴۶)

خواب ہی خواب میں بیتاب نظر ہونے لگی　　عدم آبادِ جدائی میں سحر ہونے لگی (۴۷)

حالات کے اس رخ نے ان کے لہجے میں تلخیاں بھر دیں، اب ان کے لہجے میں للکار کی گونج سنائی دینے لگی۔

ظلم کا زہر گھولنے والے　　کامراں ہو سکیں گے آج نہ کل
جلوہ گاہ وصال کی شمعیں　　چاند کو گل کریں تو ہم جانیں (۴۸)

اسیران قفس کے لیے وقت ملاقات عید کی سی خوشی سے کم نہیں ہوتی۔ وہ چوبیس میں سے تئیس گھنٹے اس ایک گھنٹے کے انتظار میں گزارتے ہیں۔ یہ لمحہ فیض کے لیے بھی بڑی اہمیت کا حامل تھا جس کا اظہار انہوں نے بڑے دلکش پیرائے میں کیا ہے۔

اپنی تنہائی سے گویا ہوئی پھر رات مری　　ہو نہ ہو آج پھر آئی ہے ملاقات مری (۴۹)

کب ٹھہرے گا اے دل تو کب رات بسر ہوگی　　سنتے تھے وہ آئیں گے، سنتے تھے سحر ہوگی (۵۰)

قید تنہائی کی صعوبتوں نے آخر کار حساس دل شاعر کو علیل کر دیا۔ جولائی اگست ۵۳ء میں فیض بغرض علاج کراچی لائے گئے (۵۱) یہاں انھیں جیل کی نسبت قدرے آزادی نصیب ہوئی، دوستوں، ملاقاتیوں سے ملنے کا موقع حاصل ہوا۔ جناح ہسپتال میں انھوں نے چند اشعار کہے، ان اشعار میں طبیعت میں اضمحلال کے باوجود اسیری کی کوفت کے بجائے خوشیوں کا رنگ جھلکتا ہے

صبح کی آج جو رنگت ہے وہ پہلے تو نہ تھی کیا خبر آج خراماں سرِ گلزار ہے کون
شام گلزار ہوئی جاتی ہے دیکھو تو سہی یہ جو نکلا ہے لیے مشعلِ رخسار، ہے کون (۵۲)

ہسپتال میں چونکہ عزیزوں سے ملنے جلنے میں کوئی قباحت نہ تھی۔ اسیری کے بعد اس آزادی کو فیض نے شدت سے محسوس کیا۔ اس شدید احساس کے بعد جب وہ منٹگمری آئے تو قید کا احساس بھی شدت پکڑ گیا۔ یہ شدت ان کی شاعری میں یوں نمایاں ہوتی ہے کہ انھوں نے کراچی اور منٹگمری میں لکھی ہوئی نظموں اور غزلوں کے مجموعے کا نام ہی ''زنداں نامہ'' تجویز کیا۔ ان کی معرکہ آرا نظم ''ملاقات'' ان کی اس ذہنی کیفیت کی ترجمانی کرتی ہے یہ نظم درد کی انتہائی شدت کے ساتھ انتہائی تسکین کی بھی مظہر ہے۔

فیض کی جیل کی اکثر شاعری وطن کی محبت سے پُر ہے اور وہ اپنے وطن اور ہم وطنوں کی خستہ حالی، قوم کی عزت و ناموس کی ارزانی، ان کی ناداری، جہالت، بھوک اور غم کو دیکھ دیکھ کر بری طرح تڑپتے رہے۔

نثار میں تری گلیوں کے اے وطن کہ جہاں چلی ہے رسم کہ کوئی نہ سر اٹھا کے چلے
جو کوئی چاہنے والا طواف کو نکلے نظر چرا کے چلے جسم و جاں بچا کے چلے (۵۳)

''غدارِ وطن'' کا خطاب پانے والے اس محبِ وطن نے جیل کی کال کوٹھری کی پریشانی میں صرف وطن عزیز کو سجانے سنوارنے کے خواب دیکھے۔

بجھا جو روزنِ زنداں تو دل یہ سمجھا ہے کہ تیری مانگ ستاروں سے بھر گئی ہوگی
چمک اٹھے ہیں سلاسل تو ہم نے جانا ہے کہ اب سحر ترے رخ پر بکھر گئی ہوگی (۵۴)

لیکن لیلائے وطن کو سنوارنے کے لیے خون بہانے والے جیالوں کی ضرورت تھی، محبانِ وطن کے اندر تحریک پیدا کرنے کی ضرورت تھی اور یہ تحریک فیض نے پیدا کر دی تھی اس لیے کہ انھیں یقین تھا کہ وطن کو سنوارنے کا جو بیڑا انھوں نے اٹھایا ہے اسے سنبھالنے والے بہت سے عاشقانِ وطن ان کے قدم سے قدم ملائیں گے۔

قتل گاہوں سے چن کر ہمارے علم   اور نکلیں گے عشاق کے قافلے   (۵۵)

وہ جانتے تھے کہ حق و باطل کی اس جنگ میں ابھی بہت سی مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ عاشقانِ وطن کو اپنے خون کا نذرانہ دینا ہوگا اس لیے فیض محبانِ وطن کو آنے والے اس کڑے وقت کے لیے آمادہ کرنے لگے۔

ہاں تلخی ایام ابھی اور بڑھے گی   ہاں اہل ستم مشق ستم کرتے رہیں گے   (۵۶)

وہ ان جیالوں کو یہ نوید بھی سناتے ہیں کہ ان مصائب کے بعد کامیابی ان کا مقدر ہونے والی ہے، کیونکہ

آخر کو سرفراز ہوا کرتے ہیں احرار   آخر کو گرا کرتی ہے ہر جور کی تعمیر   (۵۷)

نہ صرف یہ کہ کامیابی ان کا مقدر ہوگی بلکہ جمہوریت آنے کے بعد وہ آمر حکمران جو آج ظلم و ستم پر آمادہ ہیں کیفر کردار کو پہنچیں گے۔

ہر اک اولی الامر کو صدا دو   کہ اپنی فردِ عمل سنبھالے
اٹھے گا جب جیشِ سرفروشاں   پڑیں گے دار و رسن کے لالے
کوئی نہ ہوگا کہ جو بچالے   جزا سزا سب یہیں پہ ہوگی
یہیں عذاب و ثواب ہوگا   یہیں پہ روزِ حساب ہوگا   (۵۸)

جب انسان کی ساری کوششیں، ساری محنتیں رائیگاں جانے لگتی ہیں تو وہ کسی غیبی طاقت کی مدد کا انتظار کرتا ہے۔ یوں تو ان کی شاعری ارمانوں، امیدوں اور خوابوں کے خون سے لالہ رنگ

ہے لیکن کہیں کہیں مایوسی سے طاری ہونے والی جھنجھلاہٹ بھی دکھائی دیتی ہے۔ اگرچہ یہ مایوسی خال خال ہے۔ ایسے میں وہ اپنے خالق حقیقی کی طرف رجوع کرتے ہوئے اس کا انصاف طلب کرتے ہیں۔

مٹ جائے گی مخلوق تو انصاف کروگے　　منصف ہو تو اب حشر اٹھا کیوں نہیں دیتے　(۵۹)

انسانیت کے ناطے ہر شخص پر معاشرے کی طرف سے کچھ ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں بحیثیت شاعر فیض پر تو دوہری ذمہ داری عائد تھی انھیں نہ صرف اپنے فن کو سنوارنا تھا بلکہ معاشرے کے دکھتے ناسوروں کو بھی بے نقاب کرنا تھا۔

ہر مصیبت میں ہم، ہر زمانے میں ہم　　زہر پیتے رہے، گیت گاتے رہے
جان دیتے رہے زندگی کے لیے　　ساعت وصل کی سرخوشی کے لیے　(۶۰)

آخری ایام میں فیض زندگی کے دکھ سکھ کا حساب کرنے کے لیے عمر رفتہ کو آواز دیتے ہیں اور اپنے بچپن اور شباب کے گزرنے کا نوحہ بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں

مجھ کو شکوہ ہے مرے بھائی کہ تم جاتے ہوئے　　لے گئے ساتھ مری عمر گزشتہ کی کتاب
اس میں تو میری بہت قیمتی تصویریں تھیں　　اس میں بچپن تھا مرا، اور مرا عہد شباب
مجھ کو لوٹا دو مری عمر گزشتہ کی کتاب　(۶۱)

زندگی کی بے ثباتی اپنے حزن و یاس کی وجہ سے اکثر حساس شعرا کا موضوع رہی ہے۔ انسان کی محدود اور چند روزہ زندگی ہمیشہ سے اس لامحدود اور بیکراں کائنات سے متصادم رہی ہے۔ انسانی فطرت کا تقاضہ ہے کہ وہ اس بیکراں کائنات کو مسخر کر لے مگر محدود زندگی آڑے آجاتی ہے۔ انسانی خواہشات کی یہ نا آسودگی اس کے اندر دکھ کی دھیمی لہر پیدا کر دیتی ہے۔ فیض کے اشعار میں بھی زندگی کی بے ثباتی اور خواہشات کی نا آسودگی کا درد ہلکورے لیتا نظر آتا ہے۔

زندگی ایک خواب ہے گویا　　ساری دنیا سراب ہے گویا

اور جب زندگی محض ایک سراب ہے تو بہتر یہ ہے کہ موت کو گلے لگا کر حقیقت سے آشنائی حاصل کی جائے۔ فیض نے بھی زندگی کی بے ثباتی اور موت کی صداقت کو تسلیم کر کے موت کے سامنے ہتھیار ڈال دینے کا فیصلہ کر لیا۔

جینے کے فسانے رہنے دو اب اس میں الجھ کر کیا لیں گے
اک موت کا دھندا باقی ہے جب چاہیں گے نپٹا لیں گے
یہ تیرا کفن، وہ میرا کفن یہ میری لحد، وہ تیری ہے

حواشی

ا۔ فیض احمد فیض ''فیض از فیض'' مشمولہ ''نسخہ ہائے وفا'' ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۱۹۹۷، ص ۳۰۸ (۲) فیض احمد فیض ''نسخہ ہائے وفا'' ص ۱۲۹ (۳) فیض احمد فیض ''زندگی'' مشمولہ ''نسخہ ہائے وفا'' ص ۳۴۴ (۴) ایضاً ص ۴۴۰ (۵) ایضاً ص ۲۶۰ (۶) فیض احمد فیض ''میں تیرے سپنے دیکھوں'' ص ۴۶۹ (۷) ''خدا وہ وقت نہ لائے'' ص ۱۵ (۸) ''نسخہ ہائے وفا'' ص ۲۹۳ (۹) پروفیسر سلامت اللہ خان ''انتظار اور تنہائی کا شاعر'' مشمولہ فیض احمد فیض، تنقیدی جائزہ'' مرتبہ خلیق انجم، انجمن ترقی اردو نئی دہلی، ۱۹۸۵، ص ۱۵۰ (۱۰) فیض احمد فیض ''یاد'' مشمولہ ''نسخہ ہائے وفا'' ص ۱۸۴ (۱۱) ''تنہائی'' ص ۶۳ (۱۲) ''مری جاں اب بھی اپنا حسن واپس پھیر دے مجھ کو'' ص ۶۳ (۱۳) ''غزل'' ص ۱۷۷ (۱۴) قمر رئیس ''فیض کے دو عشق'' مشمولہ ''فیض احمد فیض، تنقیدی جائزہ'' ص ۱۰۴ (۱۵) فیض احمد فیض ''مرگ سوز محبت'' مشمولہ ''نسخہ ہائے وفا'' ص ۷۷ (۱۶) ''غزل'' ص ۱۱۰ (۱۷) ''رقیب سے'' ص ۶۱
(۱۸) ایضاً (۱۹) ایضاً (۲۰) پروفیسر محمد حسن ''فیض اور دوسرا آدمی'' مشمولہ ''فیض کے مغربی حوالے'' مرتبہ، اشفاق احمد، جنگ پبلشر، اکتوبر ۱۹۹۲ء ص ۳۲۷ (۲۱) فیض احمد فیض ''رقیب سے'' مشمولہ ''نسخہ ہائے وفا'' ص ۶۱ (۲۲) ایضاً (۲۳) خلیق انجم ''فیض بیتی'' مشمولہ ''فیض

احمد فیض، تنقیدی جائزہ'' ص ۱۵ (۲۴) فیض احمد فیض ''غزل'' مشمولہ ''نسخہ ہائے وفا''
ص ۳۷۰ (۲۵) سید سبط حسن ''فیض کا آدرش'' مشمولہ ''فیض احمد فیض، تنقیدی جائزہ'' ص ۱۱۶
(۲۶) فیض احمد فیض ''لوح و قلم'' مشمولہ ''نسخہ ہائے وفا'' ص ۱۲۰ (۲۷) چند روز اور مری جان
فقط چند ہی روز'' ص ۶۷ (۲۸) ''کتے'' ص ۸۰ (۲۹) ''صبح آزادی اگست ۴۷'' ص ۱۱۶
(۳۰) ''دو عشق'' ص ۱۴۶ (۳۱) ڈاکٹر راج بہادر گوڑ ''فیض احمد فیض کا شعری سفر'' مشمولہ
''فیض احمد فیض تنقیدی جائزہ'' ص ۱۷۲ (۳۲) فیض احمد فیض ''شورش زنجیر بسم اللہ'' مشمولہ ''
نسخہ ہائے وفا'' ص ۳۳۶ (۳۳) سابق میجر محمد اسحاق ''روداد قفس'' مشمولہ ''نسخہ ہائے وفا''
ص ۱۳ (۳۴) فیض احمد فیض ''غزل'' ''مشمولہ'' ص ۱۰۷ (۳۵) ''اے روشنیوں کے شہر''
ص ۲۶۲ (۳۶) ڈاکٹر قمر رئیس ''فیض کی حسیہ شاعری اور اس کے تناظرات'' مشمولہ ''فیض کے
مغربی حوالے'' ص ۲۵۰ (۳۷) فیض احمد فیض ''دو عشق'' مشمولہ ''نسخہ ہائے وفا'' ص ۱۴۶
(۳۸) سابق میجر محمد اسحاق ''روداد قفس'' ص ۱۳ (۳۹) فیض احمد فیض ''غزل'' مشمولہ ''نسخہ
ہائے وفا'' ص ۱۴۶ (۴۰) آج بازار میں پابجولاں چلو'' ص ۳۳۸ (۴۱) ''پہلی آواز'' ص
۱۴۴ (۴۲) ''غزل'' ص ۳۷۱ (۴۳) ایضاً ص ۲۶۴ (۴۴) ایضاً ص ۲۵۹ (۴۵) ڈاکٹر قمر
رئیس ''فیض کی حسیہ شاعری اور اس کے تناظرات'' ص ۲۵۱ (۴۶) فیض احمد فیض ''طوق
و دار و رسن'' مشمولہ ''نسخہ ہائے وفا'' ص ۱۲۷ (۴۷) ''قید تنہائی'' ص ۳۴۱ (۴۸) ''اور زنداں
میں ایک شام'' ص ۱۸۰ (۴۹) ''ملاقات مری'' ص ۳۴۸ (۵۰) ''غزل'' ص ۳۴۷
(۵۱) ڈاکٹر راج بہادر گوڑ'' فیض احمد فیض کا شعری سفر'' ص ۱۷۷ (۵۲) فیض احمد فیض
''غزل'' مشمولہ '' نسخہ ہائے وفا'' ص ۲۹۲ (۵۳) '' نثار میں تیری گلیوں کے'' ص ۱۶۲
(۵۴) ایضاً (۵۵) ''ہم تاریک راہوں میں مارے گئے'' ص ۲۶۷ (۵۶) ''لوح و قلم''
ص ۱۱۹ (۵۷) ''جیل سے آزادی کے بعد'' ص ۵۷۲ (۵۸) ''ندائے غیب'' ص ۳۳۹
(۵۹) '' غزل'' ص ۳۳۴ (۶۰) ''شاعر لوگ'' ص ۲۲۷ (۶۱) ''نوحہ'' ص ۱۵۴
(۶۲) ''سرو شبانہ'' ص ۲۶ (۶۳) ''شورش بربط و نے، (پہلی آواز)'' ص ۲۲

رضیہ مشکور (باسٹن امریکہ)

نقشِ فریادی۔۔ جذباتیت ورومانیت کا مجموعہ

دل رہینِ غمِ جہاں ہے آج ہر نفس تشنۂ فغاں ہے آج

سخت ویراں ہے محفلِ ہستی اے غمِ دوست تو کہاں ہے آج

شاعر کی خاصیت یہ ہوتی ہے کہ وہ عام آدمی نہیں ہوتا۔ یہ ضرور ہے کہ اس کا دل عام آدمیوں کی طرح دھڑکتا، سوچتا اور محسوس کرتا ہے۔ اس کی حاجتیں، دُکھ سُکھ سب ویسے ہی ہوتے ہیں جیسے کہ ہمارے آپ کے ، ہاں اس کو عام انسان سے منفرد صرف اس کی فکر بناتی ہے۔

فیض نے سیاسی اور سماجی اعتبار سے قدرے خشک اور اتھل پتھل کا زمانہ پایا۔ غیر منقسم ہندوستان اور تقسیم کی اُڑائی ہوئی دھول نے جو آنکھوں میں دھندلاہٹ پیدا کی تھی اس کے ذرات نے عوام کی زخمی آنکھوں سے خون بہایا۔ یہ برصغیر کے لیے وہ وقت تھا جہاں سب ادنیٰ و اعلیٰ، امیر غریب، جاہل اور تعلیم یافتہ، ہر فرقے، مذہب اور عقیدے کے ماننے والے کسی ایسی تبدیلی کے خواب دیکھ رہے تھے جس کی بدولت انہیں ذہنی سماجی، سیاسی اور مذہبی سکون ملے۔ چنانچہ یہی وہ وقت بھی ہے جب برصغیر میں سب سے زیادہ تحریکات پیدا ہوئیں۔ سیاسی، سماجی، مذہبی تحریکات کے شانہ بہ شانہ ادبی تحریکات کا بازار بھی خاصہ گرم رہا۔ ترقی پسند تحریک نے بغاوت کی جن چنگاریوں سے ادبی حلقہ میں شعلے بھڑکائے تھے اس کے ساتھ ساتھ اشتراکیت نے سماجی زندگی میں بھی عوامی ذہن کو انفرادی سطح پر متاثر کیا۔ اس طرح یہ دو تحریکیں تقسیم ہوتے برصغیر کی بڑی واضح اور متاثر کن تحریکیں بن کر ابھریں۔ اور کم و بیش ہر زبان کا ادیب و شاعر اس سے شعوری یا لاشعوری طور پر جُڑتا چلا گیا۔ ظاہر ہے جس کا اثر زندگی کے ہر شعبہ پر براہِ راست پڑ رہا تھا۔ تو ادب

کیسے پیچھے رہتا، ادب بھی اس سے متاثر تھا اور ادیب بھی۔ نظم و نثر میں ان تحریکات کی بلند و بالا آوازیں صاف سُنی جا سکتی ہیں۔ بعض شعراء اور ادیبوں نے ان تحریکات کو اُسی مینی فیسٹو کے ساتھ برتا جن اصولوں پر وہ تحریکات متعارف کی گئی تھیں بعض نے ذہنی طور پر ان میں اپنی اختراعات کو ترجیح دی، اور اپنے دل کی آواز پر لبیک کہا۔

تقسیم سے چند سال قبل (۱۹۴۳ء) میں "نقش، فریادی" منظر عام پر آیا۔ فیض اس وقت تک عوام والناس میں اپنی شناخت قائم کر چکے تھے۔ مجموعہ کا مطالعہ خالص رومانیت اور جذبات نگاری کے تاثرات سے پُر ہے۔ اس مجموعہ کے مطالعہ کا سارا حُسن یہ ہے کہ اس میں اشتراکیت اور ترقی پسندی کے مبہم تاثر کے ساتھ شعر کے فن کو اس طرح شامل کیا گیا ہے کہ تمام تحریکات پس منظر میں چلی گئیں اور اس پر وہ فن حاوی ہو گیا جس نے فیض کی آواز کو کائنات کے اس سب سے عظیم جذبے جسے محبت کہتے ہیں کا خوگر بنا دیا

اپنی تکمیل کر رہا ہوں میں ورنہ تجھ سے تو مجھ کو پیار نہیں

محبت کا دامن وسیع تر ہے عشق کی یہ وہ منزل ہے جہاں اپنا آپ باقی نہیں رہتا۔ یہ وہ نزاکتیں ہیں جو اہلِ دل ہی کا سرمایہ ہیں۔ فرزانوں کو اس سے کیا کام؟ یہ وہ جذبہ ہے جو دل میں پیدا ہوتا ہے، دنیا میں محبت سے خالی دل سے زیادہ بدتر کچھ نہیں۔ اس میں وطن، محبوب، آزادیٔ فکر، مساوات، انسانیت، خوش آئیند زندگی کے خواب، سعی مسلسل کی کوششیں، سبھی کچھ شامل ہے۔ اس کی لامحدود وسعتیں آدمی کے اپنے ذوق سلیم پر منحصر ہیں کہ ان میں سے وہ کون سا راستہ چنتا ہے۔

فیض کی شاعری میں فن کی ان نزاکتوں کے ساتھ جو سرگوشیوں اور گنگناہٹ کی زیرلبی ہے وہ ان کی شاعری کا متاثر کن پہلو ہے۔ جس کے لیے انہوں نے دل سے وطن کی محبت سے عوام کے دکھ پہچانے۔ تب وہ وہاں تک پہنچے جہاں زندگی کے ہر شعبہ سے پیار کر کے آدمیت کی معراج حاصل کی جاتی ہے، انسانیت کی تکمیل کا راز اسی میں مضمر ہے۔ یہ خود کلامی اور زیرلبی کی کیفیت "نقشِ فریادی" کے صفحات پر بکھری پڑی ہے۔ ان کی نظم "تنہائی" میں یہ کیفیت صاف محسوس کی

جا سکتی ہے۔

پھر کوئی آیا دلِ زار! نہیں کوئی نہیں | راہرو ہوگا کہیں اور چلا جائے گا
ڈھل چکی رات، بکھرنے لگا تاروں کا غبار | لڑکھڑانے لگے ایوانوں میں خوابیدہ چراغ
سو گئی راستہ تک تک کے ہر اک راہگزر | اجنبی خاک نے دھندلا دیئے قدموں کے سراغ
گل کرو شمعیں بجھا دو مے و مینا و ایاغ | اپنے بے خواب کواڑوں کو مقفل کر لو

اب یہاں کوئی نہیں کوئی نہیں آئے گا

ایک اور نظم "خدا وہ وقت نہ لائے"۔۔۔کو اگر ہم غور سے پڑھیں تو ہمیں اپنے اس جملے کی صداقت کا ثبوت مل جاتا ہے کہ فیض نے دل سے وطن کی محبت اور وطن کی محبت سے عوام کے دکھ پہچانے

خدا وہ وقت نہ لائے کہ سوگوار ہو تو | سکوں کی نیند تجھے بھی حرام ہو جائے
تری مسرتِ پیہم تمام ہو جائے | تری حیات تجھے تلخ جام ہو جائے
غموں سے آئینہ دل گداز ہو تیرا | طویل راتوں میں تو بھی قرار کو ترسے
تری نگاہ کسی غمگسار کو ترسے | خزاں رسیدہ تمنا بہار کو ترسے
کوئی جبیں نہ ترے سنگِ آستاں پہ جھکے | وہ دل کے تیرے لیے بے قرار اب بھی ہے

وہ آنکھ جس کو ترا انتظار اب بھی ہے

وطن اور محبوب دونوں کے پس منظر میں یہ نظم فیض کی محبت کے ان گوشوں سے کلام کرتی ہے۔ جو ان کے دل میں پوشیدہ تھے اور جنھیں وہ ساری زندگی زبان دیتے رہے۔ حالانکہ یہ انتظار کی کیفیت بھی بہت دیر باقی نہیں رہتی کہ۔۔۔

اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا | راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا

مگر یہاں محبت کی ناکامی انہیں ازلی محبوب کی طرح توڑتی نہیں بلکہ مثبت راہوں کا پتہ دیتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کا محبوب ان کی آنکھوں سے کبھی دور نہیں ہوتا بلکہ ان کے تصور میں بستا

ہے، بولتا چلتا پھرتا نظر آتا ہے۔۔محبوب سے مکالمہ ان کی شاعری کا ایک اور حسین پہلو ہے۔ بلکہ کہنا چاہیے کہ مکالماتی بیان میں فیض کو کمال حاصل ہے۔ یہ سرگوشیاں ان کے کلام میں جا بجا مل جائیں گی۔ ''آخری خط۔ تنہائی۔ انتظار۔ حسینۂ خیال۔ انجام۔ سرودِ شبانہ'' میں خاص طور سے محسوس کی جاتی ہیں۔ یہ قطعہ دیکھیے۔۔۔

فضائے دل پہ اُداسی بکھرتی جاتی ہے فسردگی ہے کہ جاں تک اُترتی جاتی ہے
فریب زیست سے قدرت کا مُدّعا معلوم یہ ہوش ہے کہ جوانی گزرتی جاتی ہے

''خدا وہ وقت نہ لائے۔۔۔'' میں فیض جس امید و یاس کے کرب سے گزر رہے ہیں ''انجام'' میں وہ اس کرب کی منزل سے نکل آئے ہیں۔ وہ کہہ چکے کہ محبت کی دنیا پہ شام آچکی ہے مگر وہ ازلی عاشق کی طرح دل پکڑ کر نہیں بیٹھے بلکہ۔۔

مچلتی ہیں سینے میں لاکھ آرزوئیں تڑپتی ہیں آنکھوں میں لاکھ التجائیں
تغافل کے آغوش میں سو رہے ہیں تمہارے ستم اور میری وفائیں
مگر پھر بھی اے میرے معصوم قاتل تمہیں یاد کرتی ہیں میری دعائیں

سچ تو یہ ہے کہ ان کا کلام انسانی زندگی کے ان تمام جذبات و احساسات کی ترجمانی کرتا ہے جو عام آدمی کے دل میں پل پل پیدا ہوتے اور ٹوٹتے ہیں تو کبھی، اُسے سہارا دیتے رہتے ہیں۔ مگر پھر بھی زندگی اسے خوبصورت لگتی ہے انہیں زندگی سے کوئی شکوہ نہیں۔ بلکہ وہ تو زندگی کے لیے جدوجہد کے ساتھ خوش آیند مستقبل کے خواب بُنتے رہے ہیں جس کی واضح گونج ہمیں ان کے بعد کے مجموعوں میں سنائی دیتی ہے۔

ان کے اس اوّلین مجموعہ کا مطالعہ آپ کو محبتوں کی ان جہتوں سے روشناس کراتا ہے جو عاشقِ صادق کی میراث ہیں۔ مگر وہ اس کی نفی کے ساتھ اعتراف کی کیفیت سے گزرتے ہیں۔ محبت اپنی جگہ مگر۔۔۔۔

مجھ سے پہلی سی محبت میرے محبوب نہ مانگ

اور بھی دُکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا ۔۔۔۔۔ راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا

مگر اس کو کیا کریں کہ وہ جو تصور میں بستا ہے اسے انظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔۔۔۔۔

ادائے حسن کی معصومیت کو کم کر دے ۔۔۔۔۔ گناہ گار نظر کو حجاب آتا ہے

فریب آرزو کی سہل انگاری نہیں جاتی ۔۔۔۔۔ ہم اپنے دل کی دھڑکن کو تری آوازِ پا سمجھے

عشق دل میں رہے تو رُسوا ہو ۔۔۔۔۔ لب پہ آئے تو راز ہو جائے

''سرودِ شبانہ'' میں یہ جذبات اظہار کے پورے شباب پر ہیں۔ جس کا پہلا ہی مصرعہ۔۔۔''گم ہے اک کیف میں فضائے حیات''۔۔۔۔۔

اے کہ تو رنگ و بو کا طوفاں ہے ۔ زندگی تیرے اختیار میں ہے

پھول لاکھوں برس نہیں رہتے ۔ دو گھڑی اور ہے بہارِ شباب

آ کہ کچھ دل کی سُن سنالیں ہم ۔۔۔۔۔ آ محبت کے گیت گالیں ہم

اس مجموعے میں رقیب سے دوستی کا اک احساس بھی ملتا ہے جس کی وجہ بھی یہی ہے کہ وہ بھی اُسی درد سے گزرتا ہے جو عاشق کا نصیب ہے اس لیے فیض نے بھی اس سے روائتی دوستی رکھی۔ کیونکہ محبت کو وہی سمجھ سکتا ہے جس نے محبت کی ہو۔ یوں رقیب ان کا ہم منصب بن جاتا ہے ''رقیب سے۔۔۔''

آکہ وابستہ ہیں اُس حسن کی یادیں تجھ سے ۔۔۔۔۔ جس نے اس دل کو پری خانہ بنا رکھا تھا

اپنی شعری فکر کو جلا دینے کے لیے انہوں نے جو تراکیب الفاظ استعمال کی ہیں اور جس نے نقشِ فریادی کو جذباتیت ورومانیت کا مجموعہ بنا دیا ہے۔ وہ اس مجموعے کو ہمیشہ زندہ رکھے گا۔ اس مجموعہ کے پہلے ہی دو شعر دیکھئے۔۔۔

رات یوں دل میں تری کھوئی ہوئی یاد آئی ۔ جیسے ویرانے میں چپکے سے بہار آجائے

جیسے صحراؤں میں ہولے سے چلے بادِ نسیم ۔۔۔۔۔ جیسے بیمار کو بے وجہ قرار آجائے

الفاظ کی ترکیب کی ندرت نے ان کے کلام کو جو بلا کا حُسن عطا کیا ہے۔ وہ چاشنی دیر تک قاری کو اس کا اسیر رکھتی ہے محفلِ ہستی، خزاں رسیدہ تمنا، فریبِ وعدۂ فردا، حسرتِ دیدنا تمام، دِل ناکام، واماندۂ الفت۔ ''چند روز اور مری جان'' میں الفاظ کی یہ تراکیب ان کے کلام کو پُر تاثیر بناتی ہیں۔

چند روز اور مری جان! فقط چند ہی روز
ظلم کی چھاؤں میں دم لینے پہ مجبور ہیں ہم
اور کچھ دیر ستم سہ لیں، تڑپ لیں رو لیں
اپنے اجداد کی میراث ہے معذور ہیں ہم
جسم پر قید ہے، جذبات پہ زنجیریں ہیں
فکر محبوس ہے، گفتار پہ تعزیریں ہیں
اپنی ہمت ہے کہ ہم پھر بھی جیئے جاتے ہیں
زندگی کیا کسی مُفلس کی قبا ہے جس میں
ہر گھڑی درد کے پیوند لگے جاتے ہیں
لیکن اب ظلم کی میعاد کے دن تھوڑے ہیں
اِک ذرا صبر، کہ فریاد کے دن تھوڑے ہیں
عرصۂ دہر کی جُھلسی ہوئی ویرانی میں
ہم کو رہنا ہے پہ یونہی تو نہیں رہنا ہے
اجنبی ہاتھوں کا بے نام گرانبار ستم
آج سہنا ہے ہمیشہ تو نہیں سہنا ہے
یہ تیرے حُسن سے لپٹی ہوئی آلام کی گرد
اپنی دو روزہ جوانی کی شکستوں کا شمار
چاندنی راتوں کا بے کار دہکتا ہوا درد
دل کی بے سُود تڑپ جسم کی مایوس پکار
چند روز اور مری جان! فقط چند ہی روز

یوں ہم دیکھتے ہیں کہ نقشِ فریادی خالص عشق کے جذبات ورومانیت سے پُر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج تک اسے قبولِ عام حاصل ہے۔ یوں تو فیض کا کلام محتاجِ تعارف نہیں۔ مگر یہ بھی سچ ہے کہ ان کے بعد کے سارے مجموعوں میں نقشِ فریادی کو اس اعتبار سے اہمیت حاصل ہے کہ اس کلام کو روزِ اول (جب وہ شائع ہوا تھا) کی طرح قبولِ عام حاصل رہا۔ اور یہی دیر پا شاعری کی اہمیت ہوتی ہے۔

سید محمد سلیمان

اسلام اور شعر و شاعری ☆

شاعری کے متعلق ایک نقطۂ نظر تو یہ ہے کہ

'شاعری جزویست از پیغمبری'

جب کہ کچھ حضرات بعض دلائل کی روشنی میں اسے پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھتے۔ان دلائل کا پس منظر سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے زمانہ جاہلیت کی عربی شاعری کا مختصر تعارف کرادیا جائے

زمانہ جاہلیت کی عربی شاعری:

شراب، جنسی لطف اندوزی، فحش نگاری، اپنے قبیلے کی مدح اور مخالفین کی ہجو گوئی زمانہ جاہلیت کی عربی شاعری کے اہم اجزاء تھے۔ شرمناک باتوں کو شاعری میں فخریہ بیان کیا جاتا تھا اور ایسے اشعار پر شرمندہ ہونے کی بجائے شاعر سامعین سے داد وصول کرتا تھا۔ فحش اشعار نہ صرف میلوں اور جلسوں میں سرِ عام بیان کئے جاتے تھے بلکہ خانہ کعبہ میں لٹکائے جاتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد بعض بدبخت شعراء نے اپنی شاعری میں اسلام کی مخالفت اور شانِ رسالت میں گستاخیاں بھی شروع کردیں۔ 'نعوذ باللہ من ذالک'۔ اسی پس منظر میں اللہ تعالیٰ نے چند آیات نازل فرمائیں۔ جن کا ترجمہ درج ذیل ہے۔

☆ ہم ممنون ہیں کہ محبِ گرامی جناب سید محمد سلیمان نے ہماری درخواست پر نہایت محنت و کاوش اور تحقیق و جستجو کے بعد بھرپور معنویت و جامعیت اور مستند حوالوں پر مشتمل زیرِ نظر بصیرت افروز مقالہ تحریر فرمایا جو 'الاقربا' کے لیے ایک اعزاز ہے (ادارہ)

''شاعروں کی بات پر وہی چلتے ہیں جو بے راہ ہیں۔ کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ وہ ہر میدان میں سر مارتے پھرتے ہیں اور ایسی باتیں کہتے ہیں جو کرتے نہیں۔ البتہ وہ (شاعر) اس سے مستثنٰی ہیں جو ایمان والے ہیں۔ اچھے کام کرتے ہیں اور اللہ کو بہت زیادہ یاد کرتے ہیں'' (الشعراء ۲۲۴۔۲۲۷)

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

''تم میں سے کوئی اپنے پیٹ کو پیپ سے بھرلے تو یہ بہتر ہے اس سے کہ اسے شعر سے بھرے'' (بخاری شریف :۶۱۵۵، مسلم شریف: ۵۸۹۳)

مندرجہ بالا آیت اور حدیث میں ان شاعروں کی مذمت ہے جو اپنی شاعرانہ صلاحیتوں کا غلط استعمال کرتے ہیں۔ جب کہ ایماندار اور نیک شاعروں کو اللہ تعالیٰ نے اس سے مستثنٰی فرمایا ہے۔ مندرجہ بالا حدیث کے متعلق حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے فرمایا اس حدیث میں وہ اشعار مراد ہیں جن میں معاذ اللہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی برائی کی گئی ہو اور اسے تمام شاعری پر علی العموم اطلاق کرنے کا انہوں نے انکار فرمایا (فتح الباری، ج ۱۰، ص ۵۶۵)

شاعری بذاتِ خود بری چیز نہیں

ہر چیز کی طرح شاعری بھی بذاتِ خود کوئی بری چیز نہیں۔ اس کا استعمال اسے اچھا یا برا بناتا ہے۔ جریر، اخطل، فرزدق وغیرہ شعراء کی شاعری کا بیشتر حصہ یقیناً قابلِ مذمت ہے جب کہ اس کے مقابلے میں حضرت حسان بن ثابتؓ، حضرت عبداللہ بن رواحہؓ وغیرہ کی شاعری کو اللہ اور اس کے رسول کی پسندیدگی کی سند حاصل ہے۔ حضرت حسانؓ کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا فرمائی کہ اے اللہ تو روح القدس (جبریلؑ) کے ذریعے حسان کی مدد فرما۔ (بخاری شریف: ۳۲۱۲، مسلم شریف: ۶۳۸۴) حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''شعر کلام جیسا ہے۔ اچھے شعر اچھے کلام کی طرح ہیں اور برے شعر برے کلام جیسے'' (الادب

المفرد) اس روایت کی سند اگرچہ کچھ کمزور ہے لیکن یہی بات حضرت عائشہ صدیقہؓ سے ثابت ہے۔ آپؐ نے فرمایا ''شعر اچھے بھی ہیں برے بھی، اچھوں کو لے لو اور بروں کو چھوڑ دو'' (الادب المفرد)۔ حضرت عطاء بن ابی رباحؒ سے حدی خوانی، شاعری اور گانوں کے متعلق پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا ان چیزوں میں کوئی برائی نہیں بشرطیکہ فحش نہ ہوں (فتح الباری، ج ۱۰، ص ۵۵۵)۔ واضح رہے کہ حضرت عطاءؒ بہت جلیل القدر تابعی تھے۔ حضرت امام ابوحنیفہؒ کے استاد تھے اور ان کے تعارف کے لیے اتنا کافی ہے کہ امام صاحبؒ نے فرمایا ''میں جن لوگوں سے ملا ہوں ان میں میں نے حضرت عطاء سے بہتر کوئی نہیں دیکھا''۔ (تہذیب التہذیب، ج ۴، ص ۱۲۹)۔ یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ بعض روایتوں کے مطابق حضرت امام ابوحنیفہؒ نے چار یا چند صحابۂ کرامؓ کو بھی دیکھا تھا اور وہ یقیناً حضرت عطاءؒ سے افضل تھے۔ لیکن امام صاحبؒ نے ان صحابۂ کرامؓ کو اگر دیکھا تھا تو بچپن میں صرف ان کا دیدار کیا تھا جب کہ یہاں امام صاحبؒ ان لوگوں کے متعلق بیان فرما رہے ہیں جن کے ساتھ ان کی ملاقات اور صحبت رہی۔

اچھی شاعری کی تعریف اور پسندیدگی

اسلام نے اچھی شاعری کی تعریف، قدردانی اور ہمت افزائی کی ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ اشعار خود بھی پڑھتے تھے اور دوسروں سے بھی سنتے تھے جیسا کہ ہم ذیل میں بیان کرتے ہیں۔

۱ حضرت اُبی بن کعبؓ سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا'' اِنَّ مِنَ الشِّعرِ حِکمَۃً '' بے شک بعض شعر حکمت ہوتے ہیں (بخاری شریف: ۶۱۴۵)

۲ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

''بہت سچی بات جو کسی شاعر نے کہی وہ لبید کی بات ہے

اَلا کُلُّ شَیءٍ مَاخَلا اللّٰہَ بَاطِل خبردار اللہ کے سوا ہر چیز باطل ہے۔

اور قریب تھا کہ وہ اسلام لے آتا (بخاری شریف: ۳۸۴۱، مسلم شریف ۵۸۸۹)

۳ حضرت شریدؓ فرماتے ہیں ایک دن میں سواری پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ آپؐ کے پیچھے بیٹھا ہوا تھا۔ آپؐ نے مجھ سے فرمایا ''کیا تم کو امیہ بن ابی الصلت کے شعر یاد ہیں؟''۔ میں نے کہا جی ہاں۔ آپؐ نے فرمایا ''سناؤ'' میں نے ایک شعر سنایا آپؐ نے فرمایا ''اور سناؤ میں نے ایک شعر اور سنایا۔ آپؐ نے پھر اور سنانے کی فرمائش کی۔ یہاں تک کہ میں نے آپ کو سو شعر سنائے۔ (مسلم شریف: ۵۸۸۵) لبید اور امیہ بن ابی الصلت دونوں زمانۂ جاہلیت کے شاعر تھے۔

۴ سماک بن حربؒ فرماتے ہیں میں نے حضرت جابر بن سمرۃؓ سے پوچھا کیا آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھتے تھے۔ انہوں نے فرمایا ''ہاں بہت بیٹھتے تھے۔ رسول اللہ علیہ وسلم فجر کی نماز کے بعد سورج نکلنے تک اپنے مصلے پر ہی بیٹھے رہتے تھے۔ جب سورج نکلتا تو آپؐ اٹھ جاتے تھے۔ (اس مجلس میں) صحابۂ کرامؓ باتیں کیا کرتے تھے۔ زمانۂ جاہلیت کی باتیں بھی بیان کرتے تھے اور ہنستے تھے جب کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تبسّم فرمایا کرتے تھے'' (مسلم شریف۔ ۶۰۳۵)۔ ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں صحابۂ کرامؓ شعر سنتے سناتے تھے اور زمانۂ جاہلیت کی باتیں بیان کیا کرتے تھے۔ آپؐ ان کو منع نہیں فرماتے تھے بلکہ اکثر (ان کی باتیں سن کر) آپؐ مسکرایا کرتے تھے۔ (مسند امام احمدؒ: ۵۔۲۰۵، ترمذی: ۲۸۵۰)

حسب موقع اشعار پڑھنا

حضرت جُندُبؓ سے روایت ہے (کسی غزوے میں) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو چلتے چلتے ایک پتھر سے ٹھوکر لگی اور آپ کی انگلی خون آلودہ ہوئی تو آپؐ نے (حضرت عبداللہ بن رواحہؓ کا) یہ شعر پڑھا

هَل اَنتِ اِلَّا اِصبَعٌ دَمِيتِ وَفِي سَبِيلِ اللّٰهِ مَا لَقِيتِ

تو ایک انگلی ہی تو ہے جو اللہ کی راہ میں زخمی ہوئی (بخاری شریف: ۶۱۴۶، مسلم شریف ۴۶۵۴)

حضرت براء بن عازبؓ سے روایت ہے کہ جنگِ خندق کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مٹی اٹھا اٹھا کر لے جا رہے تھے۔ آپؐ کا شکم مبارک غبار آلود ہو گیا تھا۔ آپ اس وقت حضرت عبداللہ بن رواحہؓ کے یہ شعر پڑھ رہے تھے۔

اَللّٰھُمَّ لَو لَا اَنتَ مَااھتَدَینَا   وَلَا تَصَدَّقنَا وَ لَا صَلَّینَا

فَاَنزِلَن سَکِینَۃً عَلَینَا   وَثَبِّتِ الاَ قدَامَ اِن لَا قَینَا

اے اللہ! اگر تیری توفیق نہ ہوتی تو ہم ہدایت یاب نہ ہوتے، نہ زکوۃ ادا کرتے نہ نماز پڑھتے۔ اے اللہ تو ہم پر سکینہ نازل فرما اور جب دشمن سے مقابلہ ہو تو ہم کو ثابت قدم رکھ (بخاری شریف: ۴۱۰۶، مسلم شریف ۴۶۷۰)

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ ایک صبح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خندق کی طرف نکلے۔ آپؐ نے دیکھا کہ مہاجرین اور انصار سخت سردی میں خندق کھود رہے ہیں۔ جب آپؐ نے ان کی تکان اور بھوک کو دیکھا تو آپؐ نے یہ شعر پڑھا

اَللّٰھُمَّ اِنَّ العَیشَ عَیشُ الآخِرَۃ   فَاغفِر لِلاَ نصَارِ وَالمُھَاجِرَۃ

اے اللہ! بے شک اصل زندگی تو آخرت ہی کی زندگی ہے۔ پس تو انصار اور مہاجرین کی مغفرت فرما

صحابہ کرامؓ نے اس کے جواب میں یہ شعر پڑھا

نَحنُ الَّذِینَ بَا یَعُوا مُحَمَّدًا   عَلَی الجِھَادِ مَا بَقِینَا اَبَدًا

ہم وہ (خوش نصیب) ہیں جنہوں نے بیعت کی ہے محمدؐ سے اس بات پر کہ ہم جہاد کرتے رہیں گے جب تک ہمارے دم میں دم ہے۔ (بخاری شریف: ۲۸۳۴، مسلم شریف ۴۶۷۶)

حضرت خُبیبؓ، حضرت زید بن دشنہؓ اور ایک اور صحابی کو کفار نے دھوکے سے گرفتار کر لیا۔

حضرت خبیبؓ کو حارث بن عامر کے بیٹوں نے خرید لیا۔ حضرت خبیبؓ نے حارث بن عامر کو غزوۂ بدر میں قتل کیا تھا۔ اس کے بیٹے حضرت خبیبؓ کو انتقاماً قتل کرنا چاہتے تھے۔ کچھ دن انہوں نے حضرت خبیبؓ کو زنجیروں سے باندھ کر قید میں رکھا۔ حارث کی بیٹی کہتی ہے میں نے خبیبؓ سے بہتر کوئی قیدی نہیں دیکھا۔ ایک دن میں نے دیکھا کہ ان کے ہاتھ میں انگوروں کا گچھا ہے اور وہ اس میں سے کھا رہے ہیں حالانکہ اس وقت مکہ مکرمہ میں انگور کہیں نہ تھے۔ یہ رزق انہیں اللہ تعالیٰ نے بھیجا تھا۔ جب وہ لوگ حضرت خبیبؓ کو قتل کرنے کے لیے حدودِ حرم سے باہر لے گئے تو حضرت خبیبؓ نے ان سے کہا مجھے دو رکعتیں پڑھ لینے دو۔ انہوں نے دو رکعتیں پڑھیں اور فرمایا اگر تم یہ نہ سمجھتے کہ میں مرنے سے گھبرا رہا ہوں تو میں زیادہ نماز پڑھتا۔ پھر حضرت خبیبؓ نے دعا کی کہ اے اللہ ان لوگوں کو گن لے۔ ان کو علیحدہ علیحدہ مار دے اور ان میں سے ایک کو بھی نہ چھوڑ۔ پھر حضرت خبیبؓ نے یہ شعر پڑھے۔

فَلَسْتُ اُبَالِی حِینَ اُقْتَلُ مُسلِماً   عَلٰی اَیِّ جَنبٍ کَانَ لِلّٰہِ مَصرَعِی

وَذٰلِکَ فِی ذَاتِ الاِلٰہِ وَاِن یَّشَأ   یُبَارِک عَلٰی اَوصَالِ شِلوٍ مُمَزَّعِ

(جب کہ میں اسلام پر قتل کیا جا رہا ہوں تو مجھے اس بات کی پروا نہیں کہ میں کس پہلو پر گرتا ہوں یہ مصیبت تو اللہ کی راہ میں پہنچ رہی ہے۔ وہ چاہے تو کٹے ہوئے اعضاء کے ٹکڑوں میں برکت عطا فرمائے)۔ اس کے بعد حارث کے بیٹے عقبہ نے انہیں شہید کر دیا۔ (بخاری شریف: ۳۹۸۹)

حدی خوانی

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ ایک حبشی لڑکا تھا اس کا نام انجشہ تھا۔ اس کی آواز بہت اچھی تھی۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حدی خواں تھا۔ ایک سفر میں وہ حدی خوانی کر کے اونٹوں کو تیز دوڑا رہا تھا۔ اونٹوں پر خواتین سوار تھیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے فرمایا "اے انجشہ۔ آہستہ چلو آبگینوں کو ٹھیس نہ لگے" آپ کی مراد خواتین سے تھی۔ (بخاری شریف ۶۲۱۱، مسلم شریف ۶۰۳۶ تا ۶۰۴۰)

رجزیہ شاعری

غزوۂ خیبر میں یہود کا مشہور پہلوان اور سپہ سالار مرحب رجز پڑھتا ہوا نکلا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ اس کے مقابلے کے لیے یہ رجز پڑھتے ہوئے بڑھے

أَنَا الَّذِی سَمَّتْنِی أُمِّی حَیْدَرَہ　　　کَلَیْثِ غَابَاتٍ کَرِیهِ الْمَنظَرَہ

أُوفِیهِمْ بِالصَّاعِ کَیْلَ السَّنْدَرَہ

(میں وہ ہوں کہ میری ماں نے مرا نام شیر (حیدر) رکھا ہے۔ میں جنگل کے شیر کی طرح خوفناک ہوں۔ میں لوگوں کو ایک صاع کے بدلے اس سے بڑا پیمانہ دیتا ہوں)۔ پھر حضرت علیؓ نے مرحب کے سر پر وار کیا اور اسے قتل کر دیا۔ پھر حضرت علیؓ کے ہاتھ پر اللہ نے فتح عطا فرمائی (صحیح مسلم ۴۶۷۸)

تنبیہ۔ یہاں ضمناً ایک وضاحت ضروری ہے کہ مندرجہ بالا حدیث کے مطابق مرحب پہلوان کو حضرت علیؓ نے قتل کیا اور حضرت علیؓ کے ہاتھ پر ہی فتح نصیب ہوئی اس کے برعکس تاریخی روایت کے مطابق مرحب کو حضرت محمد بن مسلمہؓ نے قتل کیا۔ (سیرت ابن ہشام وعیون لاثر وغیرہ)۔ بلکہ ایک تاریخی روایت تو کہتی ہے کہ محمد بن مسلمہؓ نے مرحب کی دونوں ٹانگیں کاٹ دیں وہ زمین پر پڑا ہوا تھا کہ حضرت علیؓ اس کے پاس سے گزرے اور انہوں نے اس کا سر کاٹ دیا (واقدی، سیرت احمد مجتبیٰ، ج ۳ ص ۱۸۶)۔ مسلم شریف کی روایت کے مقابلے میں تاریخ کی روایت قطعی ناقابلِ اعتبار ہے۔

نعتیہ شاعری

حضرت عبداللہ بن رواحہؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف میں مندرجہ ذیل اشعار کہے

فِینَا رَسُولُ اللّٰهِ یَتلُو کِتَابَهٗ　　　إِذَا انْشَقَّ مَعرُوفٌ مِنَ الفَجرِ سَاطِعُ

أَرَانَا الهُدٰی بَعدَ العَمٰی فَقُلُوبُنَا　　　بِهٖ مُوقِنَاتٌ أَنَّ مَا قَالَ وَاقِعُ

یَبِیتُ یُجَافِی جَنبَهٗ عَن فِرَاشِهٖ　　　إِذَا استَثقَلَت بِالمُشرِکِینَ المَضَاجِعُ

ترجمہ: ہمارے درمیان اللہ کے رسولؐ ہیں جو اللہ کی کتاب کی تلاوت کرتے ہیں جب صبح صادق کی سفیدی بلند ہوتی ہے۔ آپؐ نے گمراہی کے بعد ہم کو ہدایت کی راہ دکھائی اور ہمارے دل یقین رکھتے ہیں کہ آپؐ نے جو کچھ فرمایا وہ ہو کر رہے گا۔ رات کو آپ کا پہلو بستر سے علیحدہ ہوتا ہے جس وقت مشرکین اپنے بستروں میں بوجھل پڑے ہوتے ہیں۔ (بخاری شریف: ۱۱۵۵)

حضرت حسّان بن ثابتؓ دربارِ رسالت کے شاعر تھے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف کفار کے الزامات کا جواب دیا کرتے تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے لیے دعا فرمائی تھی۔ حضرت عمرؓ اپنے عہد خلافت میں ایک دن مسجد نبوی میں تشریف لائے۔ اس وقت حضرت حسّانؓ مسجد میں اشعار پڑھ رہے تھے۔ حضرت حسّانؓ نے حضرت عمر فاروقؓ سے فرمایا میں اِس مسجد میں اس وقت بھی اشعار پڑھا کرتا تھا جب آپ سے بہتر ہستی اس مسجد میں موجود ہوتی تھی۔ پھر وہ حضرت ابوہریرہؓ کی طرف متوجہ ہوئے (جو مسجد میں موجود تھے) اور ان کو قسم دے کر ان سے پوچھا کیا تم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو (مجھ سے) یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ "میری طرف سے جواب دو۔ اے اللہ اس کی روح القدس کے ذریعے مدد فرما"۔ حضرت ابوہریرہؓ نے فرمایا "ہاں سنا ہے" (بخاری شریف ۳۲۱۲، مسلم شریف ۶۳۸۴)

حضرت علیؓ اور حضرت حسّانؓ کے دیوان چھپ کر شائع ہو چکے ہیں۔ ذیل میں ہم حضرت حسّانؓ کے چند مشہور نعتیہ اشعار نقل کرتے ہیں۔

هَجوتَ مُحَمَّدًا فَاَجبتُ عَنهُ   وَعِندَ اللّٰه فِي ذَاکَ الجزَاء

هَجَرتَ مُحَمَّدًا بَرًّا حَنِيفاً   رسول اللّٰه شِيمَته الوَفَاء

فَاِنَّ اَبي وَوَالِدَتي و عِرضي   لِعِرضِ مُحَمَّدٍ مِنكم وِقاء

تو نے محمدؐ کی برائی کی میں نے ان کی طرف سے جواب دیا اور اس کی جزا مجھے اللہ دے گا۔

تو نے محمدؐ کی برائی کی جو بہت نیک اور حنیف ہیں۔ وہ اللہ کے رسولؐ ہیں ان کی فطرت میں وفا ہے۔

بے شک میرے باپ، میری ماں اور میری آبرو محمدؐ کی آبرو پر فدا ہیں (مسلم شریف: ۶۳۹۵)

وَاحسَنُ مِنکَ لَم تَرَقَطُ عَینِی   وَاَجمَلُ مَنکَ لَم تَلِدِ النِّسَاءُ
خُلِقتَ مُبَرَّأً مِن کُلِّ عَیبٍ   کَاَنَّکَ قَد خُلِقتَ کَمَا تَشَاءُ

آپؐ سے زیادہ حسین میری آنکھ نے کبھی نہیں دیکھا اور آپ سے زیادہ خوبصورت عورتوں نے جنا ہی نہیں۔ آپؐ بالکل بے عیب پیدا کئے گئے ہیں گویا کہ آپؐ ایسے ہی پیدا کئے گئے ہیں جیسا آپؐ چاہتے تھے۔ امیر خسرو کیا خوب فرماتے ہیں: 'بسیار خوباں دیدہ ام امّا تو چیزے دیگری'

حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بارش کی دعا مانگتے ہیں تو آپؐ کے روئے مبارک کو دیکھ کر مجھے ابو طالب کا یہ شعر یاد آجاتا ہے اور آپؐ دعا مانگ کر منبر سے اترتے بھی نہیں کہ اتنی بارش ہو جاتی ہے کہ سارے پرنالے بہنے لگتے ہیں۔ وہ شعر یہ ہے

وَاَبیَضَ یُستَسقَی الغَمَامُ بِوَجهِہٖ   ثِمَالَ الیَتَامیٰ ، عِصمَۃٌ لِلاَرَامِلِ

وہ گورا شخص جس کے وسیلے سے بارش کی دعا کی جاتی ہے۔ وہ یتیموں کا ملجا و ماویٰ اور بیواؤں کا محافظ ہے۔ (بخاری شریف۔ ۱۰۰۹) ابو طالب نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف میں ایک قصیدہ کہا تھا۔ یہ شعر اسی قصیدے کا ہے۔ حفیظ جالندھری نے اس کا بہت خوب منظوم ترجمہ کیا ہے

وہ صبحِ نور جس کے چہرۂ انور کی برکت سے   کیا کرتے ہیں باراں کی تمنا ابرِ رحمت سے
وہ دامن جو یتیموں کو پناہیں دینے والا ہے   جو اندھوں کو بصیرت کی نگاہیں دینے والا ہے

آخر میں ایک واقعہ جسے علامہ سید سلیمان ندوی اور قاضی محمد سلیمان منصور پوری نے نقل کیا ہے۔ قاضی صاحب لکھتے ہیں:

حضرت عائشہ صدیقہؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنی نعل کو پیوند لگا رہے تھے اور میں چرخہ کات رہی تھی۔ میں نے دیکھا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشانی مبارک پر پسینہ آرہا ہے اور اُس پسینے کے اندر ایک نور ہے جو ابھر رہا اور بڑھ رہا ہے۔ یہ ایسا نظارہ تھا کہ میں سراپا حیرت بن گئی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر مبارک مجھ پر پڑی۔ فرمایا عائشہ تو حیران سی کیوں ہو رہی ہے۔ میں

نے کہا یارسول اللہ میں نے دیکھا کہ حضورؐ کی پیشانی پر پسینہ ہے اور پسینے کے اندر ایک چمکتا دمکتا نور ہے (اس پاک نظارے نے مجھے سراپا چشم کر دیا ہے۔) اللہ کی قسم اگر ابو کبیر ہذلی (ایام جاہلیت کا مشہور شاعر) حضورؐ کو دیکھ پاتا تو اسے معلوم ہو جاتا کہ اس کے اشعار کے صحیح مصداق حضورؐ ہی ہو سکتے ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا اس کے شعر کیا ہیں۔ میں نے یہ شعر پڑھ کر سنا دیئے۔

وَمبرئٌ مِن کُلِّ غُبّرِ حیضَۃٍ   وَفَسادِ مُرضِعَۃٍ وَدَاءِ مُعضِلٖ

وَاِذَا نَظَرتَ اِلیٰ اَسرَّۃِ وَجهِہٖ   بَرَقَت کَبَرقِ العَارِضِ المُتَهَلِّلٖ

وہ ولادت اور رضاعت کی آلودگیوں اور بری بیماریوں سے پاک ہے اور جب تم اس کے چہرے کی لکیروں پر نظر کرو تو وہ برستے بادل کی چمکتی بجلیوں کی طرح چمکتی ہوئی نظر آئیں گی۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ میں جو کچھ تھا اسے آپؐ نے رکھ دیا پھر عائشہ صدیقہؓ کی پیشانی کو چوما اور زبان مبارک سے فرمایا ''جو سرور مجھے تیرے کلام سے حاصل ہوا اسقدر سرور تجھے میرے نظارے سے نہ ہوا ہوگا۔ (رحمۃ للعالمین جلد دوم ص ۱۹۷، سیرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا ۲۵۱ مختصراً)

محمد اویس الحسن خاں

فقر کیا ہے۔۔۔ایک مختصر جائزہ

کشتگانِ خنجر تسلیم را ہر زماں از غیب جان دیگر است

جو خنجر تسلیم سے ہلاک کیا جاتا ہے وہ ہر زمانہ میں غیب سے اک نئی زندگی سے ہمکنار ہوتا رہتا ہے۔ خنجر تسلیم کی تفہیم بجز عشق و محبت کچھ اور نہیں۔ لیکن یہ عشق و محبت، حق اور حقیقت سے ہے جس میں مجاز کا ذرہ بھر شائبہ نہیں، ورنہ حرص و ہوا و ہوس سے بھرا دل تو ایک سگِ آوارہ کی مانند ہے۔ اسی جگہ اس بات کا کامل شعور بھی غایت درجہ اہمیت کا حامل ہے کہ وہ فقر جو دنیا کا محتاج بنا دے اور اس سے توجہ الی اللہ مطلق نہ ہو، اس فقر سے رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے پناہ مانگی ہے۔

نعوذُ باللّٰہ مِنَ الفقرِ المکبّ

(میں پناہ مانگتا ہوں اللہ سے، اس فقر کی حالت سے جو مجھے ذلیل کر دے)

فقر مکب سے مراد یہ ہے کہ فقیر مال و دولت رکھتا ہو اور اللہ تعالیٰ کو فرعون کی طرح فراموش کر دے، قارون کی طرح بخل اور نمرود کی طرح غرور سے کام لے، شداد کی طرح دنیا کو زینت بنائے رکھے حالانکہ یہ مال و دولت اور عزت اسے رب تعالیٰ نے اس لیے عطا فرمائی تھی کہ اس کا بندہ ہر حال میں اس کا عبادت گزار اور شاکر و عاجز بن کر رہے۔ اسی لیے ارشادِ باری تعالیٰ ہے۔

وَلَقَد کَرَّمنَا بَنِی اٰدَمَ ط (ترجمہ: ہم نے بنی آدم کو عزت و افتخار بخشا)

مگر یہ عزت و افتخار اس لیے نہ تھا کہ خود معطی (عطا کرنے والے) کو بھلا دیا جائے۔ اسی ضمن میں سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا فرمان بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ آپؓ فرماتے ہیں۔

مَا رَاَیتَ شیاً اِلّا وَرَایتُ اللّٰہ فیہ (جب تو کسی چیز کو دیکھے تو اس میں اللہ کا نور تجھے نظر آئے)

اسی ضمن میں ایک حدیثِ قدسی کے الفاظ یوں ہیں کہ: اَنَا عِندَ ظَنِّ عَبدِی بِی فَلیَظُنُّ بِی مَا شَآءَ
(میں اپنے بندہ کے گمان کے نزدیک ہوں، پس وہ جیسا چاہے میرے لیے گمان کرے)
قرآن پاک میں فرمان باری تعالیٰ ہے۔
وَفِی اَنفُسِکُم اَفَلا تُبصِرُونَ (اور خود تم میں ہوں تو کیا تمہیں سوجھتا نہیں)
یہاں قرآنِ حکیم کی ایک آیت (بنی اسرائیل ۷۲) کا حوالہ بڑی اہمیت کا حامل ہے:
مَن کَانَ فِی هٰذِهٖ اَعمیٰ فَهُوَ فِی الآخِرَةِ اَعمیٰ (جو شخص اس جہان میں اندھا رہا وہ بروزِ حشر بھی اندھا ہی رہے گا)

وہ عشق جس کا ذکر قبل ازیں آیا ہے اس کی ضرورت کیا ہے؟ دراصل عشق اس آگ کا نام ہے جو سوائے محبوب کے باقی سب کو مٹی کر دیتی ہے اسی لیے کہا گیا:
اَلعِشقُ نَارٌ یُحرِقُ مَا سِوَی المَحبُوب جب کہ فقر کے بارے میں ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے ☆: اَلفَقرُ فَخرِی فَافتَخِرُ عَلیٰ سَائِرِ الاَنبِیَآءِ وَالمُرسَلِین
(۳) (فقر میرا فخر ہے اور میں اپنے فقر سے جمیع انبیاء و رسل کے اعمال پر فخر کروں گا)
اس سلسلے میں ایک حدیث قدسی کے الفاظ کچھ یوں ہیں کہ: اَنَا جَلِیسُ مَن ذَکَرَنِی
(جس نے مرا ذکر کیا میں اس کا جلیس ہوں)

درحقیقت اس کی تفہیم و تشریح میں فارسی کا یہ محاورہ نہایت بلیغ و فصیح ہے کہ "ہر چیز کہ درکانِ نمک رفت نمک شدْ (جو کچھ نمک کی کان میں جا پڑا، وہ نمک کی تاثیر سے نمک ہی بن جاتا ہے)

نام خدا کی عظمت و رفعت لامحدود ہے۔ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم شبِ معراج، عرش و کرسی، لوح و قلم سے ماوراء اللہ تعالیٰ سے بے حجاب ہمکلام ہوئے۔ حق تعالیٰ کے نام کی برکت سے زمین اور آسمان بغیر ستونوں کے قائم ہیں انبیاء علیہم السلام نبوت و رسالت سے سرفراز ہوئے

☆ قاضی محمد سلیمان منصور پوری لکھتے ہیں کہ یہ الفاظ عام طور پر مشہور ہیں لیکن ماہرینِ علم الحدیث کی رائے ہے کہ 'الفقر فخری' کے الفاظ نبیؐ سے ثابت نہیں (رحمتہ للعالمین جلد ۳ ص ۲۶۶)

کیونکہ وہ نام خدا کو معین جانتے تھے۔ اللہ تعالیٰ اور اس کے بندہ کے مابین یہی نام خدا ہی وسیلہ ہے۔ نامِ خدا کی برکت وعظمت سے ولی، غوث، قطب، ابدال، اوتار بنتے ہیں۔ ذکر وفکر، الہام و اغراق توحید، کشف وکرامات اور مراقبہ جات سبھی کچھ باری تعالیٰ کے پاک ناموں کی برکات کے تحت کام آتے ہیں۔ حدّ یہ کہ علم لدنی بھی اسی نام پاک کی برکت سے دل مومن پر روشن وتاباں ہوتا ہے۔ یہ وہ علم ہے کہ جس کے حصول کے بعد کسی دوسرے علم کی احتیاج باقی نہیں رہتی۔

ابتدا ہو انتہا ہو ہر کہ باہُو می رسید　　　عارف عرفاں شود ہر آنکہ باہُو ہُو شود

(جو ہُو کو پالے اسی نے ابتداء وانتہا پالی اور جو شخص ہُو کے ساتھ ہُو ہو جائے وہ معارف عرفان سے متصف ہو جاتا ہے)

اسی ذیل میں عشق کی دو اقسام بیان کی گئی ہیں (I) عشق حقیقی (II) عشق مجازی

عشق حقیقی سے مراد فقط اتنا ہے کہ ماسوا اللہ اور کچھ یاد نہ رہے اور مٹ جائے، جب کہ عشق مجازی میں ذکر سے سکر ومستی اور وجد وجذب غالب آتے ہیں اور بندہ مجذوب ہو کر معشوق کی یاد میں دیوانہ ہو جاتا ہے۔ جبکہ حقیقت کا ادراک یہ بتلاتا ہے کہ بس اللہ ہی ہے اور اللہ کے سوا باقی سب ہوس ہے اور کچھ بھی نہیں۔ اسی لئے عبادت کے لئے عہد کا تقاضا ہوا اور فنائے نفس کا درس بھی۔ رازِ درون خانہ سے روگردانی انسان کو بھٹکا دیتی ہے اور وہ کہیں کا نہیں رہتا۔

نقاش چوں در نقش آید می گرد و نقاش　　　گر محرمش اسرار خانہ از نقاش غافل مباش

(جب نقاش نقش میں آجاتا ہے تو تمام نقش نقاش ہی تو بن جاتا ہے۔ اور اگر تو گھر کے اندر کا محرم ہے تو نقاش سے غافل نہ ہو۔)

اسی نقاش کے رازوں کا تجسس دھیرے دھیرے نقاش سے محبت میں بدل جاتا ہے اور پھر یہی محبت ہے کہ دل کو سکون سے نہیں رہنے دیتی ورنہ کون شخص آرام طلب نہیں کرتا۔ مگر یہی محبت بندہ کو تجلیوں سے بھی ہمکنار کر دیتی ہے۔ ان تجلیوں کی تعداد چودہ ہے۔

(۱) شریعت محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی ہے اس کا تعلق آنکھ سے ہے کہ اس کا مشاہدہ

ومعائنہ ممکن ہے۔(۲) طریقت ہے جو دل میں روشنی پیدا کرتی ہے۔(۳) حقیقت ہے، جو روح میں روشنی کو زیادہ کرتی ہے۔(۴) معرفت ہے جس سے بھید میں زیادتی ہوتی ہے۔(۵) عشق ہے جو اللہ تعالیٰ کے اسرار کے نور میں اضافہ کرتا ہے۔(۶) پیرِ کامل کی ہے کہ اس سے نورِ محبت اور خلوص میں اضافہ ہوتا ہے۔(۷) فقر ہے جو نورِ حق میں اضافہ کا سبب ہے۔(۸) ملائکہ ہیں جو نورِ تسبیح کا باعث بنتے ہیں اور اس میں اضافہ کرتے ہیں۔(۹) جن کہ جن سے جنون اور دیوانگی میں اضافہ ہوتا ہے(۱۰) نفس ہے جو خواہشات حیوانیہ میں اضافہ کرتا ہے۔(۱۱) شیطان ہے کہ جس سے گناہوں میں زیادتی ہوتی ہے۔(۱۲) شمس کہ جس سے نورِ برق کا اضافہ ہوتا ہے۔
(۱۳) چاند ہے کہ نور کے پرتو میں بڑھوتی لاتا ہے۔(۱۴) سرِ رخ (کے) اسم اللہ، اسم للہ اور اسم لہ اور اسم ھُو اور اسمائے نور اور اسمِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں

دو تجلیاں اور ہیں: دن اور رات

دن کے حواس پابندِ زمان و مکان ہیں جب کہ رات کے حواس اس بات کا شعور وادراک فراہم کرتے ہیں کہ جہاں زمان و مکان اپنی گرفت چھوڑ بیٹھتے ہیں قرآن پاک میں کتنے ہی مقامات پر دن اور رات کے آنے جانے میں پوشیدہ اسرار کی طرف واضح الفاظ میں اشارہ فرمایا گیا ہے۔جن کی تفصیل کا یہ محل نہیں۔

فقر میں جب فقیر چاہتا ہے اس کا وجود شعلہ شعلہ ہو جاتا ہے اور جب چاہتا ہے پانی پانی ہو جاتا ہے۔فقیر کا وجود نور سے ہوتا ہے جب کہ عوام کا وجود اربعہ عناصر سے۔فقیر جب چاہتا ہے اس کے وجود کے عناصر اپنے اپنے مادہ سے مل جاتے ہیں۔شعلہ شعلہ سے پانی، پانی سے، ہوا، ہوا میں اور مٹی مٹی میں کیونکہ ان کا وجود ایک لطیف شعلہ ہوتا ہے جو عشق کی آگ سے بھڑکتا ہے۔اور معشوق کے بغیر قرار نہیں لیتا ہے وجوبِ عشق الٰہی قرار دیتا ہے۔وگرنہ آفتاب، ماہتاب اور عاشق کو تو قرار نصیب ہی نہیں۔فقر بتلاتا اور سکھلاتا ہے کہ اپنی بشریت سے نکل کر اپنی خودی سے فنا ہو جانا اور بقا باللہ کا مرتبہ پالینا ہی جوانمردی ہے مگر اس راہ میں صاحب درد تجربہ کار مرشد و رہبر کی

مسلسل رہبری کے بجز کوئی چارہ کار نہیں۔ بغیر رہبر اس پر پیچ راہ گزار کی کٹھنائیوں کو پار کرتے ہوئے دل ابلیس کی نشست گاہ بن جاتا ہے اور چار موکلان اس کا گھیراو کر لیتے ہیں جن میں پہلا موکل خناس، دوسرا خرطوم، تیسرا وسوسہ اور چوتھا خطرات ہے۔ جب کہ مرشد کامل کی رہبری میں بندہ فقر میں جو سیکھتا اور دیکھتا ہے۔ یعنی رب کائنات کے کرم اور بخشش کا مشاہدہ کرنا چاہئے یہ فقر فنا وبقا کی رہ گزر میں درج ذیل اقسام رکھتا ہے۔

پہلی قسم   فقیر فنا ہے۔۔۔ یعنی لا الٰہ (یہ فنا کا مقام ہے)

دوسری قسم   فقیر بقا ہے۔۔۔ یعنی الا اللہ (یہ اثبات کا مقام ہے

تیسری قسم   فقیر منتہیٰ ہے یعنی محمدؐ رسول اللہ

فقر ہمیں یہ بتلاتا ہے کہ چار لذات کو فنا ہے اور صرف ایک لذت لافانی ہے۔ فانی لذات میں لذتِ اکل وشرب، لذتِ جماع، لذتِ حکومت اور لذتِ علم وفضلیت شامل ہیں۔ جب کہ لافانی لذت صرف لذتِ محبت واسرارِ ربانی ہیں۔ یہ لذت بندہ کو اس کے مولیٰ کا قرب عطا کرتی ہے وہ مولیٰ جس کے صوتی لفظ کا مفہوم فقراء کے نزدیک کچھ یوں ہے۔

م   معرفتِ خداوندی میں طالب اپنے نفس کو خواہشات سے بے نیاز کر کے محو ہو جائے

و   وحدانیت کے سمندر میں غرق ہو جائے

ل   لاحول پڑھے اہلِ دنیا پر تا کہ دیدار کے قابل ہو جائے

یٰ   یادِ الٰہی میں مشغول ہو نہ کہ سیم درز، بیوی بچوں اور جسم وجان میں وقت کا ضیاع کرے۔ تبھی اس کو وہ علم حاصل ہوتا ہے جس کے صوتی لفظ کا مفہوم کچھ یوں ہے

ع۔۔۔ علم وعرفان کا حصول

ل۔۔۔ لا الٰہ الا اللہ

م۔۔۔ مولائے حقیقی کا اُنس اور معیتِ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مراد ہے

فقر انسان کو اس دنیا سے کہ جس کے بارے میں حدیثِ پاک ہے الدُّنیا ظلٌّ زَائل"
(دنیا ایک سایہ ہے جو جاتا رہے گا) چنانچہ دنیا سے بے نیاز کر کے معرفتِ الٰہی کے بلند مقام پر فائز کر دیتا ہے۔ اور وہ تخلیق کائنات کے منشاء و مقصدِ حقیقی کی تہہ تک پہنچ جاتا ہے اور مقام عبدیت کو پہچان کر رب العالمین کے حضور یوں سجدہ ریز ہو جاتا ہے کہ جہاں صلوٰۃ اس کے لئے معراج بن جاتی ہے۔

سفرِ حج سے مراجعت کی ایمان پرور داستان

پروفیسر ڈاکٹر عاصی کرنالیؒ

الوداع اے شہرِ دلبرؐ الوداع

(کیفِ حضوری سے کربِ فراق تک)

☆ آج مدینۃ النبی سے ہمارا یوم وداع ہے۔

☆ رات کروٹیں بدل بدل کر گزری۔ حضوری کی شبِ آخر اس قیام میں اب دوسری شب نہیں آئے گی شبِ آخر میں آخرِ شب دید کے قابل تھی بسمل کی تڑپ۔ اللہ اکبر اللہ اکبر۔۔۔اذانِ فجر یوم وداع کا پیغام بن کر سماعت میں گونجی

☆ حرم نبویؐ کی جانب رواں ہوں۔ ستارہ ہائے آخرِ شب کی نور افشانی آسمانوں سے رحمتوں اور برکتوں کا بارانِ نور۔

☆ تمام راستے نظر گنبدِ خضرا پر جمی ہوئی۔ پاؤں محض مشق کے سہارے متحرک ہیں۔ وہاں تک مسلسل سبز گنبد کو دیکھا جہاں تک دکھائی دینا ممکن تھا۔

☆ مسجد میں حاضر ہوں۔ نور وظہور کا وقت۔ مسجد کی فضا جاگتی ہوئی۔ زندہ، تابندہ تسبیح و تہلیل کے مقدس زمزموں سے معمور۔ تلاوتِ قرآن کی الحان لطیف سے پُر تاحدِ نظر صفیں سجدہ گزارانِ توحید سے بھری ہوئی

☆ جماعت کھڑی ہوئی

اللہ اکبر! اللہ کے بندے اس کے حضور حاضر ہو گئے مسجد کے ماحول پر آیاتِ الٰہی کے جلال و جمال کی حکمرانی ہے امام صاحب کے لبوں سے نکلا ہوا ہر الوہی لفظ سماعت سے گزر کر جزو جان بن رہا ہے تمام حاضرین، تمام عابدین، تمام راکعین، تمام ساجدین عجز و نیاز کے ساتھ عبدیت کے نذرانے بارگاہِ صمدیت میں پیش کر رہے ہیں۔

وہ ہستی جس کے وسیلے سے ہم نے اللہ کو پہچانا۔ وہ ذاتِ گرامی جس نے ہمیں معبودان باطل کے تسلط سے آزاد فرما کر توحید شناس بنایا، وہ ہستی جس سے ہمیں شرف انسانیت کا منصب عطا ہوا۔ یہیں اس حرم پاک میں محوِ استراحت ہے۔ حضور کی قُربت کے احساس نے نمازیوں کی قلب ماہیت کر ڈالی ہے۔ اُن کے چاروں طرف تہذیب کا ایک حصار سا کھنچ گیا ہے۔ وہ سب ادب واحترام کے مقدس سانچے میں ڈھل گئے ہیں۔

یہ حرم نبویؐ میں میری آخری نمازِ فجر ہے تاہم ایک احساس نے مجھے سنبھال رکھا ہے۔ ایک اور نماز، نماز ظہر ہنوز باقی ہے۔ ایک اور حاضری، ایک اور سجدہ گزاری! آنسوؤں سے دِل بھرا ہوا ہے لیکن آنکھیں خالی ہیں۔ دریا پر ابھی بند بندھا ہُوا ہے

''دِل پہ گھٹا سی چھائی ہے کھلتی ہے نہ برستی ہے''

ساعتِ قرب اور لمحاتِ وصل گزرتے کیا دیر لگتی ہے۔ ہوٹل میں آیا۔ سامانِ سفر مرتب کیا۔ بُھوک نہیں تھی تاہم مدینے کی روٹی تھی، تبرک سمجھ کر کھائی۔ یہاں اس سرزمین کی برکت ہے کہ روٹی کھاتے ہُوئے یُوں لگتا ہے جیسے رزقِ طیب کا ہر لُقمہ نُور بن بن کر جزوِ بدن اور جزوِ حیات ہو رہا ہے۔ پانی پیا ہر قطرہ رشکِ آبِ حیات، کیوں نہ ہو مدینے سے تعلق جو ہے بیلچے چشم زدن میں ظہر کا وقت آ گیا۔

اذان، اللہ اکبر، اللہ اکبر

'جرس فریادمی دارد کہ بر بندید محمل ہا'

اذان کے پہلے الفاظ پر پلکیں بھیگ گئیں۔ ایک قطرۂ اشک بہہ کر دامن پر گرا۔ دل میں گھنگھور گھٹا تُلی کھڑی تھی، پہلی بُوند سے ترشح کا آغاز ہو گیا۔

قیام گاہ سے نکلے خاموش، بوجھل پہلے جنت البقیع گئے۔ ارواحِ مقدسہ کی خدمت میں اشک ہائے عقیدت کا نذرانہ پیش کیا۔

'چہ کند بے نوا ہمیں وارد'

زبان پر مُہر تھی، دل بول رہا تھا

اے نبی کے اہل بیت

اے رسُول کے رفیقو

اے ماہتابِ رسالت کے ستارگانِ سعادت

اے چمنستانِ اسلام کے سدا بہار پھولو

اے سعید رُوحو

تُم اللہ کا افتخار ہو

تُم اس کے نبیؐ کا وقار ہو

تُم انسانیت کا شرف ہو

تُم دین کی بنا اور بقا ہو

تُم ہماری پہچان ہو

تُم سے تمام اُمت کا تشخص ہے

تُم خاک کی ان ڈھیریوں میں اسلام اور انسانیت کی مقدس ترین امانتیں ہو تُم جنت البقیع کی سطح پر پھیلے ہوئے وہ صحیفے ہو، جن پر انسانیت کے لیے منشورِ حیات تحریر ہے۔

دل کا ساتھ زبان اور آنکھوں نے دیا۔ زبان سے دورُد وسلام، آنکھوں سے سیلابِ اشک!

اب ہم حرم نبوی کی جانب رواں تھے

وہی گنبدِ خضرا کی دید مسلسل کا عالم

بابِ جبریل سے داخل ہُوا۔ تو دو خواہشیں پیدا ہوئیں۔ پہلی خواہش وہی کہ ریاض الجنہ میں اس نمازِ آخر کی اجازت عطا ہو۔

دوسری خواہش، اچانک، فوری اور عجیب وغریب! جس کا ایک پس منظر تھا۔ سُنا تھا کہ حرمِ نبویؐ میں بے شمار فرشتے حاضر رہتے ہیں۔ بلکہ یہاں تک سُنا تھا کہ جب باجماعت نماز پڑھ لو تو

اپنے دائیں بائیں مصافحہ کرلو، ہوسکتا ہے اُن میں کوئی اللہ کا فرشتہ ہو۔ بعض نمازوں میں میرے یمین و یسار کے لوگوں نے اس حسنِ ظن کی بنا پر مجھ سے بھی مصافحہ کیا (اللہ اُنہیں اس حسنِ ظن کا صلہ دے اور مجھے انسان بنادے فرشتہ تو میں کیا بنوں گا) میں نے بھی ایسے مصافحے بہت سے کئے تھے لیکن میرے قلب نے کسی لمحے کوئی نئی کیفیت محسوس نہیں کی تھی۔ سو دوسری یہ خواہش زبان پر آئی کہ اے قادرِ مطلق! آج کسی فرشتے سے ہاتھ مِلوا دے لیکن میرا قلب اس کی تصدیق کر دے۔! بہ ہر حال مسجد میں داخل ہوا!

ٹپ ٹپ!

یہ کیا، ارے یہ تو میری آنکھوں سے آنسو ٹپکے ہیں۔ یہ لیجے آمدِ طوفاں کا خبر نامہ! آسانی سے ریاض الجنہ میں پہنچ گیا۔ اب بیٹھ کر چاروں طرف نظر دوڑاتا ہوں۔ نظر مناظر کی مقدس سیر کرتے ہوئے مقصورہ شریف کی طرف جاتی ہے۔ روضۂ اطہر کی جالیوں کو چومتی ہے اور دِل کی گھٹا اُمڈ کر آنکھوں پر چھا جاتی ہے۔ اور پلکوں سے اشکوں کی تیز رفتار بوندوں کی تراوش شروع ہو جاتی ہے۔

جماعت کھڑی ہوئی!

آخری نماز۔۔۔ اشکوں کی لڑیاں

آخری رکوع۔ آنسوؤں کی بوچھاڑ

آخری سجدہ۔۔ سارے بند ٹوٹ گئے سارا دریا اتھل پتھل ہو گیا

اس سجدے میں خُدا کی قسم میری جبین بے خُودی کے اندر میری ساری جان سمٹ آئی میں نے جسم کی ساری طاقت سمیٹ کر اپنی پیشانی کو فرش پر رکھ دیا۔ آنسو بہ رہے تھے۔ شاید دو چار آنسو قالین میں جذب ہو گئے ہوں۔ میری عبدیت اور سرنیاز مندی کا مظہر بن کر فرش کے نور میں تحلیل ہو گئے ہوں۔

☆ آخری سجدہ ادا ہُوا

☆ آخری سلام۔ (گریہ اور رقت)

☆ نماز تمام ہُوئی اب جو خُود کو دیکھتا ہوں آنکھیں بھیگی ہُوئیں۔ چہرہ بھیگا ہوا۔ پیش لباس تر، ۔۔۔ ضبطِ گریہ کی کوشش میں ہلکان ہو رہا ہُوں۔

کیا وہ فرشتہ تھا ؟

قارئین ایہاں ایک بات سمجھ لیجئے۔ میں اپنی صف میں بیٹھا ہوں۔ مجھ سے آگے اگلی صف ہے اس اگلی صف میں میرے سامنے کے نمازی سے بائیں طرف گنیئے، ایک، دو، تین، چار، پانچ، چھ، سات، ساتواں شخص یعنی اگلی صف میں بائیں طرف بیٹھا ہُوا ساتواں شخص تڑپ کر اپنی جگہ سے اُٹھتا ہے تیزی سے میرے پاس صِرف میرے پاس آتا ہے۔ مجھ سے مصافحہ کرتا ہے اور تیزی سے پلٹ جاتا ہے۔ ایک لمحے کے بعد دیکھتا ہُوں تو وہ غائب ہوتا ہے۔ میرا دل چپکے سے مجھ سے کہتا ہے "آپ کی خواہش پُوری ہوگئی۔"

نماز پڑھ کر حضُور پاکؐ کی بارگاہ میں حاضری کی نیّت کرتا ہوں۔ خیال تھا سارے بادل برس چکے، دل کی ساری گھٹا آنسو بن کر نچڑ گئی۔ لیجئے یہ تو اور بادل آگئے۔ اور گھٹائیں چھاگئیں۔ میں حضُورؐ کے مواجہ شریف کی جانب ایستادہ تھا۔ چاہتا تھا بہت سی دُعائیں مانگوں۔ لیکن زبان تھی کہ درُود و سلام کے پھُول پر پھُول نچھاور کر رہی تھی اور آنکھیں تھیں کہ آنسوؤں کے گجرے پہ گجرے نثار کر رہی تھیں۔ بے تحاشا گریہ جاری تھا۔ روتا تھا اور کہتا تھا "یا حضُور پاکؐ" اِس کے بعد کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔

آخر ساری جسمانی طاقت کو لفظوں میں مجتمع کر کے عرض کی: "یا حضُور پاکؐ! واپسی کی اجازت دیجئے۔" پھر سیلاب اشک اُمڈ پڑا

اور پھر اچانک کسی نے میرے سر پر دست شفقت رکھ دیا اور میرے مُنہ سے بے اختیار یہ شعر نکلا

یہ پیار مائیں بھی بچوں کو دے نہیں سکتیں ۔۔۔ حضُورؐ آپ سے اتنی محبتیں پائیں !

کہنا چاہتا تھا۔ حضُور پاکؐ! دوبارہ حاضری کی اجازت کا طالب ہوں لیکن کہہ نہ سکا اس التجا

میں حدِ ادب مانع ہُوئی۔ حضورؐ کے فیضانِ کرم کو کسی استدعا کی ضرورت نہیں سلام آخر عرض کر کے بابِ جبریل سے باہر نکلا تو کیا دیکھتا ہُوں کہ بارش ہو رہی ہے میں وہیں کھڑا ہو گیا اور بام اقدس سے آتی ہوئی بارشِ رحمت کو اپنے سر و پیشانی، اپنے چہرے اپنے لباس میں جذب کرتا رہا۔ جسم سے رُوح تک میرے وجُود کا ذرّہ ذرّہ اس بارش سے نمناک تھا، شاداب تھا !

حرم نبویؐ سے چلا۔ مُڑ مُڑ کر دیوانہ وار گنبدِ خضرا کو دیکھ رہا ہُوں بارانِ رحمت اور بارش کرم سے بھیگ رہا ہُوں۔ بہت سی بشارتیں، بہت سی برکتیں، بہت سی سعادتیں میرا احاطہ کیے ہُوئے ہیں اس مقدس و مطہر فضا میں اچانک ایک شعر حافظے کی سطح زیریں سے لبوں کے اُفق پر نمودار ہوتا ہے

جب لوٹنے لگتا ہُوں ترے شہرِ کرم سے ۔۔۔ نظارے لپٹتے ہیں مرے دیدۂ نم سے

بس جب حدودِ مدینہ سے نکلی تو میں نے پلٹ کر اوجھل ہوتے مناظر کو ایک بار اور دیکھا اور ایک شعر جس میں نشاطِ دید کا رنگ بھی تھا اور تجدیدِ زیارت کی تمنا بھی میرے ہونٹوں سے نکل کر فضاؤں میں جذب ہو گیا۔

میں کامیابِ دید ترے شہر سے چلا ۔۔۔ آنکھوں میں التجائے مکرر لیئے ہُوئے

انشائیہ

سید مشکور حسین یاد

خوش رہنے کی ذمہ داری کے زاویے

آدمی ہر وقت خوش رہنا چاہتا ہے اور اس کا خوش رہنا ایک طرح عبادت بھی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ خوش رہنا آدمی کی فطرت ہی نہیں اس میں قدرت کی رضا کو بھی شامل سمجھیے۔ گویا آدمی خوش رہتا ہے تو صرف وہی خوش نہیں رہتا اس سے قدرت بھی خوش رہتی ہے۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو خوشی انسان کا سب سے بڑا جذبہ ہی نہیں اس کی فکر کا سب سے بڑا سرمایہ اور سرچشمہ بھی ہے۔ پھر اگر ایسا ہے تو آدمی ہمیشہ خوش کیوں نہیں رہتا۔ عموماً وہ غم وغصہ کی حالت میں کیوں رہتا ہے؟ بزعم خویش، بہت ہی بردباری دکھاتا ہے تو افسردہ یا اداس ہو جاتا ہے۔

قصہ دراصل یہ ہے کہ خوش رہنا آدمی کی ایک بہت بڑی ذمہ داری ہے۔ ادھر لاشعوری طور پر آدمی سمجھتا ہے چونکہ خوش رہنے کو اس کا دل چاہتا ہے اور قدرت بھی یہی چاہتی ہے تو بس اس کو خوش ہو جانا چاہیئے چنانچہ وہ کسی احساسِ ذمہ داری کے بغیر خوش ہونے لگتا ہے۔ ادھر احساس ذمہ داری کے بغیر خوش ہونا یا خوش رہنا اس لیے ممکن نہیں کہ اس احساس کے بغیر انسانی خوشیوں کی صورت فوراً مسخ ہونا شروع ہو جاتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ غیر ذمہ دار ہو کر آدمی ایک لمحے کے لیے بھی صحیح معنوں میں خوش نہیں رہ سکتا اور اگر رہتا ہے تو اس میں اس کا پھر بھی کوئی کمال نہیں، خود خوش رہنے کے انسانی رویہ کا کمال ہے کہ خوش رہنا انسان کا سب سے زیادہ مضبوط اور مستحکم رویہ ہے۔ آدمی غمگین اور ملول ہو کر اسی لیے نڈھال اور کمزور ہو جاتا ہے کہ اس کے غم اور ملال کی اکثر بنیادیں کمزور ہوتی ہیں اور سچ تو یہ ہے کہ اگر کبھی کسی غم کی کوئی بنیاد مضبوط بھی ہوتی ہے تو ذرا سے غور وفکر کے بعد پتہ چل جاتا ہے کہ اصل میں یہ بنیاد غم کی نہیں کسی خوشی کی بنیاد ہے۔ یوں دیکھیئے تو خوشی توحید کی تنہا علمبردار ہے اس کا کوئی مدمقابل ہے ہی نہیں۔ گویا وحدت کے سارے جلوے خوشی

میں نظر آتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ خوشی کی وحدت پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ اُس کی یکتائی پر۔ خوشی کا نظم وضبط کے ساتھ بہت گہرا تعلق ہے۔ بلکہ خود لفظ تعلق سے پتا چلتا ہے کہ اگر نظم وضبط نہ ہو تو تعلق کے کوئی عمدہ معنی ہی باقی نہیں رہتے۔ لیکن وہ نظم وضبط جو خوشی کی روح رواں ہے اس کا قید و بند سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ یہ نظم وضبط نہ آدمی کو قید کر کے رکھتا ہے اور نہ بند کر کے۔ باندھ جوڑ کر رکھنے کے بجائے یہ نظم وضبط تو آدمی کو ترقی کی راہوں پر گامزن کرتا ہے۔ آزادی اور حریت کے معنی اس پر آشکار کرتا ہے اور جیسے جیسے آزادی اور حریت کے معنی آشکار ہوتے ہیں، آدمی کی ذات میں خوشیوں کی صبحیں طلوع ہونے لگتی ہیں۔ یا خود آدمی کا سراپا خوشیوں کی صبح بن جاتا ہے اور پھر اچھل کود اور ہاؤ ہو یعنی رقص و سُرود سے بھی تو آدمی کی خوشی کا ایک تعلق نکلتا ہے، لیکن وہ بھی نہایت منظم۔ وہی بات کہ سچی خوشی آدمی کو بکھیرتی نہیں اسے مزید مجتمع کرتی ہے یعنی مزید مضبوط اور مستحکم۔

دراصل خوشی ایک امانت ہے اور میں نے جو ابتدا میں اسے عین عبادت اور ذمہ داری کہا ہے اس کی وجہ بھی یہی ہے۔ آدمیت اور انسانیت کے جملہ معیارات اور پیمانوں کا دار و مدار محض اس بات پر ہے کہ کوئی فرد بشر کس طرح کس بات پر اور کس قدر خوش ہوتا ہے۔ کائنات کی جملہ مخلوقات میں انسان وہ واحد مخلوق ہے جس پر خوش ہونے، خوش رہنے اور خوش رکھنے کی سب سے زیادہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ جو آدمی خوش نہیں، سمجھ لیجئے اس کا انسان ہونا تو بڑی بات ہے اس کی آدمیت بھی خطرے میں ہے۔ خوشی پہلے آدمی کو آدمی بناتی ہے اور جب وہ آدمی بن جاتا ہے تو پھر اسے وہ اپنے زور بازو سے انسانیت کے اعلیٰ ترین مدارج پر نہایت خیر و عافیت کے ساتھ پہنچانے کی پوری پوری سعی بھی کرتی ہے۔

گویا خوش ہونا ایک نہایت سنجیدہ فعل ہے۔ جس کو چند در چند غلطیوں کی وجہ سے آدمی نے غیر سنجیدہ فعل سمجھ لیا اور غمگین ہونا جو بڑی حد تک ایک غیر سنجیدہ فعل ہے اسے سنجیدہ فعل کا درجہ دے ڈالا۔ یہ ساری غلط فہمی اس وجہ سے پیدا ہوئی کہ خوش ہونا غمگین ہونے کی نسبت ذرا مشکل کام

ہے۔ چنانچہ عموماً ایسا ہوتا ہے کہ فی الحقیقت آدمی خوش ہونا چاہتا ہے لیکن غمگینی کی سہولت کے باعث وہ مغموم ہونے پر اکتفا کر لیتا ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ عام زندگی میں آدمی اکثر نہ مغموم ہوتا ہے اور نہ مسرور۔ یعنی عام طور پر ہماری زندگی خوشی اور غم کی درمیانی کیفیت میں گزرتی ہے۔ اس یکسانیت کو توڑنے کے لیے ہم ہونا تو چاہتے ہیں خوش لیکن اپنی تن آسانی کی وجہ سے مغموم ہو جاتے ہیں۔

خوش ہونا ایک اُلوہی فعل Divine Action ہے کیونکہ آپ نے اللہ میاں کو خوش ہوتے اور ناراض ہوتے تو سنا ہوگا مغموم ہوتے کبھی نہیں سنا ہوگا اور آیت مبارکہ لاتقنطو من رحمتہ اللہ کے ذریعہ تو خوش رہنے کا اعلان عام کر دیا گیا ہے۔ جو شخص مایوس نہیں پھر خواہ وہ کتنے ہی رنج و آلام میں مبتلا کیوں نہ ہو آپ اس کو خوشی سے محروم قرار نہیں دے سکتے۔ ایسے میں تو خوشی اس کی حفاظت کر رہی ہوتی ہے۔ آدمی غم کو چھپاتا ہے تو غم اس کو گھن کی طرح کھا جاتا ہے لیکن اگر خوشی کو چھپالے یا چھپا سکے تو خوشی آدمی کے نشو و نما کا باعث بنتی ہے۔ آشکار ہو یا پوشیدہ غم کو ہر صورت میں پہچانا جا سکتا ہے خوشی کو اس طرح پہچاننا آسان نہیں۔ یہ صحیح ہے کہ خوشی کے ظاہر کو پہچاننا آسان ہے لیکن خوشی کے ظاہر کا حلقۂ اثر بہت محدود رہتا ہے جب کہ خوشی کا باطن وسیع، عمیق اور بلند ہوتا ہے۔ اسی لیے خوشی کے باطن کو پہچاننا خاصا مشکل کام ہے۔ ویسے بھی اگر خوشی کے باطن کو سنبھال لیا جائے تو وہ یعنی خوشی آدمی کو مسلسل زندگی کی وسعتیں، گہرائیاں اور بلندیاں عطا کرتی رہتی ہے۔ بغور دیکھا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ انسانیت کے تمام اعلیٰ ترین درجات خوشی کے مرہون منت ہیں۔ صبر و استقلال انسانی خوشی کا ایک معتبر اظہار ہے۔ حلم و بردباری کو آپ انسانی خوشی کا ایک جچا تلا انداز کہہ سکتے ہیں۔ وسیع النظری اور کشادہ قلبی انسانی خوشی کے پھیلاؤ کی ایک واضح اور روشن صورت ہے۔ جملہ علوم و فنون انسانی خوشی کے انفس و آفاق نہیں تو اور کیا ہیں۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ایثار و قربانی کی بڑی سے بڑی مثال نہ صرف انسانی خوشی کی عظمت کو ظاہر کرتی ہے بلکہ آدمی کو موت اور زندگی سے آگے بھی لے جاتی ہے یعنی اس کے لیے گوناگوں امکانات کے در

کھولتی ہے اور یوں آدمی کی خوشی کو دیکھ کر اس کی بڑائی کا پتہ چلتا ہے۔ جتنی بڑی خوشی، اتنا بڑا آدمی۔ یہی وجہ ہے کہ زندگی کے بڑے سے بڑے المیہ کے عقب میں اس کے ہیرو کے لیے کوئی نہ کوئی عظیم خوشی سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح موجود ہوتی ہے۔ سیسہ پلائی دیوار کی طرح اس لیے کہ المیہ خواہ کتنا بڑا کیوں نہ ہو اس کا ہیرو کسی صورت میں بھی ہمت نہیں ہارتا۔ کوئی ظلم، کوئی ستم، کوئی اندوہ، کوئی الم اپنی تمام تر شقاوت کے باوجود اتنا مضبوط ثابت نہیں ہوتا جو ہیرو کو ذرا بھی جھکانے میں کامیاب ہو سکے۔ خوشی زندگی کا سرور ہی نہیں بینائی بھی ہے اور طاقت تو خیر وہ ایسی ہے کہ جو انسان سے سنبھالے نہیں سنبھلتی۔ پھر بھی اس نے اسے اٹھایا تو ہے اور سنبھال کر بھی دکھایا ہے۔ صبر و تحمل، حلم و بردباری، جرات و ہمت، استقلال اور جوانمردی وغیرہ انسانی خوشی کی وہ گھمبیر صورتیں ہیں جن پر انسانیت کے سارے جلال و جمال کا انحصار ہے۔ خوشی کا یہی تو کمال ہے کہ وہ آدمی کو انسان بنا دیتی ہے۔ اب چونکہ انسان بننے کی کوئی حد نہیں ہے اس لیے آدمی خوشی کی ذمہ داری سے پوری طرح عہدہ برآ نہیں ہو پاتا، کسی نہ کسی مقام پر آ کر اس کے ہاتھ پاؤں پھول جاتے ہیں۔ زندگی کے ۹۹ فیصد غموں کا آغاز اسی مقام سے ہوتا ہے اور جب قدرت نے آدمی کو بار بار اس مقام پر آتے دیکھا تو قرآن حکیم کو سورۂ احزاب کی ۷۲ ویں آیت کے آخر میں کہنا پڑا ''انسان بڑا ہی ظالم اور بڑا ہی جاہل ثابت ہوا۔'' اسی آیت کی ابتداء میں انسان کو داد بھی دی گئی ہے۔ کہ آسمانوں، زمین اور پہاڑوں ایسی مخلوقات نے (اس خوشی کی) امانت کو اٹھاتے ہوئے خوف کھایا لیکن انسان نے اس کو اٹھا لیا۔ مگر اس امانت کو سنبھالنے کے حوالے سے اس نے ایسے ایسے ظلم ڈھائے اور ایسی ایسی جہالتوں کا مظاہرہ کیا کہ اپنی انسانیت کی ساری عظمت کو خاک میں ملا کر رکھ دیا۔

قرآن کے مفسرین نے اس امانت کے بہت سے معانی بتائے ہیں۔ کسی نے اس کو عقل سے تعبیر کیا، کسی نے اس کو اختیار کا نام دیا، کسی نے ذمہ داری، کسی نے فرائض کی ادائیگی وغیرہ وغیرہ۔ لیکن بغور دیکھیے تو ان تمام معانی اور مفاہیم کے عقب میں جذبۂ خوشی اور فکرِ مسرت ہی کارفرما نظر آتے ہیں۔ اب یہ بالکل الگ بحث ہے کہ آپ عقل سے خوف کھائیں، اختیار کو ایک

مصیبت جانیں اور ذمہ داری سے گھبرانا شروع کر دیں۔ سچ تو یہ ہے کہ عقل خوشی کا حقیقی وسیلہ ہے، اختیار خوشی کا ایک بہت بڑا سرمایہ اور ذمہ داری تو خوشی کا وہ خزانہ ہے جو کبھی ختم ہونے کو نہیں آتا۔ اگر آپ تسلسل کے ساتھ اپنی توجہ سے کام لیتے رہیں تو ذمہ داری آپ کے لیے بوجھل ہونے کے بجائے لطیف سے لطیف تر ہوتی چلی جاتی ہے۔ زیر بحث امانت کو آسمان، زمین اور پہاڑ کیوں نہیں اٹھا سکے ہمارے خیال میں اس کا مطلب اس حقیقت کو واضح کرنا ہے کہ انسان کی ذات کے سامنے جملہ عظیم مادی اشیاء بلحاظ اہمیت کوئی معنی نہیں رکھتیں۔ امانت کا لفظ اس حقیقت کو بھی ظاہر کر رہا ہے کہ آپ اسی چیز کو بطور امانت رکھتے ہیں جس کی کوئی اہمیت ہوتی ہے اور یہ تو بہت ہی واضح سی بات ہے کہ ہر اہم چیز خوشی کا ایک دفینہ ہوتی ہے۔ اصل میں قدرت نے جس چیز کو انسان کے پاس امانت کے طور پر رکھا ہے وہ خوش ہونے اور خوش رکھنے کا عمل ہے۔ اب خواہ آپ اس عمل مسرت کو عقل کا نام دے لیں، خواہ اختیار اور ذمہ داری کا، آخر میں بات خوشی کی گود ہی میں آ کر سانس لیتی ہے۔

حیرت کی بات یہ ہے کہ سورۂ احزاب کی اس ۷۲ ویں آیت کے لفظ امانت کی اہمیت پر تو مفسرین نے بہت زور دیا ہے۔ اور انہیں ایسا کرنا بھی چاہیے تھا لیکن اس امانت کے حقیقی اور روشن پہلو یعنی خوشی کو واضح کرنے کی کوشش نہیں کی۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ مفسرین آیات قرآنی کے سیاق و سباق کی طرف عموماً توجہ کم دیتے ہیں اور صرف متعلقہ آیت کی طرف زور زیادہ لگاتے ہیں۔ ہمارے خیال میں سورۂ احزاب کی زیر بحث ۷۲ ویں آیت کو سمجھنے کے لیے اور خصوصیت کے ساتھ لفظ امانت کو اچھی طرح ذہن نشین کرنے کے لیے کم از کم ۷۰ ویں آیت سے آغاز کرنا چاہئے اور ۷۰ ویں آیت کا آغاز ایمان والوں کو خطاب کرنے سے ہوتا ہے اور آپ جانتے ہیں ایمان کے معنی امن میں آ جانے کے ہیں اور جو امن میں آ گیا سمجھ لیجئے وہ خوشی کے احاطہ میں داخل ہو گیا۔ پھر حکم ہے ''اللہ کو دھیان میں رکھو اور حق بات یعنی پکی اور مضبوط بات کیا کرو۔'' اللہ کو دھیان میں رکھنے کا مطلب ہے حقیقت عظمیٰ سے ہمیشہ تعلق قائم رکھنا۔ گویا اس طرح قول و فعل ہی میں نہیں پوری شخصیت میں ایک وسعت اور گہرائی پیدا ہو جاتی ہے جس کی بلندی کا اندازہ لگانا آسان کام

نہیں۔ حق بات یا پکی اور مضبوط بات کہنے سے مراد یہ ہے کہ حقیقت عظمیٰ سے تعلق پیدا کرنے کے بعد جو فطری طور پر زندگی کی گوناگوں سچائیوں کا گہرا احساس اور عرفان حاصل ہوتا ہے اس کا صاف صاف اظہار کرنا بھی ضروری ہے تا کہ اس کے نتیجہ کے طور پر آدمی کے اعمال بھی سنور پائیں اور کوتاہیوں کا بھی ازالہ ہو جائے۔ اس کے بعد ۷۱ ویں آیت کے آخر میں ارشاد ہوتا ہے کہ جو شخص اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کرے گا وہ بہت بڑی کامیابی سے سرفراز ہوگا۔ لفظ اطاعت میں بھی آپ جانتے ہیں، خوشی کا راز مضمر ہے۔ اطاعت کہتے ہیں اس فرمانبرداری کو جس میں حکم بجالانے والے کی رضا و رغبت یعنی خوشی شامل ہو۔ گویا خوشی خوشی اللہ اور اس کے رسولؐ کے احکامات کی تعمیل بھی کرو اور بہت بڑی کامیابی بھی حاصل کرو۔ ظاہر ہے بڑی کامیابی سے بڑھ کر کوئی بڑی خوشی کیا ہو سکتی ہے۔ اس کے بعد ۷۲ ویں زیر بحث آیت میں ارشاد ہوتا ہے "ہم نے امانت کو آسمانوں اور پہاڑوں کے سامنے پیش کیا لیکن وہ اس کو اٹھانے سے ڈر گئے مگر انسان نے اس کو اٹھالیا (بعد میں) وہ بہت ظالم اور جاہل ثابت ہوا۔"

جیسا کہ ہم نے اشارۃً پہلے بھی عرض کیا ہے لفظ امانت کا مادہ بھی امن ہے۔ جس سے ایمان بنا ہے۔ گویا امانت کا لفظ بذات خود خوشی کے حامل ہونے کا اعلان کر رہا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ نے انسان کو خوش رہنے اور دوسروں کو خوش رکھنے کی امانت کا اعزاز بخشا، انسان نے اس اعزاز کو قبول بھی کر لیا لیکن بعد ازاں اس نے اپنے آپ کو اس اعزاز کا اہل ثابت نہیں کیا۔ وہ اپنے انتہائی ظالمانہ اور انتہائی جاہلانہ رویوں سے نہ تو خود کو خوش رکھ سکا اور نہ ہی اپنے ابنائے جنس کو۔۔۔ قرآن نے انسان کو اس ضمن میں بہت زیادہ ظالم اور بہت زیادہ جاہل کہہ کر اس حقیقت کو آشکار کیا ہے کہ سچی خوشی نہ ظلم کے ذریعہ حاصل ہو سکتی ہے نہ جہالت کے ذریعہ سچی خوشی کے لیے تو انسان کو عادل اور عاقل ہونے کی ضرورت ہے۔ مگر عدل اور عقل ان دونوں کا حصول ہی انسان کے لیے سہل ترین حصول ہے بشرطیکہ انسان اپنی فطرت کے آسان راستے پر قائم رہے۔ آدمی اس راستے پر کیوں قائم نہیں رہتا اور کیوں بے راہ روی اختیار کرتا ہے؟ اس لیے کہ آسان راستے پر اسے جلدی

بور ہو جانے کا خوف شعوری یا لاشعوری طور پر لاحق رہتا ہے حالانکہ فطرت کے آسان راستے سے زیادہ کوئی پر رونق راستہ آج تک آدمی کے سامنے نہیں آیا۔ آسان اور سیدھا راستہ اس لیے پر رونق ہوتا ہے کہ اس کی منزل ابدیت اور احدیت سے ادھر کہیں ختم نہیں ہوتی۔ اس کے علاوہ اس راستے پر چل کر حیات و کائنات کے فانی ہونے کا خوف بھی دل سے نکل جاتا ہے اور پھر یوں آدمی زندگی کی چھوٹی چھوٹی خوشیوں سے خوش تو ہوتا ہے لیکن انہیں خوشی کی آخری منزل نہیں سمجھتا خود کو بڑی خوشی کے لیے مسلسل تیار کرتا رہتا ہے جس میں امکانات کا ایک عظیم جہان معانی پوشیدہ ہوتا ہے جو اس کو یعنی آدمی کو ہزار پوشیدہ ہونے کے باوجود صاف نظر بھی آتا ہے۔ یاد رکھنے کی بات ہے کہ آدمی کی زندگی کے اکثر غم ان چھوٹی چھوٹی خوشیوں ہی سے نمو پذیر ہوتے ہیں جو اس کی زندگی کو ناکام بنا کر رکھ دیتے ہیں۔ بڑی خوشی ساتھ رہے تو چھوٹی خوشیوں میں فضول غم داخل نہیں ہو سکتے۔ آدمی نے قدرت کی طرف سے عطا کردہ اس امانت کے اعزاز کی درخشندہ صورت یعنی خوشی پر ابھی تک سنجیدگی کے ساتھ غور نہیں کیا جس کی وجہ سے بے شمار ناکارہ اور مہلک غم اس کی زندگی کا مقدر بنے ہوئے ہیں۔ یوں بھی بغور دیکھا جائے تو زندگی کا غم کے ساتھ کوئی حقیقی اور براہ راست رشتہ قائم ہوتا نظر نہیں آتا۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ انہی خود ساختہ، غیر حقیقی اور مصنوعی غموں نے آدمی کی زندگی کا ستیاناس کر کے رکھ دیا ہے اور آدمی ہے کہ صحیح معنوں میں ان غموں کے خلاف کھڑا ہونے کے برعکس وہ ان غموں کے سامنے جھکا ہوا ہے اور ہر غم اس پر سواری گانٹھتا ہے اور اپنی مرضی سے جو سلوک چاہتا ہے وہ روا رکھتا ہے۔ مزید لطف کی بات یہ ہے کہ آدمی اپنے اس رویئے پر شرمندہ ہونے کے بجائے اسی حالت رکوع میں جھکے جھکے کہتا ہے کہ میرا یہ رویہ حقیقت پسندانہ ہے۔ اب یہاں سوچنے کی بات یہ ہے کہ آدمی کو خود آدمی کے سوا دوسرا کون سیدھا کھڑا کر سکتا ہے اور یوں خوشی کے حقیقی معنی بتا سکتا ہے۔ یہ کام تو اسے خود کرنا ہوگا۔ جھک کر نہیں سینہ تان کر اور سر اونچا کر کے۔۔۔

سلیم زاہد صدیقی

کیسا آدمی تھا وہ

وہ اپنے خاندان کا پہلا شخص تھا جو پاکستان بننے کے فوراً بعد ہندوستان سے آیا تھا۔ وہ ہندوستان میں ایک سرکاری دفتر میں ملازم تھا اور جب سرکار ہند نے اس سے آپشن مانگا کہ وہ ہند میں ہی ملازمت کرنا چاہتا ہے یا پاکستان سرکار کے ساتھ کراچی جانا چاہتا ہے تو اس نے ایک منٹ کا بھی توقف کیے بغیر یہ کہتے ہوئے کہ ''جب میں نے مسلم لیگ اور پاکستان کے قیام کے حق میں ووٹ دیا ہے تو اب میرا ووٹ پاکستان کے خلاف کیونکر ہو سکتا ہے۔۔ میں پاکستان جاؤں گا۔''

اس کے دفتر کے ہندو سکھ اور مسلمان سب ہی دوستوں نے سمجھایا کہ وہ جلد بازی میں کوئی فیصلہ نہ کرے سب نے اس سے کہا

''دیکھو تمہارا فیصلہ جذباتی فیصلہ ہے۔۔ تم اور تمہارا خاندان یہاں صدیوں سے آباد ہے۔ یہ شہر یہ ملک تمہارے تہذیب اور تمدن کا امین اور گہوارہ ہے۔ تم نے آج تک اُس سرزمین کو نہیں دیکھا تم وہاں ان کی تہذیب اور تمدن سے واقف نہیں۔ وہاں کی زبان تمہارے لیے اجنبی۔ لوگ اجنبی۔ ماحول اجنبی۔ موسم اجنبی۔۔۔۔''

''نہیں تم غلط کہہ رہے ہو۔ وہاں میرا کچھ بھی اجنبی نہیں ہے تم وہاں کے موسم۔ ماحول۔ زبان اور تہذیب وتمدن کو میری تہذیب تمدن زبان سے مختلف ضرور کہہ سکتے ہو مگر اجنبی نہیں۔ وہ میرا ملک ہے۔ وہاں سب میرے بھائی ہیں۔ وہ میرا وطن ہے اس کے لیے میں نے مسلم لیگ اور جناح صاحب کو ووٹ دیا ہے۔ اب اگر میں وہاں نہیں جاتا تو سمجھو میں غداری کر رہا ہوں۔ اور رہی بات مختلف زبان۔ مختلف تہذیب۔ مختلف تمدن کی تو یہاں ہندوستان میں بھی تو بہت کچھ مختلف ہے۔ صبور خان شاہجہاں پور کا ہے۔ اکبر جیسور کا۔ اقبال پانی پت کا اعظم بھوپال کا۔ کنھیا لعل

راجستھان کا۔ رام کرشنا دکن کا ہے۔ سردار راہندر سنگھ پٹیالہ کا ہے۔ عبدالغفور بہار کا اور یہ۔۔۔ یہ ہیرالال مدراس کا۔۔ کس کس کا نام لوں۔ سب کی تہذیب تمدن لباس لہجہ زبان رنگ سب الگ الگ ہے۔ مگر سب میرے شہر لکھنؤ میں رہ رہے ہیں بلکہ سردار اور رام کرشنا نے تو یہاں ذاتی مکان بنا لیے ہیں یہ اب واپس پٹیالہ اور حیدر آباد نہیں جائیں گے۔

"مگر عرفان! یہ تو سوچو تمہارا پورا خاندان یہاں ہے۔ دوست احباب یہاں ہیں۔ تم وہاں تنہا کیسے رہو گے۔"

"تنہا؟؟۔۔ پھر وہی بات۔۔ یار میں وہاں تنہا کہاں ہوں گا۔ وہاں سب میرے مسلمان بھائی ہوں گے۔

"وہاں سب سندھی بلوچی کابلی اور پنجابی بول رہے ہوں گے۔ وہاں تمہاری یہ اردوئے معلیٰ کون سمجھے گا۔"

"یہ مدراسی سمجھتا ہے نا۔۔ یار تم لوگ کیسی باتیں کر رہے ہو۔ یعنی میں یہاں ہیرالعل کی مدراسی سمجھ لیتا ہوں سندھی نہیں سمجھ سکوں گا۔ جب کہ وہ میرا دینی بھائی بھی ہے۔"

تم بہت جذباتی اور مذہبی عصبیت سے مغلوب ہو رہے ہو۔"

عصبیت۔۔ ہاں تم لوگ عصبیت کے علاوہ اور سوچتے ہی کیا ہو۔ تمہاری عصبیت ہی نے تو پاکستان کی ضرورت کو محسوس کرایا ہے۔ ہاں میں متعصب ہوں۔ مگر یہ تعصب میرا دین کا دیا ہوا ہے۔ میں پاکستان جا ہی اس لیے رہا ہوں کہ وہاں تعصب نہیں ہوگا۔ ہمارے بچوں کو تعصب دکھ اور عذاب نہیں سہنا پڑے گا۔"

یار عرفان یہ مولانا ابوالکلام آزاد بھی تو مسلمان ہیں۔ ان کی بھی تو سنو وہ کیا کہہ رہے ہیں؟ انہوں نے ہندوستان سے جانے والے مسلمانوں سے کہا ہے کہ "تم لوگ جہاں جا رہے وہاں کی زبان۔ معاشرت۔ ماحول۔ ہر چیز یہاں سے مختلف ہے۔ مشترک ہے تو صرف مذہب۔ آج تم سب مذہبی عصبیت سے مغلوب ہو کر جا رہے ہو۔ مگر کل جب مذہبی عصبیت کا جنون ٹھنڈا ہوگا تو

علاقائی عصبیتیں سر اٹھائیں گی۔ اس وقت تم کو اپنی غلطی کا احساس ہوگا۔ یاد رکھو ہندو تمہارا دینی حریف ضرور ہے مگر تہذیبی اور معاشرتی حریف نہیں ہے۔ وہ بھی وہی پاجامہ پہنتا ہے جو تم پہنتے ہو وہی شیروانی دوپلی ٹوپی اوڑھتا ہے جو تم اوڑھتے ہو وہی زبان بولتا ہے جو تم بولتے ہو۔ مگر جہاں تم جارہے ہو وہاں ہر چیز تم سے مختلف ہے۔

''چھوڑو دوست!''۔۔۔ عرفان نے بات کاٹتے ہوئے کہا ''تم بھی کس کی بات کا حوالہ دے رہے ہو۔۔۔ ہنہ۔ ابوالکلام آزاد۔ گاندھی کا پٹھو۔ ہزماسٹرز وائس۔ کانگریس کا شو بوائے۔ بڑا آیا ابوالکلام۔۔۔ بہرحال میرا فیصلہ اٹل ہے اور میں تو اختر۔ مونس۔ جاوید۔ محمد علی یعنی تم سب مسلمانوں سے بھی کہوں گا چلو میرے ساتھ تم بھی پاکستان چلو۔ اس کی تعمیر کرؤ۔۔۔ اور ایک بات یاد رکھو تم کو بھی بہرحال پاکستان آنا ہی پڑے گا۔ اپنی اولادوں کے لیے کیونکہ یہاں تم کو برداشت نہیں کیا جائے''

عرفان سب کی مخالفت کے باوجود پاکستان آگیا۔ اس نے بیوی سے چلنے کو کہا اور وہ بھی ساتھ چلنے کو تیار ہوگئی۔ وہ کراچی پہنچا۔ یہاں اس کا کوئی نہ تھا مگر اس کو محکمہ کی طرف سے جہانگیر روڈ پر ایک گھر مل گیا۔ یہ سرکاری کوارٹر تھا۔ ہر طرف افراتفری تھی۔ مگر وہ سب سے بے نیاز اپنے وطن کی ترقی کے لیے تن دہی سے اپنے کام میں مشغول رہا سال بھر بعد اللہ نے ایک اولاد عطا کردی۔ اس نے پیچھے پلٹ کر نہیں دیکھا۔ بیوی کبھی کبھی اداس ہو جاتی تھی مگر بیٹا ہونے کے بعد اس کی اداسی میں بھی کمی آگئی۔ عرفان جب بھی ہندوستان خط لکھتا اس میں سب کو پاکستان آنے کی دعوت ہوتی۔ چند سال بعد اسے پتہ چلا کہ اس کے خاندان کے کئی ہونہار بچوں کو ڈاکٹری اور انجینیر نگ کالج میں داخلہ نہیں مل سکا۔ اس نے پھر سب کو کھلی دعوت دی کہ وہ پاکستان آئیں اور یہاں پڑھیں اس کی دعوت پر آنے والا پہلا فرد اس کی سالی کا بیٹا خالد تھا۔ خالد نے میٹرک پاس کیا تھا اور بہتر مستقبل کی تلاش میں پاکستان آگیا تھا۔ خالد یہاں روزگار کے سلسلے میں آیا تھا مگر عرفان نے اس کو اپنی تعلیم جاری رکھنے کا مشورہ دیا۔ عرفان کی بیوی تو اس کی خالہ تھی ہی سو اس کے لیے یہ

خوشی کی بات تھی کہ اس کی بہن کا بیٹا اس ساتھ ہے۔ خالد ذہین لڑکا تھا۔ یہاں اس کو موقع ملا اور وہ تیزی سے آگے بڑھتا گیا۔ انٹر میں اول آیا۔ پھر بی اے میں بھی اس نے کامیابی کا تسلسل برقرار رکھا۔ اس دوران اس کے والد اور بھائی بہن بھی پاکستان آ گئے ماں کا انتقال ہو چکا تھا۔ والد اور دیگر لوگوں کے آنے کے بعد خالد کے والد نے بھی جو ریٹائر ہو کر اپنی جمع پونجی لے کر پاکستان آئے تھے لالوکھیت میں ایک مکان خرید لیا۔

عرفان سے خالد کے روابط مصروفیات کے بڑھ جانے کے باعث کم ہو گئے تھے مگر ہر ماہ ملاقات رہتی۔ بی اے کرنے کے بعد خالد نے ملازمت کر لی تھی۔ مگر پڑھائی کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ ایم اے میں خالد نے انگلش لٹریچر میں اول پوزیشن حاصل کی اور گولڈ میڈل حاصل کیا۔ کنووکیشن میں خالد کی ملاقات ایک سابق بنگالی آئی سی ایس جمال سہروردی سے ہوئی جس نے خالد کو ترغیب دی کہ وہ مقابلہ کا امتحان دے۔ ایم اے میں گولڈ میڈل حاصل کرنے کے باعث اسے یونیورسٹی میں لکچرار کی نوکری بھی مل گئی۔

خالد سے عرفان کی ملاقاتوں میں کمی آتی گئی عرفان بھی اپنے بیوی بچوں میں زیادہ مصروف ہو گیا تھا۔ اس کے والد بھی ریٹائر ہو کر اپنے بیٹی بیٹے سمیت بڑے بیٹے عرفان کے پاس پاکستان آ چکے تھے۔ خالد نے پی سی ایس کی تیاری شروع کی اسی دوران جمال سہروردی نے اپنی بیٹی حسنہ سے خالد کی شادی طے کر دی۔ اس رشتہ کے سلسلہ میں خالد نے کسی سے کوئی مشورہ نہیں کیا اور شادی کے بعد وہ نرسری پر واقع جمال سہروری کی کوٹھی میں منتقل ہو گیا۔ خالد نے سی ایس پی کا امتحان پاس کر لیا اور ٹریننگ انسٹیٹیوٹ لاہور چلا گیا۔ وہیں سے اس کی پوسٹنگ جیسور ہو گئی۔ اس پوسٹنگ سمیت اس مقام تک پہنچنے میں جمال سہروردی کے روابط کا ہاتھ بھی تھا کیونکہ حسنہ سے شادی کے بعد انہوں نے خالد کو ڈومیسائل کھلنا کا بنوا دیا تھا اور مشرقی پاکستان کے کوٹے پر ہی خالد کو سی ایس پی کا کیڈر ملا تھا۔۔۔

عرفان سے اب خالد کا تعلق واجبی سا رہ گیا تھا عید بقر عید کارڈوں کا تبادلہ ہو جاتا یا خوشی غمی

کی اطلاع آجاتی۔عرفان کا ایک ہی بیٹا تھا جس نے بی کام کرنے کے بعد ملبوسات کی درآمد کا کاروبار شروع کر دیا۔عرفان بھی سرکاری ملازمت سے ریٹائر ہونے کے بعد اپنے بیٹے رضوان کے کاروبار میں ہاتھ بٹانے لگا۔اب وہ جہانگیر روڈ کے سرکاری کوارٹر میں نہیں رہ رہے تھے انہوں نے ناظم آباد میں دوسو گز کا ایک مکان لے لیا تھا۔رضوان کی بھی شادی ہوگئی تھی۔زندگی سکون سے گزر رہی تھی۔اسی دوران رضوان کو ایک غیر ملک سے سپلائی کا ایک بہت بڑا آرڈر ملا۔لیکن اس کے لیے حکومت پاکستان سے ایک سرٹیفکٹ درکار تھا۔جس کے لیے محکمہ کا ایک اہلکار رشوت کے طور پر ایک بڑی رقم کا مطالبہ کر رہا تھا۔عرفان نے رقم دینے سے انکار کیا۔رضوان نے باپ سے کہا کہ وہ خالد بھائی سے بات کریں تا کہ وہ اپنا رسوخ استعمال کر کے حکومت سے وہ سرٹیفکٹ جاری کرادیں۔

عرفان نے کہا ''بیٹا !تمہارے باپ نے ہمیشہ دیا ہے۔کبھی کسی سے کچھ مانگا نہیں ہے۔کبھی کسی سے کوئی توقع نہیں رکھی ہے۔کیونکہ جب توقع پوری نہ ہو تو مان ٹوٹ جاتا ہے۔''

''ابا۔خالد بھائی کوئی غیر تو نہیں ہیں۔آپ نے ان کو اس وقت سہارا دیا تھا جب وہ پاکستان میں بالکل تنہا تھے۔وہ تو پاکستان نوکری کی تلاش میں آئے تھے۔اگر آپ ان کو بڑھاوا نہ دیتے تو آج وہ اس پوزیشن پر نہیں ہوتے،شاید سرکاری محکمہ میں سینئر کلرک یا زیادہ سے زیادہ سیکشن آفیسر یا پھر کسی پرائمری اسکول میں ٹیچر۔میٹرک پاس اس سے آگے کہاں تک جاسکتا تھا۔۔۔پھر وہ ہمارے خالہ زاد بھی ہیں۔آپ کی عزت بھی کرتے ہیں۔''

ہاں بیٹا میں اسی عزت سے ڈرتا ہوں۔اگر۔۔۔۔''

''اگر مگر کچھ نہیں ابا!۔۔ان سے کوئی توقع مت کیجئے۔بلکہ یہ سوچ کر ان سے بات کریں کہ وہ انکار کر دیں گے۔۔مگر بات ضرور کریں''۔

''جب توقع رکھے بغیر ہی بات کرنی ہے تو بات کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟''

''اتمام حجت کے لیے ابو۔۔میری خاطر ایک مرتبہ بات تو کر لیں۔۔ورنہ کل کلاں وہ کہیں

گے کہ مجھے بتانا تو تھا۔ پس اتمام حجت کیجئے اور ایک مرتبہ اسلام آباد جا کر بات تو کر لیں'' عرفان بیٹے کی ضد کے آگے مجبور ہو گیا۔ اسلام آباد جا کر اس نے خالد سے ملاقات کی۔ خالد نے انہیں اپنے گھر میں ٹھہرایا۔ خاطر مدارات میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی مگر کام کے سلسلہ میں انہوں نے یہ کہتے ہوئے گویا معذرت ہی کر لی کہ ''خالو جان! دراصل یہ کام میرے محکمہ سے متعلق نہیں ہے اور جس محکمہ کا کام ہے وہاں کے کسی آدمی سے میری کوئی خاص واقفیت نہیں ہے۔ پھر بھی میں کوشش کر لوں گا مگر امید رتی بھر بھی نہیں ہے۔ پھر بھی آپ کوائف مجھے دے دیں میں دیکھوں گا۔ اور جو بھی ہو سکا کروں گا۔''

''عرفان کے جی میں تو آیا کہ کہہ دے کہ'' خالد غلط بیانی مت کرو جس محکمہ کا کام ہے اور جس کو یہ کام کرنا ہے اس شخص کو نہ صرف تم جانتے ہو بلکہ وہ تمہارا برج پارٹنر ہے۔ نیز یہ کام غیر قانونی بھی نہیں ہے۔'' لیکن اس نے خالد کو شرمندہ کرنے کے بجائے کہا ''نہیں اس کی ضرورت نہیں ہے بیٹا۔ یہ تو رضوان نے ضد کی اس لیے میں تمہارے پاس چلا آیا ورنہ میں تمہیں ہرگز کسی مشکل میں نہیں ڈالنا چاہتا'' اس واقعہ کو چار سال گزر گئے۔ مارچ ۱۹۶۹ء کی ۲۵ تاریخ تھی۔ عرفان فجر کی نماز پڑھ کر مسجد سے واپس آیا تھا دروازے پر اخبار پڑا تھا۔ سرخی پر نظر پڑی اور وہ چونک پڑا۔۔۔ ملک میں مارشل لاء نافذ ہو گیا تھا۔ نئی حکومت نے سول سروس کے تین سو تین ملازمین کو معطل کر دیا تھا۔ جلی حروف سے لکھے جانے والے ناموں میں خالد کا نام بھی موجود تھا۔ عرفان بے قرار ہو گیا۔ اس نے خالد سے رابطہ کرنا چاہا مگر یہ اتنا آسان نہ تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اگر خط لکھے تو کیا لکھے۔ دن بھر وہ بہت اداس رہا۔

رات وہ بستر پر لیٹا مگر نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔۔ کمرے میں نیلا بلب جل رہا تھا۔ ایک کونے میں گزرے وقتوں کی ایک میز کرسی رکھی تھی۔ اس میز کرسی سے اس کی ماضی کی یادیں وابستہ تھیں۔ وہ میز کرسی تھی جو وہ اس وقت خرید کر لایا تھا جب خالد نے اس کے کہنے پر کالج میں داخلہ لیا تھا۔ یہی میز کرسی رضوان کے استعمال میں رہی اور ان یادوں کو تازہ رکھنے کے لیے

عرفان نے اس میز کرسی کو اپنے کمرے میں سجالیا تھا۔ جس پر وہی بندر کے سر جیسا ٹیبل لیمپ رکھا ہوا تھا جو وہ رضوان کے لیے کباڑی کی دکان سے خرید کر لایا تھا۔ اس میز پر سجا قلمدان بھی اسی زمانے کی یادگار تھا۔ عرفان جب سے اس گھر میں آیا تھا ذاتی خط یہیں بیٹھ کر لکھا کرتا تھا۔ اس نے رائٹنگ پیڈ اٹھایا۔ قلم کھولا اور لکھنا شروع کیا۔

عزیزم۔۔ خالد سلمہٗ

سدا خوش رہو

آج صبح کے اخبار سے جو اطلاع ملی اسے یقیناً اچھی نہیں کہا جا سکتا۔ مگر اللہ کے ہر کام میں کوئی نہ کوئی مصلحت ہوتی ہے۔ انسان کو ہمیشہ اللہ سے اچھائی اور بہتری کی امید رکھنی چاہیے۔ اور مجھے یقین ہے کہ اس میں بھی تمہاری بھلائی کا کوئی پہلو یقیناً ہے۔ میں یہ خط واقعہ پر تبصرہ کے لیے نہیں لکھ رہا بلکہ اپنی غرض سے لکھ رہا ہوں۔ میں تمہاری ذہانت۔ اہلیت اور قابلیت کا ہمیشہ سے معترف رہا ہوں اور میری اسی وقت سے یہ خواہش رہی تھی جب سے تمہارے بھائی رضوان نے یہ کاروبار شروع کیا تھا کہ تم کاروبار میں (جو تمہارا بھی ہے) اپنی صلاحیت کا استعمال کرو۔ مگر تم سے اس بات کا اظہار اس وجہ سے نہیں کر سکا کہ تم اپنے خواب کی تکمیل کر رہے تھے اور یہ شاید تمہارے لئے ممکن نہ تھا کیونکہ تم سرکاری ملازم تھے دوم یہ کہ کسی کے بھی ذہن میں یہ گمان ہو سکتا تھا کہ تم کو اس کاروبار سے منسلک کرنے کے پسِ پشت تمہاری سرکاری حیثیت کے استعمال کی خواہش ہو۔ لہٰذا میں نے تم سے کبھی اس خواہش کا اظہار نہیں کیا تھا۔ تمہاری قدر وہ لوگ نہیں کر سکے اس میں تمہارا کوئی دوش نہیں۔ ہیرے کی پرکھ سب کو نہیں ہو سکتی۔ میں اسے اپنے لیے باعث فخر اور اعزاز تصور کروں گا اگر تم میرے کاروبار میں اپنی صلاحیت کا استعمال کرو۔ میرا کاروبار بہت بڑا نہیں ہے لیکن اس قدر بڑا ضرور ہے کہ ہم سب اس سے اپنی جائز ضروریات کو بہت احسن طریقے سے پوری کر سکتے ہیں۔ رضوان کو بھی میری رائے سے اتفاق ہے وہ تم کو سلام کہتا ہے اور تمہارا منتظر ہے۔ بہو کو دعا بچوں کو پیار

تمارا دعا گو۔۔عرفان

اس نے خط کو ایک نظر پھر پڑھا۔ اور چشمہ اتارتے ہوئے رضوان کو آواز دی۔ رضوان جی ابا جی کہتا ہوا کمرے میں داخل ہوا تو عرفان نے خط اس طرف بڑھاتے ہوئے کہا

''یہ لو۔۔اسے پڑھ لو اور کل صبح پہلی ڈاک سے خالد کو ارجنٹ رجسٹری کر دو''

رضوان نے خط کو پڑھا اور ''جی ابا جی ضرور'' کہتے ہوئے کمرے سے نکل گیا۔۔

عرفان جانتا تھا کہ رضوان نے اس کے حکم سے کبھی سرتابی نہیں کی ہے اس نے سکون کا لمبا سانس لیا اور بستر پر لیٹ گیا۔۔۔اس کی دن بھر کی کلفت اور اداسی دور ہو چکی تھی۔۔۔۔۔

طارق بن عمر

کرب

میرا نام خدا بخش ہے، میری حرکتیں کچھ ایسی رہی ہیں کہ شاید خدا مجھے نہ بخشے۔ میں آج آپ کو اپنی زندگی کی وہ کہانی سُنا رہا ہوں کہ شاید میرے سینے کا بوجھ کسی حد تک کم ہو جائے۔ اِس وقت میں عمر کے جس حصّے میں ہوں یہ تقاضا کرتا ہے کہ انسان خود عزت کے ساتھ اپنی آخری آرام گاہ کے لیے دُعا کرتا رہے۔ لیکن میں کیا کروں مجھے جس طرح موت سے ڈر لگتا ہے، اِسی طرح میں زندگی سے بھی خوف زدہ رہتا ہوں۔ میرا بس چلے تو میں خود کو کچھ ایسے طریقے سے فنا کر دوں کہ جہاں میرا ذرہ ذرہ ہوا میں بکھر جائے، کہ میرا گناہ ناقابلِ معافی ہے۔ میری پیدائش نہایت ہی امیر گھرانے میں ہوئی، میں نے ہمیشہ اپنے منہ میں سونے کا نوالہ دیکھا۔ شکل وصورت بھی نہایت حسین وجمیل پائی، نکلتا ہوا قد، سفید رنگ وروپ جس میں انار کی طرح ایک ہلکی سی سُرخی کی جھلک بھی پائی جاتی تھی۔

میری شادی ایک ایسے گھرانے میں ہوئی، جہاں صرف یہ سوچا جاتا تھا کہ پیسے کو خرچ کس طرح کیا جائے دولت وعزت خدا نے بے حساب عطا کی تھی۔ خدا نے مجھے ایک ہی بیٹا عطا کیا، جسے میں دل وجان سے چاہتا تھا۔ جیسے ہی اسد نے تعلیم مکمل کی میں نے اِسے مزید تعلیم کے لیے امریکہ بھیج دیا تا کہ وہاں کچھ کورس کر سکے۔ اگر چہ اِس جدائی نے مجھے کسی حد تک دُکھی کر دیا لیکن یہ میرے بیٹے اس کے مستقبل کا سوال تھا، جب میرا بیٹا امریکہ سے واپس آیا تو میں نے اِس میں ایک خاص تبدیلی محسوس کی کہ بولتے بولتے نہ صرف اچانک خاموش ہو جاتا بلکہ اس کی آنکھوں میں ایک چمک سی لہرا جاتی۔

میں اُس دن سردیوں کی دُھوپ سینک رہا تھا اور گرم گرم چائے اور سموسوں سے لطف اندوز

ہو رہا تھا کہ اچانک میرا خاص نوکر میرے پاس آیا اور بڑے رازدارانہ انداز میں سرگوشی کرتے ہوئے بولا صاحب اسد صاحب کا نازو نامی لڑکی سے کچھ خاص معاملہ چل رہا ہے۔ یہ سنتے ہی اچانک میں سناٹے میں آگیا، اور چائے کی پیالی سے اُڑتے ہوئے دھویں کو غور سے دیکھنے لگا۔ کہنے کو تو میں بہت کچھ کہہ سکتا تھا، لیکن میں نے خاموشی ہی میں عافیت سمجھی اور ہاتھ کے اشارے سے نوکر کو جانے کا حکم دیا۔

نازو کا باپ ہماری ہی زمینوں پر کام کرتا تھا، صدیوں سے اُس کا خاندان ہمارے ہی باپ دادا کے ٹکڑوں پر پلتا آیا ہے، نازو کی ماں ہمارے گھر میں صفائی وغیرہ کرتی تھی، نازو اپنے ماں باپ کی اکلوتی بیٹی تھی، اسے دیکھ کر صرف ایک ہی خیال دل میں آتا تھا، کیچڑ میں کنول کا پھول اور اس پھول کی واحد بدقسمتی یہ تھی کہ وہ ایک غریب خاندان میں پیدا ہوئی تھی۔ مجھے نہ صرف اپنے بیٹے کی عقل پر حیرت ہو رہی تھی بلکہ اپنی تربیت پر بھی کہ میں نے کہاں غلطی کی۔ بھلا مخمل میں ٹاٹ کا پیوند اپنی جگہ بنا پاتا ہے؟ وقت اِس تیزی سے گذر جائے گا میں نے سوچا ہی نہ تھا، اسی آنگن میں اس نے چلنا سیکھا، اور اِس بات کو ابھی ہفتہ ہی گذرا تھا کہ ایک شام میرا بیٹا اسی آنگن میں کہ جس میں اس نے بولنا سیکھا، آج نازو کا ہاتھ پکڑے میرے سامنے کھڑا تھا، اور بڑے پُر اعتماد لہجے میں کہہ رہا تھا، ابو میں نے صرف اور صرف اِسی نازو سے شادی کرنی ہے، میں اِسے اپنے ساتھ امریکہ لے کے جاؤں گا، اس کے انداز گفتگو میں جس طرح کا استحکام تھا اُس نے مجھے حیران کر دیا تھا۔

میں نے ایک نظر نازو پر ڈالی، خاموش اور چُپ سی کھڑی اِس لڑکی نے لمحہ بھر کو بھی اپنی آنکھیں اُوپر نہ اُٹھائیں۔ ابو۔۔۔ کیا آپ میرے لیے اتنا بھی نہیں کر سکتے، اس نے بڑی محبت اور اُمید بھرے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔ بے شک کسی نے بالکل صحیح کہا ہے، محبت اندھی ہوتی ہے اُسے کچھ نظر نہیں آتا، شاید اس کی آنکھیں صرف اور صرف اپنا اندر دیکھتی ہیں، اور اُس اندر میں اُس کی غرض چھپی ہوئی ہوتی ہے، اور اس وقت بھی میرا بیٹا کچھ اِسی کیفیت سے دوچار تھا، اُسے میری کیفیت کا اندازہ ہی نہیں تھا۔

میں نے کسی قدر خود کو سنبھالتے ہوئے کہا، بیٹا اسد کیوں نہیں، تمہارے لیے تو میری جان بھی حاضر ہے، تم بالکل کسی بھی قسم کی فکر مت کرو۔ میری باتوں نے گویا اُس کے بے جان چہرے پر جان سی ڈال دی۔ یک دم آگے بڑھا، میرے پیروں کو چھوا اور نازو کی طرف دیکھتے ہوئے بولا میرے ابو، تمہارا خیال ایسے رکھیں گے کہ جیسے میرا رکھتے ہیں، یہ کہتے ہوئے وہ کمرے سے باہر چلا گیا۔

اسد کے جاتے ہی میں ایک جھٹکے سے اپنی کرسی سے اُٹھا اور نفرت بھری نگاہوں سے نازو کو دیکھتے ہوئے اُس کے بالوں کو پکڑا اور جھٹکا دیتے ہوئے بولا، بدذات، حرام خور، ہمارے ٹکڑوں پر پلنے والی کُتی، بے غیرت، تو کیسی عورت ہے، تجھے ذرا سی بھی شرم نہ آئی جس تھالی میں کھاتی ہے اُسی میں چھید کرتی ہے۔ وہ تکلیف کے سبب کراہنے لگی، آنکھوں سے آنسو بہنے لگے، اور ہاتھ جوڑتے اور روتے ہوئے بولی، صاحب میرا کوئی قصور نہیں ہے، میں تو کبھی ایسا سوچ بھی نہیں سکتی آپ بڑے لوگ ہو، جو چاہے کر سکتے ہو، میں بھلا کیا کر سکتی ہوں۔

اگرچہ نازو کی باتوں سے مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ سچ بول رہی ہے لیکن مجھے اِس سچ میں بھی اپنے بیٹے کی بے عزتی سی محسوس ہوئی۔ اچانک میرے ذہن میں ایک خیال آیا، اور پھر زور سے بولا کمبخت چل اور جا کر مر، تجھے تو بعد میں دیکھوں گا، یہ کہتے ہوئے میں نے اُسے سامنے سے چلے جانے کو کہا۔ میں خاموشی سے اپنے کمرے میں ٹہل رہا تھا، ابھی ابھی کچھ دیر پہلے میں نے اپنے خاص نوکر سے کچھ صُلح مشورہ لیا تھا، اور اِسی مشورہ کے تناظر میں، میں نے اپنے بیٹے اسد کو اپنے کمرہ خاص میں طلب کیا تھا، شاید اُسے بھی معلوم تھا کہ اُسے اُس کے باپ نے کیوں طلب کیا ہے اس لیے اُس نے ذہنی وجسمانی ہر قسم کی صورتحال کے لیے خود کو تیار کیا تھا۔

میں نے ذرا تیکھے لہجے میں اپنے بیٹے کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ، اسد مجھے تم سے ایسی بے وقوفی کی ذرہ برابر بھی اُمید نہ تھی، اس سے تو بہتر تھا کہ تم امریکہ جانے کے بجائے انہی زمینوں پر ہل چلاتے، جن پر پلتے ہوئے نازو اور اُس کے خاندان والے کئی نسلوں سے سوکھی روٹی کھاتے چلے آئے ہیں۔

اُس وقت میں نے تمہیں اس دو ٹکے کی لڑکی کے سامنے کچھ کہنے سے احتراز کیا، مگر اب اتنا تو سوچو تمہاری ماں کو معلوم ہوگا تو کیا ہوگا؟ سب سے بڑھ کر ہم خاندان والوں کو منہ دکھانے کے قابل ہوں گے؟ اسد نے نظریں جھکاتے ہوئے کہا، ابو نازو ایک بدنصیب لڑکی ہے، دُکھی ہے، اس بے چاری نے ابھی دیکھا ہی کیا ہے میں اسے اتنی خوشیاں دوں گا اتنی خوشیاں دوں گا کہ وہ سب کچھ بُھلا دے گی۔ اسد نے میرے ہاتھوں کو چومتے ہوئے کہا، ابو میں بالکل بے بس ہوگیا ہوں، میں اس سے بے حد پیار کرتا ہوں۔

اور پھر مجھے ایسا محسوس ہوا کہ جیسے میں اپنے بیٹے سے ہار گیا ہوں، وہ باپ جو ساری دنیا کے سامنے سینہ تان کر چلتا تھا، آج کچھ دب سا گیا تھا، معلوم نہیں یہ بیٹے کی محبت تھی، یا اُس لڑکی کی تقدیر کہ جس نے مجھے اندر ہی اندر توڑ سا دیا تھا، اور اسی توٹنے نے مجھے راضی کرالیا۔

میرا بیٹا اسد واپس امریکہ چلا گیا، اور نازو میرے ساتھ رہنے لگی۔ میں نے بہت جلد یہ محسوس کیا کہ اس لڑکی نے غیر محسوس طریقے سے سب کو اپنا گرویدہ بنالیا ہے، حتیٰ کہ نوکر بھی اُس کے آگے پیچھے پھرنے لگے تھے، لیکن مجھے اس سے اس حد تک نفرت تھی کہ اسے تکلیف دینے اور اس کی بے عزتی کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہ دیتا تھا۔ ایک دن گھر کی نوکرانی نے مجھے بتایا کہ صاحب نازو کی طبیعت خراب ہے۔

میں نے نفرت سے کہا، زہر دے دو۔۔۔

اِسی دوران میرا خاص نوکر کمرے میں داخل ہوا، اس نے شاید میرے یہ الفاظ سُن لیے تھے کہنے لگا صاحب آپ نازو سے اتنی نفرت کیوں کرتے ہیں، اس سارے معاملے میں اس کا اتنا قصور نہیں ہے، اصل میں ہمیں تو آپ کا بیٹا اسد اپنی جان سے بھی پیارا ہے، بہتر یہی ہوگا کہ آپ بھی اپنے بیٹے اسد کی خاطر اسے اپنا سمجھیں۔ یہ کہہ کر میرا خاص نوکر تو چلا گیا، لیکن مجھے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر گیا، انسان سوچتا کچھ ہے، ہو کچھ جاتا ہے، معلوم نہیں انسان کی تدبیر کہاں سے شروع ہوتی ہے اور تقدیر کہاں سے۔ تدبیر اور تقدیر کا کھیل ازل سے جاری ہے اور اس کھیل میں

زندگی کی حقیقت ٹیبل ٹینس کی گیند کی مانند رہ جاتی ہے، کبھی ایک طرف اور کبھی دوسری طرف!

اچانک میرے باپ کا انتقال ہوگیا، مجھے اپنے باپ سے ایک خاص قسم کا لگاؤ تھا، مجھے فوری طور پر آبائی گاؤں جانا پڑا باپ کی رحلت کو میں نے نازو کا منحوس قدم قرار دیا، اور پھر یہ قدم مجھے اپنی گردن کی جانب بھی بڑھتے ہوئے محسوس ہونے لگے۔ باپ کے چالیسویں کے بعد تمام لوگ چلے گئے لیکن میں نے اپنے خاص نوکر اور نازو کو روک لیا۔ ایک دن اچانک نازو کی طبیعت کچھ زیادہ ہی خراب ہوگئی، وہ کافی تکلیف میں تھی میں نے اپنے خاص نوکر کے ذریعے سے ایسی دوا پلا دی کہ جس کے اثر سے نازو دو دن تک سوتی رہی۔

میرے ذہن میں تیزی سے شیطانی منصوبے بن رہے تھے میں نے اُس دن سارے گاؤں میں اعلان کروادیا کہ نازو مرگئی، میں جلد از جلد نازو کو دفنا دینا چاہتا تھا۔ اچانک نمازِ جنازہ پڑھتے وقت یہ افواہ اُڑ گئی کہ لڑکی زندہ ہے، مولوی نے جنازہ پڑھنے سے انکار کردیا اور مجھے ایک طرف لے جا کر آہستہ سے اِس افواہ کے بارے میں پوچھا۔

جواب میں، میں نے کہا مولوی صاحب اس عورت کا چال چلن ٹھیک نہیں ہے کیا ایسی بدکار عورت کا ایسا انجام نہیں ہونا چاہیئے؟ بات کو مزید آگے بڑھاتے ہوئے میں نے کہا

مولوی صاحب نہ صرف خاندان کی بے عزتی ہوگی، بلکہ یہ بے حیائی آہستہ آہستہ ہمارے گاؤں میں پھیل جائے گی اور میں نہیں چاہوں گا کہ ہمارے گاؤں کی مذہبی فضا کو کوئی خراب کرے۔ مولوی صاحب توبہ توبہ کرنے لگے، نمازِ جنازہ پڑھائی اور پھر شام کو انعام سے نوازے گئے۔ کچھ دن خاموشی سے گزرے اور پھر میرے اپنوں کی آنکھوں میں، میں نے سوالیہ نشان دیکھنے شروع کیے، میرے بیٹے اسد کو جب نازو کی موت کا علم ہوا تو وہ فوراً امریکہ سے واپس آیا لیکن میں نے اُس کی آنکھوں میں بھی نہ صرف سوالیہ نشان دیکھنا شروع کیے۔ بلکہ اپنے لیے ایک نفرت کی لہر بھی محسوس کی، کچھ دنوں کے بعد اسد واپس امریکہ چلا گیا۔

شاید جس گناہ کو میں نے منوں مٹی میں دبانا چاہا وہ اب اپنی پوری آب وتاب کے ساتھ

زمین کا سینہ چیر کر لہرا رہا تھا۔ میرے گناہ کا علم سب کو ہو گیا تھا۔ آج میں تنہا ہوں، میرا بیٹا مجھ سے نفرت کرتا ہے، میری بیوی، میرے رشتہ دار میرے ساتھ اچھوت کا سا برتاؤ کرتے ہیں۔ ظاہری طور پر میں آج بھی صحت مند ہوں لیکن اس صحت مند جسم کو نیند کے لیے روزانہ نیند کی گولی کھانی پڑتی ہے۔ بیس سال گزر گئے یہ گولیاں کھاتے کھاتے چار عمرے اور دو حج بھی کر آیا، کوئی درگاہ نہیں چھوڑی ہر جمعرات کو دو دیگیں غریبوں میں بانٹ آتا ہوں، توبہ واستغفار کرتا ہوں، خدا سے رو رو کر معافی مانگتا ہوں، لیکن جو بے چینی جو کسک میری روح کو تڑپا رہی ہے جھلسا رہی ہے، اُس کو سکون کہاں سے لاؤں، جس کا سکون چھیننا چاہا، وہ خود تو گزشتہ بیس سالوں سے سکون سے سو رہی ہے۔

سلیم زاہد صدیقی

اردو کا ب قاعدہ

ہم آپ سب نے بچپن میں الف سے انار اور ب سے بکری ضرور پڑھا ہوگا، فرق یہ ہو سکتا ہے کہ کسی نے الف سے انار اور بے سے بکری کی جگہ الف سے آم اور بے سے بلی پڑھا ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کسی استاد نے الف سے گھوڑا پڑھا دیا ہو اور یہ بتانے کی کوشش کی ہو کہ الف ہمیشہ پہلے ہی نہیں آخر میں بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ ہم نے بھی بچپن میں یہی اردو قاعدہ پڑھا تھا۔ لیکن جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ آدمی ہمیشہ طالب علم ہی رہتا ہے اور یوں مسلسل قاعدہ پڑھتا رہتا ہے، کبھی قاعدہ پڑھتا ہے کبھی بے قاعدہ۔ کچھ لوگ قاعدہ پڑھتے ہیں اور کچھ قاعدہ رٹتے ہیں جیسا کہ بُش صاحب پڑھ تو ایک حرف نہیں سکے تھے مگر سوتے جاگتے باقاعدگی سے قاعدہ قاعدہ رٹتے رہتے تھے۔ ان کے استاد کیونکہ عرب تھے اور عرب والے جس طرح امریکہ کو الامریکہ کہتے ہیں اسی طرح بش جی بھی قاعدہ کو القاعدہ کہتے تھے۔ خیر ان کو چھوڑیئے ہم اپنے پاکستانی اردو قاعدہ کی بات کر رہے تھے۔۔۔ تو جناب ہم سب نے بچپن میں جو اردو قاعدہ پڑھا تھا۔ اس میں ایک فرد ایک ووٹ کی طرح ایک حرف ایک لفظ ہی یاد کرایا جاتا تھا۔ الف سے انار کے بعد بے سے بکری یا بلی، حالانکہ الف سے امی بھی ہوتا ہے ابا بھی استاد بھی اور افتاد بھی۔۔ مگر ہمارے بچپن میں بچوں پر آج کی طرح ظلم نہیں ہوتا تھا کہ نرسری میں ہی محبِّ وطن اور مسلمان بنانے کے لئے پاکستان اسٹڈیز اور اسلامک اسٹڈیز کے مضامین شامل نصاب کر دیئے جائیں جن کا تلفظ ادا کرنا بچے تو کیا بچے کی ماں کے بھی بس کا روگ نہیں۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے زمانے میں بچے گھر سے ہی مسلمان آتے تھے۔ اور محبِّ وطن ہوا کرتے تھے۔

تو ہم یہ عرض کر رہے تھے کہ ہم نے بچپن میں الف سے ی تک ایک حرف ایک لفظ ہی پڑھا تھا مگر کیونکہ علم کا حصول مہد سے لحد تک جاری رہتا ہے سو جب ہم ب سے بچپن سے گزر کر پ سے پچپن کی عمر میں داخل ہوئے تو ایک نیا اردو قاعدہ ہمارے سامنے تھا۔ جو پڑھا اور پڑھایا تو جا رہا تھا مگر کہیں تحریری شکل میں موجود نہیں تھا۔ عوام الناس کی خیر خواہی اور خدمت پاکستان و عوام کے جذبے سے سرشار ہو کر ہم نے اس قاعدہ کو با قاعدہ قلم بند کرنے کی کوشش کی ہے۔

گر قبول اُفتدز ہے عز و شرف

الف: الف سے بے شمار الفاظ بنتے ہیں مثلاً، اسٹک۔ اسمبلی۔ اکھاڑا۔ آئین۔ اسلام۔ اتحاد۔ انصاف۔ انسان۔ ایمانداری وغیرہ۔

اسٹک۔ اسٹک کا لفظ عام طور پر ہاکی کے لئے استعمال کیا جاتا تھا۔ مگر یہ اس وقت کی بات ہے جب پاکستان کا قومی کھیل ہاکی ہوا کرتا تھا، جب سے ہاکی کی جگہ سیاست کو قومی کھیل بنایا گیا ہے اسٹک کے مفہوم میں بھی تبدیلی آ گئی ویسے اسٹک انگریزی کا لفظ ہے اسٹک اینڈ کیرٹ انگریزی کا محاورہ بھی ہے۔ اردو میں اسٹک اس چھڑی کو بھی کہتے تھے جو ہمارے بچپن میں استاد اپنے شاگردوں کو راہ راست پر رکھنے کے لیے استعمال کرتے تھے۔ اس کو مولا بخش بھی کہا جاتا تھا۔ لیکن اب اساتذہ کے ہاتھ سے یہ اسٹک چھین لی گئی ہے۔ اب یہ اسٹک صرف جرنیلوں کے ہاتھ میں نظر آتی ہے جسے وہ سیاستدانوں کے راہ راست پر رکھنے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔

مگر جرنیلوں کے دوسرے ہاتھ میں کتاب نہیں ہوتی ایل ایف او ہوتا ہے اور جیب میں کیرٹ۔ کیونکہ وہ ڈسپلنڈ لوگ ہیں لہٰذا یہ لوگ ایل ایف او۔ اسٹک اور کیرٹ سب کو آسانی سے ایکوموڈیٹ کر لیتے ہیں۔ الف سے آئین بھی ہوتا ہے۔ مگر یہ اکثر معطل رہتا ہے۔ الف سے اسمبلی بھی ہوتا ہے اور اکھاڑا بھی۔۔ یہ دونوں مترادف اور ہم معنی الفاظ ہیں۔ اسمبلی سیاستدانوں کی صحت کے لیے اسی طرح ضروری ہے جس طرح اکھاڑے پہلوانوں کے لیے ہوا کرتے تھے۔ البتہ عوام کی سرشت تبدیل نہیں ہوئی ہے وہ ماضی کی طرح آج بھی محض تماشائی ہیں۔ پہلوانوں

کے بجائے سیاستدانوں کو کندھے پر اٹھائے ہوئے ہیں۔

الف سے ایک بہت ہی اہم لفظ اسلام بھی ہوتا ہے۔ یہ وہ دین ہے جو اللہ کا پسندیدہ دین ہے، اس دین کی سربلندی اور نفاذ کے لیے پاکستان بنایا گیا۔ مگر افسوس جب سے پاکستان بنا ہے اسلام خطرہ میں آ گیا۔ اسلام کو خطرے سے نکالنے کے لئے اسلام نبی سے لیکر اسلام الدین شیخ تک کو کابینہ میں شامل کیا گیا مگر اسلام آج بھی خطرے میں ہے۔ الف سے اور بھی الفاظ ہوتے ہیں مثلاً اتحاد، انصاف، انسان، ایمانداری۔ وغیرہ وغیرہ مگر اب یہ الفاظ متروک و مرحوم ہو چکے ہیں۔۔۔

ب : ب سے بڑک۔ بڑک کی وبا فلموں کے راستے سیاست میں داخل ہوئی۔ سلطان راہی مرحوم فلموں میں بڑک مارنے کے بادشاہ تھے۔ اور عوام کے محبوب ہیرو تھے۔ ہمارے سیاستدانوں نے عوامی مقبولیت کے چیک کو کیش کرانے اور سلطان راہی کا خلا پر کرنے کے لیے ان کا انداز اختیار کر لیا۔ عوام ان بڑکوں سے محظوظ ہوتے ہیں اور اپنی بھوک۔ بیروزگاری، بیماری، دکھ، تکالیف کو کچھ وقت کے لیے بھول جاتے ہیں۔ فری میں سلطان راہی کے فلم کا مزا لیتے ہیں۔۔۔ ب سے بش۔ بش انگریزی کا لفظ ہے جس کے معنی جھاڑی ہیں۔ مگر یہ لفظ ۱۹۸۰ کے عشرے سے اردو میں داخل ہوا ہے۔ یہ ایک خاندان کا نام ہے جس کو عراق سے قلبی نسبت رہی ہے، جانسن نام کے ایک شخص کو ویت نام کے حوالے سے خوں آشامی فطرت کے باعث جو شہرت ملی تھی اسے بش خاندان نے گہنا دیا۔ بیٹے بش نے باپ کے نام کو مزید بلند کر دیا۔ اردو میں ایسے ہونہار بروا کے لیے محاورہ موجود ہے۔

ب سے بھنگ۔۔ غریب لوگ اس کو پیتے ہوئے پکڑے جاتے تھے لہٰذا اب غریبوں نے بھنگ پینی چھوڑ کر ہیروئن پینی شروع کر دی ہے۔ اب بھنگ صرف رنگ میں ڈالنے کے کام آتی ہے۔ مگر رنگ میں بھنگ ڈالنا اپنی اپنی استعداد پر ممکن ہے، کمزور لوگ اس کوشش میں مار کھا جاتے ہیں۔ لہٰذا احتیاط کی جانی چاہیے۔

پ :   پ سے پگڑی۔ پگڑی سر پر رکھنے کی چیز ہوتی ہے جس کا استعمال عموماً فلموں میں سمدھی کے پاؤں پر ڈالنے کے لئے کیا جاتا ہے، تاکہ برات کو واپس لے جانے سے باز رکھا جاسکے۔ مغرور سمدھی پگڑی کو ٹھوکر مار کر چلے جاتے ہیں۔ اسے اچھالا بھی جاتا ہے مگر وہ پگڑی دوسرے کی ہوتی ہے۔ مگر پگڑی اچھالنا فن ہے بغیر سیکھے کسی دوسرے کی پگڑی اچھالنے کی کوشش میں اپنی پگڑی گر سکتی ہے۔ اسی لئے اب اس کا استعمال کم کم کیا جاتا ہے اور صرف صاحب ہمت لوگ ہی اس کا استعمال کرتے ہیں۔

ت :   ۔۔۔ت سے تنظیم اور ترمیم بھی ہوتا ہے۔ تنظیم کا حال اور استعمال تو وہی ہے جو اتحاد کا ہے یعنی متروک ہو چکا۔ البتہ ترمیم کا استعمال عام ہے۔۔ قدامت پسندوں کو عموماً ترمیم سے چڑ ہوتی ہے اور وہ ہر ترمیم کو غلط کہتے ہیں اور ویسے یہ بات درست بھی ہے کہ جو ترمیم خود نہ کی جائے غلط ہی ہوتی ہے۔ ہمیں چاہئے کہ خود ترمیم کریں دوسروں کو یہ موقع نہ دیں۔ ترمیم ملک کے آئین میں بھی ہوتی ہے تو ایک سے اُنیس (۱۹) تک ہوتی ہی چلی جاتی ہے البتہ اس کے لیے جوڑ توڑ بہت ضروری ہوتا ہے جس میں ہمارے سیاستدان مہارت رکھتے ہیں۔

ت سے توڑنا۔ توڑنا ایک عام سا لفظ ہے۔ اس سے اسمبلی اور حکومت توڑنے کا کام لیتے ہیں۔

ٹ :   ٹیکس۔ ٹوپی

ٹ سے ٹیکس۔ یہ انگریزی کا لفظ ہے جس کو اردو میں بھتہ کہا جاتا ہے۔ حکومتیں کیونکہ بھتہ خوری کے خلاف ہوتی ہیں اور بھتہ لینا جرم ہے لہٰذا وہ عوام سے بھتہ نہیں لیتی ہیں بلکہ ٹیکس لیتی ہیں اور اپنا کام چلاتی ہیں۔۔ ٹ سے ٹوپی۔۔ ہمارے قومی لباس کا حصہ ہے۔ قائد اعظم کی ٹوپی کو جناح کیپ کہا جاتا ہے۔ جناح اور قائد اعظم ایک ہی فرد کو کہا جاتا ہے مگر مسلم لیگ قائد اعظم اور مسلم لیگ جناح میں فرق ہے۔ ایک ٹوپی ترکی ٹوپی کہلاتی ہے مگر یہ ترکی میں اسی طرح ناپید ہے جیسے چین میں ''چائنیز ریسٹورنٹ''۔

ث: ث سے ثبوت۔ یہ عموماً کسی کے پاس نہیں ہوتا مگر اس کے طلب گار سب ہوتے ہیں، اور یہ دعویٰ بھی سب کرتے ہیں کہ ان کے پاس ثبوت ہے جو وہ مناسب وقت آنے پر پیش کریں گے آخر بُرا وقت آجاتا ہے مگر مناسب وقت نہیں آپاتا۔

ج : ج سے جنرل۔ جیل۔ جاگنگ۔ جمہوریت۔۔ جہاز۔۔ جھوٹ۔ وغیرہ

جنرل۔ فوج میں سب سے بڑا عہدہ ہوتا ہے۔ ہر آدمی جنرل نہیں بن پاتا، جنرل بننے کے لیے کمیشن لینا پڑتا ہے۔ عام زندگی میں کمیشن لینے والے کو حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے جرم گردانا جاتا ہے۔ مگر فوج میں کمیشن لینا اعزاز کی بات ہے۔

جنرل کا جوتا بوٹ کہلاتا ہے جو ہمیشہ چمکتا ہوا ہوتا ہے اس کو چمکانے کے لیے ادارے نے بیٹ مین دیا ہوتا ہے۔ حال ہی میں اظہار نفرت کے لیے جوتے کا استعمال سیاسی جلسوں میں بھی ہونے لگا ہے۔

جیل۔۔ جیل گھر ہی ہوتا ہے۔ فرق یہ ہے کہ گھر میں گارڈز کی تنخواہ گھر والے کو دینی پڑتی ہے جب کہ جیل کے گارڈز کی تنخواہ جیل کے ذمہ ہوتی ہے، آدمی وہاں تخریب کاری اور دہشت گردی کے خوف سے آزاد رہتا ہے۔ ماضی کے سیاست دان جیل کو دوسرا گھر کہا کرتے تھے۔ اسی باعث اب ان کے لئے گھر کو ہی جیل بنا دیا جاتا ہے۔ اور تمام آسائشیں وہیں مہیا کر دی جاتی ہیں۔ ان کے لئے گھر اور جیل میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ مگر یہ صرف خواص کے لیے ہوتا ہے عام آدمی کے لیے پورا ملک ہی جیل بن جاتا ہے۔ مگر ان کی حفاظت کے لئے گارڈز نہیں رکھے جاتے۔ ان کے گارڈز حکومتی ارکان کی حفاظت اور ان کو عوام سے دور رکھنے کے کام آتے ہیں۔۔۔

ج سے جمہوریت۔ انتہائی مظلوم و بیکس چیز کا نام ہے۔ یہ پاکستان کو جہیز میں ملی تھی مگر اس کا اسی طرح مذاق اڑایا گیا جیسے مالدار ظالم شوہر غریب بیوی کے جہیز میں ملی چیزوں کا مذاق اڑاتا ہے۔

چ : چ سے چمچہ، چاندی، چونا۔۔۔ چمچہ۔ یہ لفظ کہاں سے آیا اور پہلی بار کس ذہین نے اسے

استعمال کیا۔ اس کی تاریخ اسی طرح نہیں ملتی جس طرح کھٹل کے استعمال کی تاریخ کا پتہ نہیں چلتا۔۔۔ ہر صاحب حیثیت شخص اپنی اوقات کے حساب سے چمچے رکھتا ہے۔۔۔ چمچہ گیری۔ یہ ایک ''عمل'' ہے جو ہر کس و ناکس کے بس کا روگ نہیں۔ جو لوگ اس فن میں ماہر نہ ہوں یہ عمل بغیر کسی ماہر کی نگرانی نہ کریں نقصان کا اندیشہ رہتا ہے۔۔۔ چ سے چاندی۔ چاندی قدرے ایک مہنگی دھات ہے۔ مگر ماہر چمچہ گیروں کی ہمیشہ چاندی ہوتی ہے۔ عوام کو چاہئے کہ چاندی کے لیے چمچہ گیری کے فن میں مہارت حاصل کریں

۔۔۔چ سے چونا۔۔ استعمال لگانے میں ہوتا ہے۔ چونا لگانا ایک فن ہے خواہ پان کو لگایا جائے یا آدمی کو۔ زیادہ لگ جانے پر شدید نقصان کا اندیشہ ہوتا ہے۔ پان پر لگے چونے کی زیادتی کا توڑ ممکن ہے مگر آدمی کو اگر زیادہ چونا لگ جائے تو اس کے اثرات بد جس کو چونا لگا اس پر بھی اور جس نے لگایا اس پر مرتب ہو سکتے ہیں۔۔ چونا لگانے میں احتیاط کا دامن مضبوطی سے تھامے رہنا چاہیئے۔

ح : سے حلوہ۔ حلوہ بہت میٹھا ہوتا ہے اور ''رجعت پسند'' کہلائے جانے والوں میں بہت پسندیدہ سمجھا جاتا ہے۔ عموماً حلوہ کا تعلق رال سے جوڑا جاتا ہے جو حلوہ دیکھ کر ہی ٹپک پڑتی ہے۔

خ : خ سے خر۔ خچر۔ خربوزہ

خر ایک چوپائے کا نام ہے جسے عام زباں میں گدھا کہا جاتا ہے۔ اس کی ہمیشہ بہتات رہی ہے۔ چار پاؤں کی وجہ سے اسے چوپایہ کہا جاتا ہے مگر اس میں بہت سے خر، دو پاؤں والے بھی ہوتے ہیں۔ ان کی کھوپڑی میں مغز نہیں ہوتا۔۔۔ اور جن کے مغز ہوتا ہے وہ ''خر مغز'' ہوتے ہیں۔ خر مغز۔ حرام مغز سے مختلف چیز ہوتا ہے۔ خر ہر جگہ پایا جا سکتا ہے کوئی خاص علاقہ اس کے لئے مختص نہیں ہے۔ چار ٹانگوں والے کی ''دولتی''۔ اور دو ٹانگوں والے کی ''دولت'' خطرناک ہوتی ہے۔ بچ کر رہنا چاہئے۔

خ سے خچر۔۔یوں تو یہ بھی خر کے خاندان سے تعلق رکھتا ہے مگر اس کا حال بھی۔صاحبان ثروت کے غریب رشتہ دار کا سا ہے۔

خ سے خربوزہ۔ماضی میں خربوزے کھیتوں میں پیدا ہوتے تھے اور ایک دوسرے کو دیکھ کر رنگ پکڑتے تھے۔آج کل خربوزے شہروں میں بھی پیدا ہوتے ہیں اور خوب رنگ پکڑتے ہیں اسی باعث کھیتوں میں پیدا ہونے والے خربوزوں نے احتجاجاً ایک دوسرے کو دیکھ کر رنگ پکڑنا چھوڑ دیا ہے۔

د : د سے دال۔دلیا۔دہشت گردی، دانیال عزیز۔۔دال، دلیا اور دہشت گردی غریب عوام کے مسائل ہیں۔جب کہ دانیال عزیز امیر۔سیاستدانوں کا مسئلہ بنے رہے ہیں۔

ڈ : ڈ سے ڈنڈا۔ڈیم۔۔۔ڈنڈا۔اسٹک کے قبیلہ کا فرد ہے۔پولیس ڈنڈے کا استعمال خوب جانتی ہے کہ کس کو۔کب۔کس جگہ اور کس شدت سے مارنا چاہیئے۔

ڈ سے ڈیم۔۔۔ڈیم اور ڈیم فول انگریزی کے دو الگ الگ لفظ ہیں، انگریز ڈیم فول کو گالی سمجھتا ہے جب کہ ڈیم اس کے لئے گالی نہیں ہے مگر ہمارے ملک میں ڈیم کو گالی سمجھا جاتا ہے اور اگر اس کے ساتھ کالا باغ کا لفظ بھی استعمال ہو جائے تو انتہائی فحش گالی بن جاتا ہے۔لہٰذا کالا باغ ڈیم کے لفظ کا استعمال کرنے سے گریز کا جانا صحت اور سر کے لئے مفید ہے۔

ذ : ذ سے ذخیرہ اندوزی۔ذخیرہ اندوزی اہل تجارت کا کام ہے آپ کو نہیں کرنی چاہیئے یہ جرم ہے

ر : ر سے رحم دلی۔رواداری بھی ہوتا ہے رحم بھی۔۔۔رحم۔رحم دلی اور رواداری اب متروک اور مردہ الفاظ ہیں۔

ز: سے زر بھی ہوتا ہے زمین بھی اور زن بھی۔۔۔

زر۔ زرداروں کے پاس ہوتا ہے۔ اور زمین زمین داروں کے پاس جب کہ عام آدمیوں کے پاس صرف زن ہوتی ہے۔ زردار اور زرداری دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ مگر جاہل عوام اس میں فرق ملحوظ نہیں رکھتے۔ اس غلطی میں قصور حاکم کا نہیں بلکہ عوام کا اپنا ہے۔ زر اور زمین کے سامنے زن کے کوئی وقعت نہیں ہوتی۔ زن کاروکاری کے کام بھی آتی ہے۔

س : س سے سوال۔ سینٹ۔ سفر

سفر انگریزی اور اردو دونوں میں استعمال ہوتا ہے۔ جو لوگ احتیاط سے اردو والا سفر نہیں کرتے وہ انگریزی والا سفر کر جاتے ہیں۔ لہٰذا اردو کی قدر کی جانی چاہیئے کیونکہ اردو والا سفر وسیلہ ظفر ہوتا ہے جب کہ انگریزی والا سفر باعث نقصان۔

سینیٹ۔: یہ آئین میں تحریر ایک ادارہ ہے سینٹ کو توڑنے کی آئین اجازت نہیں دیتا مگر بغیر اجازت توڑا جا سکتا ہے۔

ش: سے شراب۔ شریف

شراب۔۔ شراب عربی زبان کا لفظ ہے عرب میں عام استعمال ہوتا ہے۔ مگر ہمارے یہاں اس کا استعمال ممنوع اور گناہ ہے۔ جو لوگ شراب استعمال کرنا چاہیں وہ حکومت سے پرمٹ لے لیں۔ پرمٹ لیکر استعمال کرنا ممنوع نہیں ہے۔

شریف۔۔ شریف کو شریفہ سے کوئی نسبت نہیں ہے شریفہ ایک پھل کا نام ہے ہمیشہ ایک جیسا ذائقہ رکھتا ہے۔ البتہ شریف کے ذائقے میں تبدیلی آتی رہتی ہے۔

ص: ص سے صدر۔ عموماً ان کو ایوان صدر راس نہیں آتا اور ان کو ایوان صدر سے باہر لانے کے لیے فوج کی مدد درکار ہوتی ہے۔

ض: ض سے ضد۔ ضد کسی چیز پر اصرار کرنے کو کہتے ہیں۔ بال ضد مشہور ہے لیکن ضد کے لیے عمر کی کوئی قید نہیں یہ ایک ایسی بیماری ہے جو کسی کو بھی لگ سکتی ہے۔

ظ : ط سے طالبان۔۔اردو میں یہ لفظ طالب کی جمع سمجھی جاتی ہے۔مگر انگریزی میں اسے دہشت گرد مسلمان کے معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے۔

ظ : ظ سے ظرف جس کی اس دور کے انسانوں میں نہایت کمی پائی جاتی ہے البتہ ظرف کے معنی برداشت اوور رواداری کے علاوہ برتن کے بھی ہیں۔اسی لیے کم ظرف لوگوں کو چھوٹا برتن بھی کہا جاتا ہے۔

ع : ع سے عقل، علم۔عمل۔عوام۔

عقل اللہ کا عطیہ ہے۔مگر یہ سب کے پاس نہیں صرف لاٹھی والے کے پاس ہوتی ہے ہم آپ کو سمجھا دیتے ہیں۔۔دیکھیے عقل کا بھینس اور بھینس کا لاٹھی سے تعلق تو آپ جانتے ہیں۔آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ بھینس عقل سے بڑی ہوتی ہے۔اور یہ بھی جانتے ہیں کہ بھینس اسی کی ہوتی ہے جس کی لاٹھی ہو۔

علم۔عقل کی طرح علم بھی اللہ کا عطیہ ہے۔یہ میراثِ پیغمبری کہا جاتا ہے۔حدیث قدسی میں بیان ہوا کہ ''علم حاصل کرو خواہ چین جانا پڑے'' چین ہمارا دوست ملک ہے۔لیکن یہ یاد رہے کہ چین امریکہ کو ایک آنکھ نہیں بھاتا رہی دوسری آنکھ تو امریکہ اس کے ذریعہ پاکستان پر کڑی نظر رکھتا ہے۔

ع سے عوام ۔۔۔جمہوری ممالک میں رعایا کو عوام کہا جاتا ہے اور عوام ہی سمجھا بھی جاتا ہے۔ہمارا ملک بھی جمہوری ملک ہے مگر ہمارے یہاں رعایا کو عوام کہا جاتا ہے اور رعایا سمجھا جاتا ہے۔یہ الیکشن میں ووٹ ڈالنے کے کام آتے ہیں۔اور سیاستدانوں کو کندھے پر اٹھانے کے بھی کام آتے ہیں۔

غ: سے غل غپاڑا۔غبارہ، غلامی، غربت

ع اور غ کا آپس میں گہرا تعلق ہے۔ع کے اوپر ایک نقطہ لگا دیا جائے تو غ بن جاتا ہے۔

ع کے عوام کی غ سے غل غپاڑا، غلامی، غربت سے قریبی نسبت غلامی اور غربت عوام کے لیے لازمی ہے۔ اگر عوام غلامی اور غربت سے آزاد ہو جائیں تو نظام زکوٰۃ و نظام خیرات سے لے کر نظام حکومت تک خطرہ میں پڑ سکتا ہے۔

ف : سے فضلِ ربی۔ فضل ربی کے معنی اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم کے ہیں لیکن ایسے لوگوں کی نشان دہی کے لیے بھی معاشرتی طنز کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے جن کے ہاتھ ناجائز ذرائع آمدن خاص طور پر رشوت سے رنگے ہوتے ہیں۔

ق: سے قربانی۔ قاضی۔ قانون

قربانی دینی اور ملی فریضہ ہے۔ عام آدمی بقرعید کے موقع پر گائے۔ بیل۔ اونٹ کی قربانی کرتے ہیں قربانی اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے کی جاتی ہے۔ مگر کچھ لوگ اسٹیٹس کی خاطر بھی قربانی کرتے ہیں۔ جمہوری حکومتیں عوام سے ان کی قربانی چاہتی ہیں۔

ق سے قاضی۔ قاضی نکاح پڑھانے کے کام آتے تھے۔ محاورہ تھا کہ میاں بیوی راضی تو کیا کرے گا قاضی۔ سیاست میں قاضی کے ساتھ حسین احمد کا اضافہ بھی کرنا پڑتا ہے۔

ک: ک سے کالاباغ۔۔ ماضی میں کالاباغ۔ ایک نواب کے حوالے سے پہچانا جاتا تھا۔ جن کی مونچھیں بہت مشہور تھیں۔ ایوب خان جب عوام کو سبز باغ دکھا دکھا کر تھک گئے تو انہوں نے کالاباغ دکھا دیا تھا۔ کالاباغ آج کل ڈیم کے حوالے سے مشہور ہے۔

گ: سے گو۔ گو۔ گو وہ آوازیں ہیں جو حکومت کے مخالفین اسمبلی میں نکالتے ہیں۔

ل : ل سے لوٹا۔ لانگ مارچ

لوٹا مسجد میں ہو تو قابلِ احترام اور اسمبلی میں قابلِ نفریں سمجھا جاتا ہے۔ لانگ مارچ۔ ماضی میں لانگ مارچ اس سفر کو کہا گیا تھا جو ماؤزے تنگ نے چین میں ننگے بھوکے عوام کو حکومت کے

جبر سے نجات دلانے کے لیے ہزاروں میل پیدل کیا تھا۔ آج بھاٹی گیٹ سے گورنر ہاؤس تک موٹروں پر سوار ہو کر جانے کو کہا جاتا ہے۔

م : م سے مارشل لاء۔ یہ لگائے اور اٹھائے جانے کی چیز ہے۔ ہمارے ملک میں اس کا لگایا جانا عام بات ہے۔ اس کے لگائے جانے پر عموماً عوام اور سیاستدانوں کی اکثریت خوشی کا اظہار کرتے ہیں۔ ہمارے ایک شاعر نے کہا تھا:

مارشل لا میں مگر پہلے ہے ٹکرا مار کا ''اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں''

مارشل لا بہت بھاری ہوتا ہے اس لیے اس کا اٹھایا جانا آسان نہیں ہوتا۔ جلدی اٹھانے سے گردن میں لچک آسکتی ہے۔ اس کو اٹھوانے کے لیے عوامی نمائندوں اور سیاسی رہنماؤں کی خاص مدد درکار ہوتی ہے۔ اس کا ایڈمنسٹریٹر سویلین بھی ہو سکتا ہے۔

ن: نوابزادہ نصراللہ۔ نواز شریف۔

نوابزادہ نصراللہ سیاست کے سٹیج کے ''غیر اکیڈمی'' ایوارڈ یافتہ تھے۔ البتہ نواز شریف اکیڈمی یافتہ ہیں، سائڈ ہیرو سے ہوتے ہوئے ہیرو کا رول ادا کرنے لگے۔ اب ڈائریکشن کے شعبہ سے متعلق ہیں۔

و : و سے۔ واہ واہ۔ واویلا۔ وعدہ۔ وردی

ہ : سے ہائے۔۔ ہائے بڑے متنوع معنی رکھتا ہے۔ ''برگر'' فیملی کے لوگ جب کسی جان پہچان والے کو دیکھتے ہیں اور دور ہی رکھنا چاہتے ہیں تو ''ہائے'' کہکر ہاتھ ہلاتے ہوئے اور دور ہو جاتے ہیں۔ اور جب قریب آکر ملنا چاہتے ہیں تو اسی ''ہائے'' کو ''ہیلو'' میں تبدیل کر دیتے ہیں۔ غریب کی ''ہائے'' کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ''عرش'' ہلا دیتی ہے۔ مگر حکومت کو ہلانے میں ناکام رہتی ہے۔ سیاسی کارکن کی ''ہائے ہائے'' مزدوری ہے۔ ان کو ہائے ہائے کہنے

اور کہلوانے کا معاوضہ ملتا ہے۔

ی: سے ماضی میں یقین محکم ہوا کرتا تھا جو قائداعظم کے فرمودات کے حوالے سے بہت مشہور ہوا۔ یہ ان تین زریں اصولوں میں سے ایک تھا جو قائداعظم نے بتائے تھے۔ مگر جس طرح ان کے فرمودات اتحاد اور تنظیم کو بھلا کر دیگر قائدین کے نعروں کو اپنا لیا گیا اسی طرح یقین محکم بھی اپنی موت آپ مر گیا ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

پروفیسر شارق جاوید ☆

ڈاکٹر عاصی کرنالیؒ ۔۔۔پیکرِ اخلاق و محبت

شریف، عاصی، نجیب انساں، زمین سے عرش پر گئے ہیں ابھی یہاں تھے چراغِ محفل، فلک پہ مثلِ قمر گئے ہیں

شریف احمد عاصی کرنالی، علم و ادب، اخلاقیات، تہذیب اور شاندار روایات کا ایک مکمل دبستاں تھے کہ جس کا ہر شعبہ مکمل، فعال، مستعد اور کارگر تھا ان سے میرا تعلق ایک صاحبزادے کا تو تھا ہی مگر دوسرا علاقہ ایک دانش جُو کا بھی تھا۔ میرا اپنا قیاس یہ ہے کہ میں نے اپنے شعور میں قدم رکھنے کے بعد انہیں ہمیشہ ایک استاد ہی کے روپ میں دیکھا۔ شفقتِ پدری میں ہر جہت، ہر لمحہ استادانہ مشاقی اور محبت آمیز تلطف کا جذبہ غالب نظر آیا۔ ان کا ایک مہربان اور مددگار باپ کا کردار جس طرح بے لاگ اور بے تبصرہ ہے بالکل ایسے ہی ایک کامل، عالم اور استاد ہونا بھی مسلم ہے۔ ان کی شخصیت پر ایک مدرس کی چھاپ اتنی گہری اور نمایاں ہے کہ دیگر خصوصیات پس منظر میں نظر آتی ہیں۔ میں نے انہیں ہمیشہ لکھتے، پڑھتے اور پڑھاتے ہی پایا۔ وہ ہمیشہ جستجوئے خیال، تحصیلِ علم اور فروغِ تعلیم میں مستعد، منہمک اور مصروف رہے، لاتعداد دانش جُو یائے علم ان سے کسبِ فیض کر کے مناصبِ جلیلہ پر فائز ہیں۔ ان کے بقول یہ کار ''کارِ نبوت'' ہے جو ازل سے ابد تک کارفرما ہے اور ہم لوگ گویا وارثانِ نبیؐ ہیں جو اس سلسلے کو آگے بڑھانے میں معاون ہیں

☆ فاضل مصنف کو عاصی صاحب مرحوم کے فرزندِ باسعادت ہونے کا شرف حاصل ہے (ادارہ)

میرے لیے دقّت طلب مرحلہ یہ ہے کہ میں کس حیثیت سے ان کی شخصیت کے مختلف گوشوں پر اظہارِ رائے کروں، بیٹا اور طالبِ علم، بیک وقت ہونے کے ناطے کہیں دونوں جذبات و خیالات کی ہم آہنگی جانبداری کا رنگ نہ نمایاں کر دے اور نظریات مبالغے سے ہم آمیز نہ ہو جائیں۔ مگر میرے لیے سہولت یہ ہے کہ میں نے ہر دو انداز سے ان سے کسبِ محبت اور تحصیلِ علم کی اور انہوں نے بھی باپ اور استاد ہونے کے فرائض نہایت کامل اور احسن انداز میں پورے کیے۔

والدِ گرامی کی اپنی تمام زندگی مسلسل اور بے تکان سفر کی داستان ہے میں اگر انسانی شخصیت کے تمام پہلوؤں کو مختلف خانوں میں منقسم کر کے ان کو پرکھوں تو مختلف شخصیات کامل طور پر چند شعبوں میں ہی پوری اتر پائیں گی اور کئی مقامات پر ان میں کمی، کجی یا خامی کا احساس ہوگا۔ ہم اس دنیا میں تنہا زندگی نہیں گزارتے بلکہ ایک معاشرے میں اپنے مقام پر ایک مکمل اکائی کے طور پر کار فرما ہوتے ہیں۔ گویا بحیثیت انسان کئی شعبوں میں تقسیم ہو کر زندگی گزارتے ہیں۔ ایک اکائی کئی دیگر اکائیوں کا جز بنتی ہے اب یہ ضروری نہیں کہ ایک اکیلا انسان ذاتی حیثیت میں تنہا ثابت، سالم اور مکمل ہو کہ وہ تمام دیگر لوگوں کے لیے بھی ممکنہ حد تک معاون اور مددگار رہو۔ ہمارا مذہب ہمیں ایک راہِ مبین عطاء کرتا ہے اور حقوق اللہ اور حقوق العباد کی ادائی میں معاونت کرتے ہوئے آدمی کو انسان اور انسانیت کے مرتبہ کمال پر فائز کرتا ہے۔ پیغمبرانِ کرام، اوصیا، اولیاء اور علماء زیورِ علوم سے آراستہ ہونے کے بعد دیگر مقلدین کے لیے رہنمائی اور راہبری کا فریضہ سر انجام دیتے چلے آئے اور یہی اصحابِ محترم دینی اور دنیاوی کامیابی اور کامرانی کا سبب بنتے رہے۔ دنیا کا سب سے مکرم و محترم شعبہ علم کا ہے جس کے لیے رسولِ اکرمؐ نے خود کے لیے مدینۃ العلم اور حضرت علیؑ کے لیے بابِ علم کا منصب پسند فرمایا اور اخلاقیات کے بلند ترین مقام پر فائزہ ہونے کی سند اللہ تعالیٰ نے عطاء فرمائی گویا علم و اخلاقیات ہی ایک انسان کے لیے فوقِ بشر ہونے کی ضمانت ہیں اصحاب نے بھی خود کو تعلیم و تعلم کے لیے مخصوص کیا وہ گویا سلسلہ کارِ نبوت کے ارکان ٹھہرے۔

والدِ گرامی اپنے شعری مجموعے ''چمن'' میں فرماتے ہیں کہ

عمر کا قافلہ جب تک ہے رواں چلنا ہے ہاں تو اے گردشِ تقدیر کہاں چلنا ہے

تیغ کی دھار پہ چل آگ پہ چل، خار پہ چل اے شکستہ بدن و سوختہ جاں چلنا ہے

پاؤں کیا، دل سے ٹپک جائیں لہو کی بوندیں بر سرِ کار گہہِ شیشہ گراں چلنا ہے

اب یہ لمحوں کی مسافت ہو کہ صدیوں کا سفر پا برہنہ سرِ صحرائے تپاں چلنا ہے

دعوتِ ہم سفری عام ہے اربابِ وفا آج کی صبح سرِ مقتلِ جاں چلنا ہے

بیٹھ کر سایۂ دیوار میں کس کی گزری لاکھ چلنا ہو طبیعت پہ گراں چلنا ہے

یہ مذکورہ بلا غزل اور ان کی زندگی باہم مربوط دکھائی دیتی ہیں میں نے ان کی زندگی کا بغور مطالعہ و مشاہدہ کیا۔ مجھے حیرت اس بات پر ہے کہ میں نے ان کو کبھی بھی اس روائتی انداز سے تعلیم حاصل کرتے نہیں پایا جیسے دیگر طلباء کسبِ علم کرتے ہیں۔ حالانکہ انہوں نے ایم اے اردو، ایم اے فارسی، اور پی ایچ ڈی کے تمام مراحل طے کیے۔ میں نے ان کو ہمیشہ درس دیتے ہوئے ہی پایا اپنے بچپن کے ناپختہ ذہن کی جہاں تک بھی رسائی ہے میں نے ان کو ہمیشہ استاد کے طور پر ہی دیکھا اپنے مضمون، اپنی بے بہا معلومات اور اپنے اظہارِ علم میں کامل مہارت کے ساتھ ترویجِ علم کے لیے کوشاں۔ نہ جانے انہوں نے اُردو زبان کے علاوہ فارسی میں کب دستگاہ حاصل کی۔ البتہ ملتان میں دبستان کے نام سے فارسی کا پہلا مدرسہ قائم کیا۔ مجھے یاد ہے کہ اس زمانے میں بے شمار طلبہ فارسی کی تحصیل کے لیے اس میں داخل ہوئے۔ والد صاحب کے ساتھ ان کے ایک نہایت مقرب دوست جناب راغب مراد آبادی بھی شامل تھے۔ وہ استاد تھے میں نے ان سے اپنے بچپن میں قرآن پاک کے چند پارے بھی پڑھے، وہ بھی نہایت عمدہ اخلاق اور علم کے حامل تھے

ہم لوگوں کے تند سفینے اپنے رخ پر بہتے ہیں موجیں اٹھتی رہتی ہیں اور طوفاں آتے رہتے ہیں

ہم سے فضائیں تھراتی ہیں ہم سے بہاریں خائف ہیں ہم پھولوں کے دیس میں حامی شعلہ بن کر رہتے ہیں

میں نے والد صاحب کو کبھی بھی کسی کھیل میں شریک نہ دیکھا۔ میں خود اپنے سکول سے فارغ ہونے کے بعد اپنے بڑے بھائی عظمت کمال کے ساتھ باقی سارا دن گھر کے سامنے میدان میں کھیلتا رہتا تھا مگر والد نہ کوئی کھیل میدان میں کھیلتے اور نہ ہی گھر میں کوئی کیرم بورڈ وغیرہ۔ وہ صبح سے شام اور شام سے صبح بس کتابوں ہی سے کھیلتے۔ یہی ان کا میدانِ عمل تھا اور یہی میدانِ زندگی۔

زمیں سے عرشِ بریں تک مجاہدوں کی زقند بس ایک فطرتِ خود بیں، بس ایک ذوقِ بلند (عاصی)

اکثر دیکھا اور سنا گیا ہے کہ شاعر حضرات لاابالی طبائع کے حامل ہوتے ہیں ان کی زندگی بظاہر تفکراتِ دنیا سے گریز پا ہو کر دوست احباب میں بیٹھ کر غپ لگانا، سگریٹ کے کش لگانا، بلند بانگ قہقہوں میں تمسخر اڑانا اور کچھ آگے بڑھے تو شراب و شباب اور پراگندہ اندازِ زندگی کا حظ اٹھانا۔ مگر والد صاحب ان علائق سے کوسوں دور تھے میں نے تو انہیں کبھی پان تک نہ کھاتے دیکھا۔ اور نہ ہی دوست احباب کی محفل میں سرگرداں دیکھا۔ وہ کوئی مردم بیزار آدمی نہ تھے۔ ان کا دائرہ عمل بہت ہی وسیع تھا اور اسی حساب سے احباب سے تعلق بھی بہت زیادہ تھا۔ میرا خیال ہے کہ ملتان میں یا تو ہر دوسرا شخص ان کا شاگرد ہے یا ان کے حلقہ دوستی میں داخل، شاید وہ کھیل کود کو وقت کا ضیاع خیال کرتے ہوں یا دوستوں کی محفل کو بربادی وقت پر محمول کرتے ہوں مگر وہ دوسروں کو ایسے اعمال و افعال سے روکتے بھی نہ تھے۔ جس کا جو دل چاہے کرے کیونکہ ہر شخص اپنی زندگی کے گزران میں آزاد ہے اور اپنے ہر عمل کا جوابدہ۔

مذاق کو ضابطے میں لاؤ نگاہ کو بااصول کرلو
اگر گلستاں کی خیر چاہو تو چند کانٹے قبول کرلو

تمہارے دامن میں صبحِ خنداں کے سینکڑوں آفتاب ہونگے
مری طرف سے بھی شامِ حسرت کے کچھ اندھیرے قبول کرلو

چمن کا نظارہ کر رہے ہو نگاہ مجروح ہو رہی ہے
بہار کی عادتیں بدل دو تمام کانٹوں کو پھول کرلو

اپنے بارے میں والد گرامی لکھتے ہیں '' میں ۱۹۲۷ء میں کرنال میں پیدا ہوا۔ وہاں شعروادب کی کوئی خاص فضا نہ تھی البتہ وہاں ایک ادبی انجمن کی بنیاد پڑی۔ ''بزمِ ادب کرنال'' اس کا نام تھا نواب سرفراز علی خان کے مکان پر اس کے ماہانہ مشاعرے ہوا کرتے تھے۔ یہ نواب صاحب نوابزادہ لیاقت خان کے اعزاء میں تھے۔ نواب سجاد علی خان (برادر حقیقی نواب لیاقت علی خان) اس بزم کے سرپرست تھے۔ میں سیکریٹری بنادیا گیا تھا اور حکیم گلچیں کرنالی صدر تھے۔ اکثر اس بزم کے طرحی مشاعرے ہوا کرتے تھے۔ ان میں مائل کرنالی، زاہد حسین سالک، نرائن داس طالب، ذکی پانی پتی اور بعض نواب زادے شریک ہوتے تھے۔ مقامی شعراء اور ان کی مقامی محفلیں ''بس گزارا'' ہی ہوتی تھیں اور اپنا دیرپا اثر نہ چھوڑتی تھیں ان کے سبب کوئی خاص ادبی فضا قائم نہیں ہوتی تھی۔ میری ادبی زندگی کو اپنے شہر میں کوئی پس منظر نہ مل سکا۔ رہی میرے خاندان کی بات تو میرے آباؤ اجداد میں کسی ادبی شخصیت کا سراغ نہیں ملتا۔ نہ ہی میرے خاندان مین معاصر افراد میں کوئی صاحب شاعر یا ادیب ہیں۔ گویا میری ادبی زندگی کا خاندانی پس منظر بھی نہیں بنتا۔ اس طرح میں اپنے خاندان کا پہلا شاعر اور اپنے شہر کرنال کا ایک معمولی سا غیر اہم سا ادبی فرد ہوں۔ جب پاکستان بنا تو میں ۲۰ سال کا تھا میں نے ۱۵ سولہ سال کی عمر میں شعر گوئی شروع کردی تھی۔ پاکستان آنے کے بعد ملتان منزل بنا۔ میرا پہلا شعری مجموعہ ''رگِ جاں'' ۱۹۵۶ء میں لاہور سے طبع ہوا۔ میں علامہ اقبال کی شاعری کے اسلوب سے متاثر تھا اس لیے میرے ابتدائی اشعار میں اقبال ہی کے شعری اسلوب کی نقالی کے نقوش ملتے ہیں۔ تاہم ''جشن خزاں'' (دوسرا مجموعہ) تک میں اس اسلوب کی گرفت سے آزاد ہو چکا تھا۔ شاعری میں میرا کوئی باقاعدہ استاد نہیں۔ دو تین غزلیں حضرت احسان دانش سے درست کرائیں۔ ایک قلمی مسودہ برائے اصلاح مولانا ظاہر القادری کی خدمت میں بھیجا۔ میں نے ان دونوں حضرات کی بس دو چار اصلاحیں قبول کیں۔ میرے اس احساس نے مجھے ''بے استادا'' رکھا۔ اسی وجہ سے میری شاعری پر کسی کے رنگِ سخن کی چھاپ نہیں''۔

چبھتے ہیں جو اربابِ تماشا کی نظر میں سرمایۂ گلشن ہیں وہ کانٹے مرے نزدیک
جو شعر کہ تفسیرِ حقیقت نہیں ہوتا عاصی میں سمجھتا ہوں کہ ہے فکر کی تضحیک

میرے والدِ گرامی ۱۹۴۷ء۔۱۹۶۰ء تک گورنمنٹ مدارس کی ہائی کلاسز میں بحیثیت معلم اردو و فارسی رہے۔ ۱۹۶۰ سے ۱۹۸۹ء تک مختلف کالجوں میں بحیثیت لیکچرار/پروفیسر/پرنسپل رہے۔ ۴ سال بہاء الدین زکریا یونیورسٹی ملتان کے شعبہ اردو کی کلاسز کو بحیثیت وزیٹنگ پروفیسر پڑھایا۔ خانۂ فرہنگِ ایران ملتان میں پانچ سال ایم اے فارسی کلاسز میں تدریس و تعلیم کا فرض ادا کیا۔ بعد میں لا کالج ملتان سے منسلک ہوئے اور زندگی کے آخری دن تک وابستۂ تعلیم رہے۔ جب میں اپنے والد صاحب کی زندگی کے برنامے پر نظر دوڑاتا ہوں تو متاثر کن معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ مثال کے طور پر ان کی شعری تصانیف کی تفصیل یہ ہے۔

(۱) رگِ جاں (نظم و غزل) (۲) جشنِ خزاں (نظم و غزل) ۱۹۶۸ (۳) مدحت (نعت) ۱۹۷۶ (۴) نعت کے گلاب (نعت) ۱۹۸۶ (صدارتی ایوارڈ یافتہ) (۵) چمن (نظم و غزل) ۱۹۸۶ (۶) جاوداں (سلام و منقبت) ۱۹۸۸ (۷) حرفِ شیریں (نعت) ۱۹۹۳ (۸) میں محبت ہوں (نظم و غزل) ۱۹۹۳ (۹) تمام و نا تمام (کلیاتِ شعری) ۱۹۹۴ (۱۰) خاصانِ خدا کربلا میں (مراثی) ۲۰۰۰

نثری تصانیف

(۱۱) چہرہ چہرہ ایک کہانی (افسانے) ۱۹۸۱ (۱۲) لبِ خنداں (طنز و مزاح) ۱۹۸۸ (۱۳) اپنی منزل کی طرف (سفرنامہ حج) ۱۹۹۰ چراغِ نظر (انشائیے، خاکے، طنز و مزاح، تنقیدی و تحقیقی مقالات) ۱۹۹۲ (۱۵) تحقیقی مقالہ برائے پی ایچ ڈی موضوع ''اردو حمد و نعت پر فارسی شعری روایت کا اثر'' ۱۹۹۸ (۱۶) مرحلۂ شوق (نظم و غزل) ۲۰۰۵ (۱۷) آوازِ دل (نعتیں) ۲۰۰۶ (۱۸) خزینۂ نوازش (تاثرات) ۲۰۰۹

ان کے بارے میں یونیورسٹی اور قومی و ملکی سطح پر تحقیقی مقالے لکھے گئے ہیں ان میں

۱۔ پاکستانی ادب کے معمار تحقیق و تدوین پروفیسر شوذب کاظمی

۲۔ عاصی کرنالی شخصیت و فن مقالہ از طاہرہ سلیم

۳۔ پاکستان میں نعت گوئی کی روایت۔بحوالہ عاصی کرنالی" مقالہ غضنفر حسین ندیم شاہ

۴۔ عاصی کرنالی کی حیات اور غزل کا مطالعہ" مقالہ از سائرہ بتول زیدی

ان کی اعزازی ادبی/علمی/تعلیمی/ثقافتی خدمات کے حوالے سے یہ جائزہ دیکھیے

(۱)۔ رائٹرز گلڈ ملتان ریجن کے ایک بار سیکریٹری/رکن (۲)۔ ریڈیو پاکستان ملتان کی مشاورتی کمیٹی کے رکن (۳) مجلس زبان دفتری ملتان کے رکن۔ (۴) نصاب ساز کمیٹی پنجاب کے رکن (۵) نیشنل سنٹر اور آرٹ کونسل ملتان کے رکن (۶) ڈرامہ سکروٹنی کمیٹی (آرٹ کونسل ملتان) کے رکن (۷) ثانوی و اعلیٰ ثانوی تعلیمی بورڈ ملتان کے رکن۔ (۸) رائٹرز ویلفیئر بورڈ پنجاب ملتان کے رکن (۹) نائب صدر علی گڑھ ایسوی ایشن ملتان (۱۰) ملتان کی بہت سی ادبی انجمنوں اور تنظیموں کے سرپرست/صدر/مشیر ادبی/رکن عاملہ، وغیرہ۔ مثلاً بزم نور، بزم حسان، اردو اکادمی، حریم فن/بزم ثقافت/سرائیکی سنگت، مقصودہ بیگم ادبی ٹرسٹ، بزم ضیاء صدیقی، بزمِ حزین صدیقی۔

دیگر مشاغل و مصروفیات

(۱) ملکی اور قومی سطح کے مشاعروں، مذاکروں اور ادبی تقریبات میں شرکت (۲) ٹی وی اور ریڈیو کے ملکی ادبی جلسوں میں کئی بار شرکت (۳) قومی سیرت کانفرنس اسلام آباد کے سالانہ جلسوں میں کئی بار شرکت (۴) ادبیات اکادمی پاکستان اسلام آباد سالانہ تقاریب میں شرکت۔ بیرون ملک مشاعروں میں شرکت کے لیے مکہ معظمہ، مدینہ منورہ، جدہ، ریاض، دبئی، ابوظہبی، العین، شارجہ اور ایران گئے۔

والد صاحب کو بے شمار اعزازات اور ایوارڈز وغیرہ سے نوازا گیا۔ جن میں سے کچھ درج

فلک کے سامنے پردے ہزار پھیلاؤ — مگر زمیں کی طرف روشنی تو آئیگی

بس اس امید پہ برسوں سے چل رہا ہوں میں — کبھی تو آئے گی منزل کبھی تو آئے گی

علم وادب سے منسلک رہنے اور مستقل مصروف رہنے کے باوجود وہ کسی بھی طور پر اپنی گھریلو ذمہ داریوں سے بے خبر نہ تھے۔ جب میری والدہ گرامی سے ان کی شادی ہوئی تو شائد وہ صرف ۶ جماعت پاس تھیں والد صاحب نے ان میں مزید علم کی تحریک پیدا کی اور پھر وہ دونوں ہی تحصیلِ علم میں مصروف ہو گئے اس دوران میں اور میرے بھائی بہن بھی صفحۂ زندگی پر قدم رکھتے گئے۔ میری والدہ نے بھی بالآخر ایم اے اردو، ایم اے فارسی، اور بی ایڈ کر لیا۔ اور گرلز کالج ملتان میں بحیثیت لیکچرار ان کا تقرر ہو گیا۔ بعد میں وہ اسی کالج کی پرنسپل بھی بنیں۔ ہم بھائی بہنیں بھی تعلیمی مراحل سے گزرتے رہے۔ والد صاحب اپنے باقی رشتہ داروں خاص طور پر اپنی بہنوں اور ایک اکلوتے بڑے بھائی کا بے حد خیال رکھتے اور ان کی ہر طرح سے اخلاقی و مالی مدد بھی کرتے رہے۔ تمام اقرباء و اعزاء اپنے بیگانے ان کے پاس اپنے غم اور مسائل لے کر آتے اور وہ ہر صورت ان کی معاونت کرتے۔

مجھے یاد ہے کہ جب والد صاحب نے پہلی بار ریلے سائیکل خریدی تو تمام خاندان والے انہیں مبارک باد دینے آئے اور انہوں نے ابی جان اور سائیکل کو ہار پہنائے بعد میں انہوں نے ایک پرانی ہنڈا ۵۰ خریدی جو بے حد شور مچاتی، غالباً ۱۹۶۵ میں انہوں نے بالکل نیا ویسپا سکوٹر خریدا اور یہی وہ واحد سواری ہے جو ۲۰۰۶ء تک ان کا مرکب بنی رہی۔ وہ خود کہتے کہ ''دو چیزوں نے میرا ہر طرح ساتھ دیا۔'' ''ایک میری بیوی اور دوسرا میرا اسکوٹر'' وہ کئی بار سکوٹر سے گرے بھی مگر جب میں ان سے کہتا کہ اب آپ اس پر زیادہ نہ پھرا کریں تو مجھے ڈانٹ کر کہتے'' تم مجھے پابند نہ کرو'' اور میں ہاتھ جوڑ کر کہتا'' جناب میری کیا مجال جائیے پرواز کیجئے'' اور وہ اڑے اڑے پھرتے۔ صحتِ جسمانی کے عروج و زوال کے باوجود انہوں نے کسی کا بھی سہارا لینا پسند نہ کیا۔ ایک بار سکوٹر سے گرنے کے بعد کچھ دن صاحبِ فراش رہے ہم نے سہارے کے لیے ایک چھڑی

انہیں لادی مگر چند دن بعد جونہی وہ ذرا ٹھیک ہوئے تو فوراً اسے اٹھا کر ایک جانب رکھ دیا۔ لاسال کالج میں کسی دن بھی وہ چھڑی اپنے ہمراہ لے کر نہ گئے۔ کہتے تھے کہ میں نہیں چاہتا کہ لوگ کہیں کہ میں بوڑھا ہو گیا ہوں۔ وہ ہمیشہ یہ دعا کرتے کہ "اے اللہ مجھے کبھی کسی کا محتاج نہ کرنا" اور عملی طور پر ہم نے ان کو کبھی کسی کا محتاج نہ دیکھا۔ وہ صرف تقسیم کنندہ تھے۔ انہوں نے کچھ بھی جمع نہ کیا۔ ان کے پاس علم و ادب کی لازوال دولت تھی جس کو وہ وجہ افتخار سمجھتے۔ انہوں نے اپنے تمام بچوں کو اپنے سامنے اعلیٰ تعلیم دلائی۔ ہم سب ان کے ممنونِ احسان ہیں۔ انہوں نے علم کی شمع کو بہر طور جلائے رکھا۔ محبت، مروت، خلوص، دیانت، توکل، انسانیت، اور اخلاقیات کو خود بھی اپنی پوری زندگی میں جاری و ساری رکھا بلکہ ہر شخص کو ہر مرحلے میں اسی کی تلقین کرتے رہے۔ ان کا معروف شعر یہ تھا کہ

میں محبت ہوں مجھے آتا ہے نفرت کا علاج — تم ہر اک شخص کے سینے میں مرا دل رکھ دو

میں نہیں سمجھتا کہ وہ اس عالمِ عارضی سے کنارا کر گئے ہیں بلکہ میرا یقین واثق ہے کہ انہوں نے علم و اخلاق کی جو مشعل روشن کی، تا ابد اس کی روشنی اذہان و قلوب کو منور و تاباں رکھے گی۔

نفرتیں دل نے کہیں خوئے محبت نہ گئی — جس کی بنیاد ادب پر تھی وہ عادت نہ گئی
زندگی بھر ہمیں یاروں نے بھی آزار دیئے — عمر بھر ہم سے بھی تہذیب مروت نہ گئی

۱۹۲۷ء سے ۲۰۱۱ء تک کا سفر ہر طرح کے نشیب و فراز کو طے کرتے ہوئے جناب شریف احمد عاصی کرنالی ۸۴ سال جس شاندار عمدہ اور احسن طریقے سے گزار کر اس عالم فانی سے عالمِ بقاء کو سدھارے وہ نہ صرف قابلِ قدر، قابلِ رشک اور قابلِ تقلید ہے۔ بلکہ تمام صاحبانِ بصارت و بصیرت کے لیے اعلیٰ ترین نمونہ ہے۔

شریف عاصی نجیب انساں، زمیں سے عرش پر گئے ہیں — ابھی یہاں تھے چراغِ محفل، فلک پہ مثلِ قمر گئے ہیں
عجب سی ایک بات ہو گئی ہے خلافِ معمول واقعہ ہے — میں صبح سے منتظر ہوں ان کا نجانے وہ کدھر گئے ہیں
ہمیشہ رہتا تھا ساتھ ان کے ہمیشہ چلتا تھا ساتھ ان کے — مگر اچانک بدل کے رستہ نجانے کس راہ پر گئے ہیں

کسی کے ابو کسی کے نانا کسی کے دادا کسی کے بھائی   بس ایک دھاگے کے ٹوٹنے پر یہ سارے موتی بکھر گئے ہیں
وہ اک دبستاں تھے آگہی کا وہ ایسے رہبر تھے کارواں کے   کہ جن کی قربت سے کتنے پیکر سنور گئے ہیں نکھر گئے ہیں
رسومِ عہدِ حیات کیا ہیں، رموزِ بعدِ ممات کیا ہیں   وہ اپنے قول و عمل سے سارے نکات آسان کر گئے ہیں

گمان تک بھی نہیں تھا جس کا یقین کیسے کروں میں شارق
جنابِ عاصی گزر گئے ہیں! جنابِ عاصی گزر گئے ہیں!

شارق جاوید

"نذرِ عاصی کرنانی"
١٤٣٢ ہجری

"نعت گوئی میں ماہرِ فن، خوش بیان"
٢٠١١ عیسوی

"رخصت ہوا جانِ محفل آج جہاں چھوڑ کر"
٢٠١١ عیسوی

"علم اُن کا تھا پاکیزہ، بیان و فکر مرصّع"
١٤٣٢ ہجری

"انتقالِ عاصی سے ادب گاہِ جہانِ فانی میں پڑا اک خلا"
٢٠١١ عیسوی

"ضمیرِ قلب سے عالی مزاج، علم و ادب کا تھا حریص"
١٤٣٢ ہجری

"یکتائے فکرِ عاصی کا ارتحال، چشم نم ہے"
٢٠١١ عیسوی

"رحلتِ نیک طینت عاصی ہیں آنکھیں نم، دل سوگوار"
٢٠١١ عیسوی

"نذرانۂ اشک ہیں، مرے درد کے یکسر ترجمان"
٢٨٦٤ ÷ ٢ = ١٤٣٢ (در صنعتِ تنصیف)

"ارم کی طرف وہ پُر درد عاصی کوچ کر گیا"
١٤٣٢ ہجری

"یہ کون آج باعزت رخصت ہوا دنیا سے"
٢٠١١ عیسوی

"بیانِ واقعہ: دو فروری دو ہزار گیارہ، بروز بدھ"
١٤٣٢ ہجری

پروفیسر طارق پرویز ☆

صحرا میں تاج محل

تاج محل کو دیکھنے والے دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جنہوں نے اس عظیم الشان عمارت کو دور سے دیکھا۔ دوسرے وہ جن کو قریب سے دیکھنے بلکہ چھونے کا موقعہ بھی ملا یہی دوسری قسم کے لوگ تاج محل پر تبصرے کے حوالے سے اتھارٹی سمجھے جائیں گے۔ عاصی کرنالی اردو ادب کے آگرہ میں چمکتا دمکتا تاج محل ہیں اور میں وہ شخص ہوں جسے اس عالی شان عمارت کو انتہائی قریب سے دیکھنے کا موقعہ ملا۔

میرا ان کا ساتھ تقریباً ڈھائی دہائیوں سے بھی کچھ زیادہ عرصے کا ہے۔ اس تمام مدت میں مجھے ان کی شخصیت کے مختلف پہلو مختلف حوالوں سے جاننے کا اتفاق ہوا۔ میں ان کا ماتحت بھی رہا۔ ان کا دوست بھی ان کا قاری بھی اور ان کا بیٹا ☆ بھی۔

رشتوں کی زنجیریں بالعموم انسانوں کو ایک دوسرے کے نزدیک کرنے کی بجائے دور کرنے کا باعث بنتی ہیں اور بالخصوص دامادی کا رشتہ تو ساری عمر کے اعتبار اور بے اعتباری کی بھٹی میں سلگتا رہتا ہے۔ شکر خدا کا کہ میں نے اور عاصی صاحب نے اس رشتے کو محبتوں کے اس سفر میں کبھی رکاوٹ نہیں بننے دیا۔ میرے خیال میں اردگرد کی دنیا سے عاصی صاحب کا سب سے مضبوط رشتہ دوستی کا ہے۔ میرے لیے بھی وہ ہمیشہ ایک انتہائی مخلص دوست رہے۔

میں نے ان سے بہت کچھ سیکھا۔ برداشت، مروت، لحاظ ، خاطر داری، احساس اور پتہ

☆ مرحوم عاصی کرنالی کے داماد

نہیں کیا کیا۔ میں نے آج تک نہ تو کبھی انہیں غصے میں دیکھا نہ ہی اشتعال میں۔ چھوٹے ہوں یا بڑے، ان کے رویے میں سب کے لیے ایک مٹھاس اور حلاوت نمایاں نظر آتی ہے۔ دوسروں کے معاملات میں غیر ضروری دخل اندازی ان کے مزاج میں کبھی شامل نہیں رہی۔ البتہ اگر کبھی کوئی ان سے راہ نمائی کی خواہش کرے تو وہ نہایت مخلص راہ نما ثابت ہوتے۔

مجھے عاصی صاحب سے ایک شکایت رہی کہ انہوں نے کبھی ملتان چھوڑ کر لاہور یا اسلام آباد نقل مکانی کی کوشش نہیں کی اگر وہ ایسا کرتے تو نہایت قدآور ادیب، شاعر شمار ہوتے ☆۔ ہمارا معاشرہ بڑا بے رحم ہے یہاں بڑا وہی ہے جو بڑے گھر میں رہتا ہے۔ تاہم یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ کبھی کبھی کسی بڑے آدمی کا وجود کچے گھروں کو بھی مرکز نگاہ بنا دیتا ہے۔ میرے خیال مین ملتان بھی ایسے ہی کچے گھروں میں سے ایک ہے۔

☆ راقم الحروف کو جناب عاصی مرحوم و مغفور سے نسبتِ اخلاص و مودّت کا شرف گزشتہ نصف صدی سے بھی متجاوز مدت سے حاصل تھا۔ وہ دل و دماغ کے اوصاف سے متصف ایک اعلیٰ ادیب، محقق، مُعلّم اور شاعر تھے۔ وہ اپنے انکسار، اخلاص اور شرافت و شائستگی کے حوالے سے صائب کے درج ذیل شعر کی زندۂ جاوید تفسیر تھے۔ انھوں نے اگر ملتان نہیں چھوڑا تو یہ بھی اُن کی عظمت کی دلیل تھی کہ وہ ملتان ہی نہیں بلکہ دنیائے تعلیم و تعلّم اور جریدۂ شعر و ادب پر اپنا نقشِ دوام ثبت کر گئے ہیں۔ (منصور عاقل)

فروتنی ست دلیلِ رسیدگانِ کمال　　　که چوں سوار بمنزل رسد پیادہ شود

ثمر بانو ہاشمی

میرا ہم سفر۔۔۔(پروفیسر ڈاکٹر عاصی کرنالیؒ)

اگر میں یہ کہوں کہ وہ بے مثال ہے تو مبالغہ ہوگا۔ اگر میں یہ کہوں کہ ہاں اچھا ہے تو یہ کم تر ہوگا۔

حقیقت یہ ہے کہ بعض انسانوں کو اس قادر مطلق نے اَن گنت صلاحیتوں سے نوازا ہے اگر انسان کو اپنی صلاحیتوں کا ادراک ہو جائے تو وہ اس سے اپنی زندگی کو بام عروج تک لے جاتا ہے ورنہ انسانوں کی عام صف میں رہ کر اپنی زندگی کے دن پورے کر لیتا ہے۔

عاصی کرنالی کی ایک نمایاں خوبی اس کی شاعری نہیں، بلکہ کام کرنے کی لگن ہے۔ شادی کے پہلے سال بھی میں نے اسے کلائی پر بندھی گھڑی کی سوئیوں کے ساتھ متحرک دیکھا۔ تلاش معاش میں سرگرداں بھرے پُرے خاندان کی کفالت، والدین، بہنوں اور بھائی بھتیجوں سے مخلص۔ یہ وہ دور تھا کہ جتنا بھی کما لو، کم ہی پڑتا تھا۔ پھر اولاد کی تعلیم وتربیت۔ اس سے بھی پہلے اپنی ادھوری تعلیم (جو صرف دس جماعتوں پر محیط تھی) کو تکمیل کے مرحلے پر لے جانا یہ سب آسان نہیں تھا۔ مشکل تھا بہت مشکل مگر کسی روز بھی میں نے یہ نہیں دیکھا کہ کام کی زیادتی کا گلہ زبان پر آیا ہو۔

ہاں وہ دور کٹھن تھا جب ایم۔ اے کا امتحان دینے لاہور جانا پڑا تھا لیکن خدا کی ذات حامی و ناصر تھی، سو وہ مشکل دن بھی کٹ گئے۔ بس پھر تو زندگی خود بخود سہل ہوتی چلی گئی لیکن کام کرنے کی رفتار میں کمی نہیں آئی۔ اسکول کی زندگی سے کالج، وہاں کی ادبی مصروفیات، ریڈیو کے پروگرام، شاعری، مشاعرے جاری رہے۔ گھر والوں کو بھی شکایت کا موقع نہ دیا۔

ہاں ایک بار ایسا ہوا کہ ریٹائرمنٹ کے بعد فرصت کے لمحات کاٹے نہیں کٹتے تھے تو ایک سکول میں نگران کی حیثیت سے جانے لگے بھلا ہو ڈاکٹر شمیم حیدر ترمذی کا کہ انہوں نے ڈاکٹریٹ

کرنے کا مشورہ دیا۔ یہ مشورہ اچھا لیکن ریسرچ کا کام ملتان میں رہ کر ممکن نہیں تھا۔

بہر حال اس ارادے کو پختہ کرنے کا کام ثمر بانو نے کیا۔ لاہور بھی گئے وہاں کی لائبریریوں سے استفادہ کیا۔ کراچی گئے دہاں تحقیق جاری رہی اور آ کر ایک روز ۵ سال کی تگ و دو کے بعد مقالہ مکمل ہوا۔ بہاء الدین زکریا یونیورسٹی سے سند بھی لے لی۔

پچاس برس کی اس طویل کہانی میں میرا کردار صرف اتنا تھا کہ ''تعریف نہیں تنقید'' کا اصول اپنائے رکھا۔ خود بھی سروس کی اور مالی مشکلات پر قالو پانے میں مدد کی اور بچوں کی نگرانی کرتی رہی۔ صرف چند باتیں کامیابی کی ضمانت بنیں۔

کام، کام اور صرف کام تحمل، برداشت اور خلوص نیت کے ساتھ۔

بیاد عاصی کرنالی مرحوم

بینش بتول (بیٹی)

میرے ابو کیسے ہیں

آج میں کچھ عجیب سے امتحان میں پڑ گئی ہوں جب مجھے یہ کہا گیا کہ میں اپنے پیارے ابو کے بارے میں کچھ لکھوں جن سے میں بہت پیار کرتی ہوں۔ پہلے میں سمجھتی تھی کہ ابی جان کے بارے میں میں ڈھیر ساری باتیں لکھ سکتی ہوں اور یہ تو بہت آسان کام ہے۔ لیکن اب جب لکھنے بیٹھی ہوں تو محسوس ہو رہا ہے کہ میں تو ان کے بارے میں کچھ بھی نہیں لکھ سکتی۔ درحقیقت میرے پاس وہ الفاظ ہی نہیں جو ان کی شاندار شخصیت کا احاطہ کر سکیں۔

بہر حال جب ان کے بارے میں سوچتی ہوں تو لگتا ہے کہ شفقت، محبت، عاجزی اور انکسار عاصی کرنالی ہی کا دوسرا نام ہے۔ کاش میں ان جیسی ہو سکتی۔

پروفیسر غلام جیلانی اصغر

ڈاکٹر وزیر آغا۔۔۔ذاتی تعلق کی ایک جہت ☆

دوستی تخلیق کاری کی طرح انسان کی حیاتیاتی مجبوری ہے۔ لہٰذا جب انسان اپنے اندر کی تنہائی سے تنگ آجاتا ہے تو وہ کسی ایسے فرد کی تلاش میں نکلتا ہے جس سے تمام سطحوں پر رابطہ قائم کیا جاسکے۔ یہ سطحیں فکری بھی ہوتی ہیں اور جذباتی بھی۔ فکری سطح پر صرف وہی لوگ ملتے ہیں جو ٹی ہاؤس (Tea House) کی سرحد پر آکر رک گئے ہوں۔ وہ ایک دوسرے سے تبادلۂ خیالات کرتے ہیں، بالکل اسی طرح جس طرح پرانے زمانے میں لوگ اشیا کا تبادلہ کرتے تھے۔ اس باہمی لین دین کی فضا میں جذبے کی بڑت یا تو بالکل مفقود ہوتی ہے یا اتنی باریک اور Soluble کہ چائے کے پہلے گھونٹ کے ساتھ ہی تحلیل ہو جاتی ہے اور پیچھے صرف دوستی کا مجرّد تصور رہ جاتا ہے۔ میرے نزدیک دوستی ایسا ہی تخلیقی عمل ہے جیسے کھانا کھانا۔۔۔ بلکہ میں دوستی میں کھانا کھانے اور کھلانے کو اس لیے بھی ضروری سمجھتا ہوں کیوں کہ اس طرح افراد جن کے مابین بظاہر کوئی رشتہ نہیں ہوتا، معدے کے توسط سے ایک ناقابلِ شکست حصہ میں داخل ہو جاتے ہیں۔ اور اگر کسی نازک موقعہ پر تعلقات کی کشیدگی ناگزیر بھی ہو جائے تو معدہ ان کے درمیان حائل ہو کر صلح صفائی کرا دیتا ہے۔ سنا ہے کہ نادر شاہ نے جب دلّی پر حملہ کیا اور محض تفریحِ طبع کے لیے قتلِ عام کا حکم

☆ پروفیسر غلام جیلانی اصغر (مرحوم) کی اس نادر و یادگار، غیر مطبوعہ تحریر کی فراہمی کے لیے ہم محترم ڈاکٹر انور سدید کے سپاس گزار ہیں جنھوں نے پروفیسر جیلانی کی صاحبزادی محترمہ زینت جیلانی سے اس کی بازیافت پر اظہارِ تشکر کرتے ہوئے سہ ماہی 'الاقرباء' کو عنایت فرمایا۔ قارئین کرام ڈاکٹر وزیر آغا (مرحوم) کی زندگی میں مرتب کی گئی اس تاریخی تحریر کا مطالعہ فرمائیں اور فاضل مصنف کے ''جملہ ہائے معترضہ'' کی داد دیں (ادارہ)

دے دیا تو محمد شاہ رنگیلا نے ایک شاہی ضیافت کا اہتمام کیا۔ اس موقعہ پر نادر شاہ کو محمد شاہ رنگیلا نے گلقند پیش کی نادر شاہ کو یہ ڈش بہت پسند آئی ''ایں حلوہ خوب است'' کہہ کر اس نے محمد شاہ سے اپنی دستار بدل لی کیوں کہ اس سے بہتر بھائی چارہ کا اور کیا اظہار ہو سکتا تھا؟ حسنِ اتفاق سے محمد شاہ رنگیلا کی دستار میں مشہور ہیرا ''کوہ نور'' بھی تھا۔ اس کے بعد قتل عام رُک گیا۔ اور نادر شاہ 'تخت طاؤس' کوہ نور اور شاہی خزانہ لے کر ایران واپس چلا گیا۔ چنانچہ اب تک مہذب معاشروں میں دوستی کا یہ معیار قائم ہے۔ غالباً دوستی کا ابھی یہ تقاضا قائم ہے کہ ''من تو شدم تو من شدی'' کے پیش نظر دوست کی چیزوں میں جو خطِ تقسیم ہوتا ہے اسے ختم کر دیا جائے۔

معاف کیجئے یہ جملۂ معترضہ طویل ہو گیا ہے۔ آپ چاہیں تو اسے حذف بھی کر سکتے ہیں۔ وزیر آغا اور میرے درمیان دوستی کا سنگِ بنیاد رکھا گیا جب اس نے مجھے بٹیر کھلائے اور میں نے حق دوستی کا نمک حلال کرنے کے لیے بٹیر اس خلوص سے کھائے کہ وزیر آغا دیر تک یہ سوچتا رہا کہ بٹیر کہاں ختم ہوتا ہے اور دوستی کہاں سے شروع ہوتی ہے۔ دراصل آج تک ہمیں دوستی کے ان دو غیر معلوم سروں کا علم نہیں ہوا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ہماری دوستی ایک دائرے کی طرح چلی جاتی ہے

'' نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم ''

وزیر آغا کے ہاں دوسرے دوست بھی پل دو پل کے لیے رکتے ہیں۔ وہ چائے پر چہچہاتے ہیں۔ بٹیر اور وزیر آغا کی اناٹومی پر غور کرتے ہیں۔ شعر میں جدیدیت کے جراثیم تلاش کرتے ہیں اور کسی آوارہ شعر پر اس خلوص سے داد دیتے ہیں کہ ان کی حالت غیر ہو جاتی ہے۔ لیکن چند دنوں کے بعد جب یہ مسافر چلے جاتے ہیں تو دیارِ غیر سے یہ اطلاع آتی ہے کہ وزیر آغا بور ہوا ہے۔ دراصل بٹیر کھانا اور بٹیر کی روحانی سطح پر مستقل طور پر زندہ رہنا دو مختلف عمل ہیں۔ بٹیر موسمی دنوں کی طرح محض موسمی پرندہ نہیں۔ وہ بیک وقت جبلّت اور محبت کے رشتوں میں بٹا ہوا ہے۔ وہ تو عمر بھر دو دھرتیوں کے درمیان مُعلق رہتا ہے۔ وہ ایک ایسی غیر ارضی مخلوق ہے جس نے محض دوستی کی غیر محکم روایت کے پیشِ نظر اپنے آپ کو دو حصّوں میں تقسیم کر رکھا ہے۔ وہ بے چارہ ہزاروں میل

کا سفر طے کر کے ایک دھرتی آشرم میں پہنچتا ہے کہ اسے دوسری طرف سے بلاوا آجاتا ہے اور وہ اس آشرم کو چھوڑ کر پورے انہماک اور لگن سے دوسری جانب روانہ ہو جاتا ہے۔ کون ہے ایسا (میرا مطلب ادیبوں سے ہے) جو دوستی کی خاطر اپنے آرام کو یوں تیاگ دے؟ چنانچہ بیٹر (غالباً) میرے اور وزیر آغا کے درمیان دوستی کی ایک واضح علامت بن گیا ہے۔ ہم ایک دوسرے کو کھانے کی میز پر اس طرح ملتے ہیں جیسے ہم صدیوں اس میز کے گرد بیٹھے نفسیات، مابعد الطبیعیات' حیاتیات اور اخلاقیات پر گفتگو کرتے رہیں گے۔ لیکن جب ہمیں متضاد سمتوں سے بلاوا آجاتا ہے تو ہم اس طرح ایک دوسرے سے جدا ہوتے ہیں جیسے ہم اجنبی ہوں اور ہمارے درمیان کوئی چیز مشترک نہ ہو بیٹر بھی جب ہجرت کرتا ہے تو اس کا جذباتی ردِ عمل بھی کچھ اسی طرح کا ہوتا ہے۔

معاف کیجئے۔ یہ ایک اور جملہ معترضہ تھا۔ یہ غالباً ۱۹۴۸ کی بات ہے۔ دسمبر کے قُرب و جوار کا کوئی مہینہ تھا، کیوں کہ میرے دن کا بیشتر حصہ کوٹ پہننے اور اتارنے میں گزر جاتا تھا۔ میں حیاتیاتی مجبوری کے تحت کسی ایسے فرد کی تلاش میں تھا جو مجھے میرے اندر کی تنہائی سے نکال کر کھلی فضا میں لے آئے۔ اس زمانے میں سرگودھا اتنا بڑا شہر نہیں تھا۔ اس لیے ادیب بھی گنے چنے تھے۔ شہر کے بازار میں انور گوئندی۔ اس سے آگے اخگر سرحدی اور پھر اس سے آگے حضرت جوہر نظامی واقع تھے۔ شام کو کچھ دوست انور گوئندی کی دکان پر اکٹھے ہوتے، فالودہ کھاتے، شربت انناس کی تعریف کرتے اور پھر غزل کے شعروں کی طرح تتر بتر ہو جاتے۔ کیوں کہ یہ تمام لوگ دوستی کی ردیف میں بندھے ہوئے تھے۔ اس لیے دوسری شام پھر اسی محور پر اکٹھے ہو جاتے۔ میں بھی ان یارانِ شعر کے حلقے میں داخل ہو گیا۔ لیکن میری مجبوری تو یہ بھی تھی کہ میں مارکس' اور مارگریٹ میڈ، فاکنر اور فریزز' ٹائن بی اور سپنگلر پر گفتگو کرنا چاہتا تھا۔ بلکہ اس لیے کہ ان کے ناموں میں ایک ایسی موسیقی تھی جو مجھے بھلی لگتی تھی اور میرے بیشتر دوست ان ناموں سے واجبی طور پر واقف تھے۔ اور اگر واقف تھے بھی تو میری طرح محض موسیقی کی حد تک پھر ایک دن وزیر آغا سے ملاقات ہو گئی۔ مجھے وزیر آغا کی شکل اچھی لگی اور اس کی یہ ادا اور بھی بھلی لگی کہ وہ حیادار بہو بیٹیوں کی طرح منہ اور

سر ڈھانپ کر رکھتا۔ اب جب ہماری دوستی جلوت سے نکل کر خلوت کے نایاب لمحوں میں داخل ہو گئی ہے تو مجھے وزیر آغا کا ننگا سر بھی دیکھنے کی سعادت حاصل ہوتی ہے، ورنہ اس زمانے میں تو ننگا سر دیکھنے کی خواہش میرا Obsession بن گئی تھی۔ میں نے کچھ دنوں سے سن رکھا تھا کہ وزیر آغا رات کو بھی فیلٹ (Felt) پہن کر سوتا ہے۔ بعد میں جب مجھے اس حیاداری کے نفسیاتی پہلوؤں پر سوچنے کا موقعہ ملا تو میں محض حسنِ اتفاق سے اس نتیجے پر پہنچا کہ وزیر آغا انتہائی شریف آدمی ہے۔ وہ اس شریفانہ ماحول کا پروردہ ہے۔ جہاں ننگے سر پھرنا آوارگی کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ اور یوں بھی جب انسان کا اندر کسی مستحکم کلچر کی روایت سے وابستہ ہو تو وہ ''زفرق تابقدم'' اس معاشرہ کا مظہر ہوتا ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ وزیر آغا کسی نجی یا غیر نجی محفل میں ننگے سر نہیں جاتا

پھر جوں جوں فکر کی لمبی ریاضت کے طفیل اس کے بال کم سے کم تر ہوتے گئے تو اسے سر کے ننگے پن کا احساس اور بھی شدّت سے ہونے لگا۔ غالباً احساس یا باطنی شرافت کے پیشِ نظر اس نے اپنا گرو یا Mentor بھی ایسا ہی منتخب کیا جس کے سر پر بال کم اور ہیٹ (Hat) زیادہ تھی۔ میرا مطلب مولانا صلاح الدین احمد سے ہے۔ وزیر آغا اور مولانا صلاح الدین احمد میں جہاں اور بہت سی چیزیں مشترک تھیں وہاں ہیٹ اور فیلٹ (Hat and Felt) اور چہروں کی طمانیت اور داخلی شرافت کا اشتراک بھی دیدنی تھا۔ وہ دونوں جب اکٹھے بیٹھے ہوتے تو مجھے احساس ہوتا کہ دونوں خاموش زبان میں محوِ گفتگو ہیں اور ایک غیر محسوس سی روشنی دونوں کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ مبادا آپ یہ سمجھیں کہ میں اس روشنی کا ذکر کر رہا ہوں جسے نور کا ہالہ کہتے ہیں۔ ایسا ہالہ تو میں نے صرف حضرت یسوع مسیح اور بابا گورو نانک کی تصویروں میں دیکھا ہے۔ پہلی بار جب میں نے رافیل یا اس مکتب کے کسی مصور کی حضرت یسوع مسیح کی تصویر دیکھی تو میں نے ایک فوٹو گرافر سے مطالبہ کیا کہ وہ میرے چاروں طرف بھی ایسا ہی نور کا ہالہ بنا دے۔ فوٹو گرافر نے مسکراتے ہوئے کہا ''بابو جی ! یہ روشنی تو اندر سے نکلتی ہے'' لیکن میرے اندر تو محض پانی، کچھ ہڈیاں اور پروٹین ہے میں نے سوچا کہ مولانا صلاح الدین اور وزیر آغا نے نہ جانے یہ کیسے انتظام

کرلیا تھا کہ جب وہ خاموشی کی زبان میں گفتگو کرتے تو ایک روشن سے دائرے میں محصور ہو جاتے۔ غالباً جب آدمی کے اندر کا غیر ضروری پانی خشک ہو جاتا ہے تو اس کی داخلی Water logging ختم ہو جاتی ہے۔ اور اس کی جگہ روشنی اور نور لے لیتے ہیں۔ میتھو آرنلڈ اسے Enlightenment کہتا ہے اور یہ ہر شریف اور اچھا لکھنے والے کا امتیازی نشان ہے۔

میری کالج کی لائبریری کے ایک نیم تاریک کونے میں ایک کتاب یونہی اداس پڑی رہتی تھی، بالکل ایسے ہی جیسے کوئی بیوہ ہو۔ اس کا نام ''شاخِ زریں'' تھا۔ میں سمجھا شاید کسی غیر معروف شاعر کا دیوان ہے۔ نام بھلا تھا اسے اٹھا لیا۔ اس کے اندر عجیب عجیب نام تھے، عجیب عجیب روایات۔ مجھے یوں لگا جیسے میرے عقائد ڈولنے لگے ہوں۔ میں آبشار نیاگرا پر رسی پر چل رہا تھا اور میرا توازن معرضِ خطر میں تھا۔ پھر اسی شام میں نے انتھروپالوجی (Anthropology) پر وزیر آغا سے باتیں کیں۔ وزیر آغا کی باتیں سن کر مجھے یوں احساس ہوا جیسے وزیر آغا صرف مطالعہ ہی نہیں کرتا بلکہ اس سے نتائج بھی اخذ کرتا ہے۔ بہت برسوں کے بعد جب اس کی کتاب ''اُردو شاعری کا مزاج'' منظر عام پر آئی تو مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ وزیر آغا کا مطالعہ اس لحاظ سے انتہائی مثبت اور نتیجہ خیز ہے کہ وہ اس مطالعے کی بناء پر ایک ایسی عمارت استوار کرتا ہے جس کا مواد تو پرانا ہوتا ہے لیکن فنِ تعمیر بالکل نیا۔ فن کی معجز نمائی یہی ہے کہ وہ پرانے مواد کے باطن سے نئے شاہکار کی تخلیق کرے۔ بعض لوگ بڑے خلوص سے کتابیں پڑھتے ہیں لیکن ان کے نظامِ ہضم کی خرابی مطالعہ کی قدرت پر غالب آجاتی ہے۔ حال ہی میں ایک ایسے محقق نے جس نے تاریخ اور اساطیر کو پہلی بار پڑھا ہے اور اپنے مطالعے کے دوران ایسی عینک کا استعمال روا رکھا ہے جس پر اس کے اندر کی ساری گرد جمی رہتی ہے ''اردو شاعری کا مزاج'' سے ایسے رخنے نکالے ہیں جو غالباً وہاں موجود نہیں تھے۔ میرے ایک ریاضی دان دوست کا استدلال بھی اسی نوعیت کا ہوتا تھا۔ وہ مجھے بتاتا کہ ریاضی کے تمام کلیے ایک Hypothsis یعنی مفروضے پر قائم ہیں۔ مثلاً ایک کے ساتھ اگر آپ ایک ملا دیں تو دو بن جاتے ہیں لیکن ایک کا وجود ہی مفروضی ہے۔ میں جب اس کی رائے

سے متفق ہو جاتا تو وہ میرے دوستوں کو غائبانہ طور پر بتاتا کہ جیلانی کا ریاضی کا مطالعہ انتہائی سطحی ہے۔ ابتدا میں تو مجھے ایسے موقعوں پر دکھ ہوتا۔ پھر میں نے مدافعت کے لیے عرفی کا ایک شعر یاد کر لیا۔ ''عرفی تو میندیش زغوغائے رقیباں''

میں دوسرا مصرع ''آوازِ سگاں کم نہ کند رزقِ گدارا'' احتیاط سے پڑھتا ہوں کیوں کہ اس سے پرانی دوستیاں مجروح، اور نئی دوستیاں مکروہ ہو جاتی ہیں میں نے غیر منصفانہ تنقید پر اس ذاتی ردِّعمل کا اس لیے ذکر کیا ہے تا کہ آپ سے یہ عرض کر سکوں کہ تحقیق و تدقیق کے دائرے میں کوئی نظریہ حرفِ آخر کی حیثیت نہیں رکھتا۔ وہ تو صرف ایک خام مواد ہے۔ جس سے دائمی صداقتوں پر سوچنے اور سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ وزیر آغا بھی تو یہی کچھ کرتا ہے۔ وہ آپ کے سامنے صدیوں کی سوچ کو ایک خوابِ یغما کی طرح بچھا دیتا ہے تا کہ آپ اپنی خواہش اور طبعی ضرورت کے مطابق اس سے تر نوالے چن لیں اور خشک نوالے ان کے لیے چھوڑ دیں کہ جن کے حوصلے ہیں زیاد !

''اردو شاعری کا مزاج'' کا تو یونہی ذکر آ گیا۔ ہمارے تعلقات کا ابتدائی دور باہمی رفاقت کا دور تھا۔ ہم پہروں ادبی اور غیر ادبی موضوعات پر گفتگو کرتے۔ یہ اسی زمانے کی بات ہے جب وزیر آغا کی پہلی کتاب 'مسرت کی تلاش'' منظر عام پر آئی۔ میں اس موضوع پر اس سے پہلے اندرے مورالے، لین یوٹانگ اور برٹرنڈ رسل کی تصانیف پڑھ چکا تھا۔ اس لیے مسرت کی تلاش سے زیادہ میں ایسے لوگوں کی جستجو میں تھا جو خوش رہنے اور خوش کی باقاعدہ صلاحیت رکھتے ہوں۔ بعض افراد دوسروں کی بیویوں سے ملتے ہیں تو مسکراتے ہوئے۔ احباب سے ملتے ہیں تو منمناتے ہوئے۔ ایسے لوگوں کا اندازِ فکر اور طرزِ احساس تو بالکل صحیح ہے۔ خرابی صرف اتنی ہے کہ جو سلوک وہ دوسروں کی بیویوں سے کرتے ہیں دراصل یہ سلوک انہیں دوستوں سے کرنا چاہیے تھا۔ وزیر آغا میں میں نے یہ خوبی دیکھی کہ وہ بلاوجہ خوش نظر آتا ہے۔ میرا عقیدہ ہے کہ جب آدمی بلاوجہ خوش نظر آئے تو فوراً اس سے دوستی کر لو۔ ایسے آدمی اپنے غم اپنے تک محدود رکھتے ہیں اور خوشیاں دوسروں و منتقل کر دیتے ہیں۔ چارلس لیمب بھی تو یہی کچھ کرتا رہا۔ اردو ادب میں عظیم بیگ چغتائی ایسا ہی

فنکار تھا لیکن اس پر "خانم" غالب آ گئی۔

معاف کیجئے یہ ایک اور جملہ معترضہ ہو گیا۔ میں وزیر آغا پر کوئی تنقیدی مضمون نہیں لکھنا چاہتا اور نہ ہی میں ادب کو میدان جنگ سمجھتا ہوں جہاں دشمن سے محاذ آرائی کی جائے اور دوست کا دفاع کیا جائے۔ محاذ آرائی اور دفاع اس لیے بے سود ہے کیوں کہ جو جنگ اخباروں کے کالموں اور پیالیوں کے شور میں لڑی جاتی ہے وہ انتہائی مختصر اور عارضی ہوتی ہے۔ اور سارے کا سارا مال غنیمت دو چار گالیوں، ایک دو پُر لطف جملوں اور چند آوارہ فقروں پر مشتمل ہوتا ہے۔ حقیقی فنکار اپنے اندر کی روشنی سے فن کے اصلی ماخذ تلاش کرتا ہے۔ اس لیے وہ زندہ رہتا ہے۔ اور فقرہ باز یا مسخرا کچھ عرصے کے بعد اخبار اور زندگی کے کالموں سے غائب ہو جاتا ہے۔ کچھ لوگ فقروں کی چبھن سے گھبرا کر جھنجھلاہٹ کا مظاہرہ کرنے لگتے ہیں۔ کچھ لوگ خود رحمی میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ لیکن جس زمانہ میں ادبی محاذ پر فوجوں کی حرکت میں اضافہ ہو جاتا ہے تو وزیر آغا ایسا Unconscious ہو جاتا ہے جیسے یہ جنگ کہیں دور جنوبی امریکہ میں لڑی جا رہی ہو۔ اور اس کا وزیر آغا سے دور کا تعلق بھی نہ ہو۔ جنگ میں غیر جانبداری اور بے تکلفی کا رویہ اس وقت پیدا ہوتا ہے جب آدمی باہر کی شورش پسندی سے کنارہ کش ہو کر اپنے اندر کی دنیا میں مگن ہو جاتا ہے۔ مگن ہونے سے غالباً آپ یہ سمجھیں کہ میں جنگ میں مجہول مقاومت یعنی Passive Resistence کا تاثر دے رہا ہوں۔ بات یہ نہیں۔ وزیر آغا۔۔۔ قزلباش؟ وہ جنگ سے گریز نہیں کرتا۔ بلکہ صرف یہ کرتا ہے کہ وہ خارجی محاذ کے مقابلے میں ایک داخلی محاذ کھول دیتا ہے۔ یعنی وہ شعر کہنے لگتا ہے۔ وزیر آغا اس لیے خوش نصیب ہے کہ اس نے اپنے دفاع یا Catharsis کیلیے کئی محاذ کھول رکھے ہیں وہ شعر کہتا ہے۔ انشائیے لکھتا ہے۔ زراعت کرتا ہے۔ زندہ رہنے والی تنقید لکھتا ہے اور پھر دنیا بھر کے ادب کا بھرپور مطالعہ کرتا ہے اور جب ان سارے مشغلوں سے تنگ آ جاتا ہے تو ایسے دوستوں پر طنز کرتا ہے جو اتنی ہی شدت سے اس پر طنز کر سکیں۔ مثلاً میرا اور وزیر آغا کا تعلق اسی سطح پر ہے۔ عام روز مرہ زندگی میں جب موسم خوشگوار ہو اور

ایسے دوست بھی فراہم ہوں جنہیں آدمی وہی حیثیت دے سکے جو سکھی گھروں میں شریک حیات کو ہے۔ یعنی دونوں طرف پردہ کی پابندی نہ ہو تو پھر یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ دوستی کو مذاق کی کٹھالی سے گزارا جائے۔ اس طرح اس میں پختگی بھی آ جاتی ہے اور آپ کا تشنج بھی رفع ہو جاتا ہے۔ مذاق دراصل کھرے اور کھوٹے کو جانچنے کا یک نہایت حساس آلہ ہے۔ چنانچہ جب دوستی ہم مذاقی کے مقامِ عروج پر پہنچ جاتی ہے تو پھر اس کی استقامت اور صلابت کو جانچنے کا سب سے عمدہ طریقہ یہ ہے کہ دوست ناشتے اور لنچ کے بعد ایک دوسرے کو نہایت شریفانہ گالیاں دیں۔ (مستحق حضرات ابوالاثر حفیظ جالندھری سے اس امر میں رجوع کریں)۔ اگر غلط تعلیم اور اس سے بھی غلط تربیت کی وجہ سے گالیوں کا لینا دینا ممکن نہ ہو تو پھر اس کا شریفانہ بدل طنز ہے۔ لیکن اس طنز میں جوار بھاٹے کی کیفیت ہونی چاہیے۔ تاکہ دونوں جانب لہر آتی جاتی رہے۔ ورنہ طنز منجمد ہو کر پند و نصیحت کی صورت اختیار کر جاتی ہے۔ وزیر آغا ان لوگون سے بڑی شرافت اور رکھ رکھاؤ سے ملتا ہے جن کی صورتیں شریفانہ ہوں۔ ایسے لوگ عام طور پر انتہائی زہر آلود ہوتے ہیں۔ اس لیے ان سے صرف Peak Fareak بسکٹ کی سطح ہی پر ملا جا سکتا ہے۔ لیکن جونہی وزیر آغا کسی چہرے میں پر خلوص رفاقت یا ذرا سی شوخی اور ظرافت کا کوئی نشان دیکھتا ہے تو وہ اسے مذاق یا بے ضرر طنز کے نشتر سے ٹٹولتا ہے۔ اگر دوسری طرف سے ردِ عمل حسب خواہش ہو تو پھر تعلق کے بے نام رشتے میں ایک نئی بُعد پیدا ہو جاتی ہے۔ چنانچہ وزیر آغا کی دوستیاں انہیں لوگوں سے پختہ ہوتی ہیں جو مذاق کے باہمی رشتہ میں منسلک ہیں ایسا آدمی محمد جلیل بھی ہو سکتا ہے۔ اور جمیل یوسف بھی، انور سدید اور سجاد نقوی بھی۔ اظہر جاوید بھی اور ساقی فاروقی بھی، غلام جیلانی بھی اور رشید قیصرانی بھی۔ وزیر آغا کی طنز کی یہ خوبی ہے کہ وہ بے ضرر ہوتی ہے۔ اس کے پیچھے بھڑ کا ڈنک نہیں ہوتا بلکہ محبت کی چاشنی ہوتی ہے۔ رفاقت کا خلوص ہوتا ہے۔ پیار کا وہ دھیما پن ہوتا ہے جس میں سیلاب کا خروش تو نہیں ہوتا لیکن دریا کی ساری گہرائی ہوتی ہے۔ کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ ان کے جذبے کا خروش بے پناہ ہوتا ہے۔ پہلی ملاقات میں ایسی گرمی کا احساس ہوتا ہے کہ اچھے بھلے

ٹھنڈے موسم میں کوٹ اتارنے کو جی چاہتا ہے۔ لیکن وزیر آغا سے پہلی ملاقات عام طور پر ٹمپریچر کے لحاظ سے نارمل ہوتی ہے لیکن جو آدمی پہلی ملاقات کے موسمی اثرات سے جائز ہو جائے وہ دوستی کے ایک ایسے حلقے میں داخل ہو جاتا ہے جہاں محبت اور خلوص کی بے پناہ گرمی ہے۔ وزیر آغا کی دوستی کے کئی در ہیں۔ وہ ہر آدمی پر اپنا ساتواں در وا نہیں کرتا۔ (اور ایسا کرنا بھی نہیں چاہیے) میں وزیر آغا کے ایسے کئی قدیم دوستوں اور جدید مخالفین سے واقف ہوں جو سفر کے آغاز میں اپنے گھر والوں کو یہ بتا کر چلے تھے کہ وہ کسی گرم ملک کی سیاحت کو جا رہے ہیں۔ چنانچہ وہ موسم کی بے پناہ گرمی چلچلاتے ہوئے خلوص اور کھولتی ہوئی جذباتیت کے لیے تیار ہو کر گھر سے نکلے تھے۔ لیکن جب وہ ۵۸ سول لائنیز (وزیر آغا کا آشیانہ) کے حصار میں داخل ہوئے تو وہاں موسم انتہائی خوشگوار تھا۔ بالکل ایسے ہی جیسے اکتوبر کے مہینے میں پہاڑوں پر ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ گرم ملک کو جانیوالے گھر سے تو باریک ململ کا کرتہ اور دوپلی ٹوپی پہن کر نکلے تھے، یہاں انہیں غیر متوقع موسم کا سامنا کرنا پڑا۔ اس لیے جب وہ گھر لوٹے تو ان کے چہروں پر برافروختگی کے نشان تھے۔ میں نے ایک ایسا مسافر بھی دیکھا تھا جو مہینہ بھر سرگودھا میں وزیر آغا کے ہاں رہا۔ ان دنوں وہ اتنا جدید نہ تھا جتنا اب ہے۔ پھر ایک دن جب وہ سرگودھا کی معتدل آب و ہوا سے نکل کر کراچی پہنچا تو اطلاع آئی کہ وہ شمالی خطے کی آب و ہوا کا شاکی ہے۔ پتہ نہیں یہ آب و ہوا کا قصور ہے یا احباب کے اعصاب کا۔

معاف کیجئے! یہ ایک اور جملہ معترضہ ہو گیا۔ میں نے عرض کی تھی کہ وزیر آغا نے اپنے کتھارسس (Catharsis) کے لیے کئی محاذ کھول رکھے ہیں۔ میرے نزدیک اپنے اندر کے جہانِ پُر اسرار کو گرفت میں لینے اور اس کی کایا کلپ کرنے کا سب سے عمدہ ذریعہ شاعری ہے۔ چنانچہ ہر آدمی (میری مراد حساس فرد سے ہے) جو زندگی کی آویزش کی شدت سے آشنا ہوتا ہے وہ کسی نہ کسی مرحلہ پر شاعری ضرور کرتا ہے۔ سقراط جب ایتھنز کے زندان خانے میں موت کا انتظار کر رہا تھا تو اس نے AESOP کی کہانیوں کو نظمانا شروع کر دیا۔ وزیر آغا بھی ایک طویل آویزش سے گزرا ہے۔ ایسی میں آویزش سے شمس آغا (وزیر آغا کا بھانجا جوان کا ہم عمر تھا)

بھی گزرا تھا لیکن وہ شاعر نہیں تھا۔ اس لیے وہ حصارِ ذات سے باہر نہ آسکا اور اس کی غلام گردشوں میں ہمیشہ کے لیے کھو گیا۔ شاعر میں یہ خوبی ہوتی ہے کہ وہ لحظہ لحظہ ٹوٹتا بھی رہتا ہے۔ اور اپنی تعمیرِ نو بھی کرتا رہتا ہے۔ چنانچہ اس کے ہاں شکست و ریخت اور تشکیلِ نو کا عمل بیک وقت دونوں سطحوں پر جاری رہتا ہے۔ چھوٹا فنکار شکست و ریخت کے ملبے سے برآمد نہیں ہوتا۔ بڑا فنکار ققنس کی طرح اپنی ہی راکھ سے ایک نئے زندہ متحرک وجود کی تخلیق کرتا ہے میں وزیر آغا کو ایسا ہی فنکار سمجھتا ہوں۔

ڈاکٹر انور سدید

ڈاکٹر وزیر آغا سے پہلی ملاقات

اب یاد کرتا ہوں تو ڈاکٹر وزیر غا سے پہلی ملاقات جولائی ۱۹۶۱ کی گرم دوپہر کو سرگودہا میں ہوئی تھی۔ اس پہلی ملاقات میں میرے رہنما سجاد نقوی تھے۔ میں اپنے ملازمتی مرکز بیدیاں (ضلع لاہور) سے چار دن کی چھٹی پر سرگودہا ایک شادی کی تقریب میں آیا تھا۔ اور اپنے معمول کے مطابق ''کامران'' کے مدیر انور گوئندی سے ملنے کے لیے ان کے دفتر میں گیا تھا۔ گوئندی صاحب نے دفتر میں موجود ایک اپنے دبلے پتلے نستعلیق سے شخص کی طرف اشارہ کرکے کہا:

''آپ سجاد نقوی صاحب سے ملیئے۔۔۔۔ یہ ''کامران'' کی ترتیب و تدوین میں میری معاونت کرتے ہیں اور خود بھی افسانہ نگار ہیں''

تعارف کرانے کے بعد انہوں نے نقوی صاحب سے پوچھا ''آج وزیر آغا صاحب نے شہر آنا تھا۔ ان کی آمد کی کوئی خبر ملی''۔ نقوی صاحب اس وقت رسالہ ''کامران'' کے لیے کتابوں پر تبصرے لکھ رہے تھے۔ سامنے شمس آغا کے افسانوں کی کتاب ''اندھیرے کے جگنو'' پڑی تھی۔ میں نقوی صاحب سے مصافحہ کر کے خالی کرسی پر بیٹھا ہی تھا کہ انور گوئندی نے روئے سوال میری طرف کر دیا ''آپ وزیر آغا سے کبھی ملے ہیں؟''

میں ان دنوں وارسک ڈیم پشاور سے تبدیل ہو کر لاہور کے قریب بی۔آر۔بی نہر پر بطور سب انجینئر متعین تھا اور ایس۔ڈی۔او کے عہدے پر ترقی پانے والا تھا۔ اس نہر کی پہلی آب روانی ہونے والی تھی۔ برکی سے لے کر گنڈا سنگھ والا تک اس نہر کی مرمت کا کام مجھے تفویض کیا گیا تھا۔ اس لیے سرگودہا جانے کا اتفاق کم کم ہوتا تھا۔ لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ میں وزیر آغا کے نام

اور ان کے کام سے آشنا نہیں تھا۔ سماجی لحاظ سے وہ ہمارے شہر کی ایک ممتاز ترین شخصیت آغا وسعت علی خان کے فرزند تھے۔ سرگودہا کے ریلوے اسٹیشن کے پاس ان کی ایک وسیع دعریض حویلی تھی۔ جس کے بڑے دروازے سے ہاتھی بھی اندر جا سکتا تھا۔ بڑے آغا صاحب اپنے گاؤں چک ۵۶ جنوبی (جو وزیر کوٹ موسوم ہوتا تھا) سے شہر آتے تو لوگ ان کے کر وفر اور جلال و جمال سے بہت متاثر ہوتے۔ جمال ان کی خوبصورت زرق برق رئیسی بگھی سے ظاہر ہوتا جس کے آگے ایک صحت مند آراستہ پیراستہ گھوڑا جتا ہوتا۔ آغا وسعت علی خان بالعموم "برجس" میں ہوتے اور ان کی سیاہ لمبی مونچھیں بڑی رعب دار اور جلالی محسوس ہوتیں۔ میں نے اس قسم کی بگھی سرگودہا کے امراء میں سے کسی کے پاس نہیں دیکھی۔ بڑے آغا صاحب کا نام تو لوگوں کو شاید معلوم نہیں تھا لیکن سب انہیں "بگھی والے خان بہادر" کہہ کر یاد کرتے تھے۔ اس بگھی کا انجر پنجر میں نے ایک لمبے عرصے تک آغا صاحب کی حویلی کے باہر پڑا ہوا دیکھا تھا۔ میرے لیے وزیر آغا کا تعارف دوسری نوعیت کا تھا۔ میں نے ان کے ادبی مضامین، انشائیے اور نظمیں، مولانا صلاح الدّین احمد کے رسالہ "ادبی دنیا" میں پڑھی تھیں۔ مسرت کے موضوع پر ان کے فلسفیانہ نوعیت کے مضامین اس رسالے میں چھپتے تو ان کا مطالعہ گہری دلچسپی سے کرتا تھا۔ مولانا صلاح الدین احمد "ادبی دنیا" میں مضامین کا تعارف اس خوب صورت انداز میں کراتے تھے کہ مضامین کا داخل لو دینے لگتا۔ اور قاری ان مضامین کی طرف سب سے پہلے راغب ہوتا۔ انور گوئندی نے پوچھا تو میں نے جواب دیا

"مجھے آغا صاحب سے ملنے کا اتفاق تو نہیں ہوا لیکن میں ان کے بہت سے مضامین پڑھ چکا ہوں اب انور گوئندی نے سجاد نقوی کی طرف اور سجاد نقوی نے انور گوئندی کی طرف حیرت سے دیکھا۔ حیرت کی اس دھند میں انور گوئندی نے کہا:

"شاہ جی! انور سدید سرگودہا میں لمبے وقفوں سے آتا ہے۔ وزیر آغا صاحب سے ان کی ملاقات آج ہی ہونی چاہیئے۔۔ یہ کہہ کر اس نے اپنے ساختہ سگریٹ کا ایک لمبا کش لیا اور اس کے کڑوے کسیلے دھوئیں کو دیر تک باہر آنے کی اجازت نہ دی۔ اس ایک کش میں ہی انور گوئندی نے

آدھا سگریٹ پھونک ڈالا تھا اور اب اس کے پلنگ پر لٹکے ہوئے گُل کو اپنی خمار آگیں آنکھوں سے یوں دیکھ رہا تھا جیسے کوئی عاشق صادق وصال کے بعد اپنے محبوب کو دیکھتا ہے۔ سجاد نقوی نے پوچھا ''گوئندی صاحب! کیا آپ بھی چلیں گے؟ اس وقت ایک مدقوق سا لڑکا کمرے میں داخل ہوا اور اس نے ایک چھوٹی سی پڑیا انور گوئندی کو پکڑا دی اور ایک دونی لے کر تیزی سے واپس چلا گیا۔ اس پڑیا کے ملتے ہی انور گوئندی کی نشہ آور آنکھوں میں انوکھی چمک سی پیدا ہوگئی وہ بولا:

''آپ انہیں لے کر چلیں۔ میں بعد میں آجاؤں گا۔ اس وقت محمد حسین شوق آنے والے ہیں لڑکا ان کی آمد کی اطلاع دے گیا ہے۔

یہ کہہ کر انور گوئندی نے میز کی دراز سے ''لیمپ'' کا سگریٹ نکالا۔ تمبا کو کو ہتھیلی پر الٹا اور پڑیا کا بند قبا کھولنے لگا۔ سجاد نقوی نے ''کامران'' کے تبصروں کے کاغذ سمیٹے اور بولے

''آیئے انور سدید صاحب قبل اس کے کہ انور گوئندی کے سگریٹ کا کڑوا کسیلا دھواں ہمارے پھیپھڑوں میں داخل ہو ہم نکل چلیں'' نیچے انور رستوران پر سجاد نقوی کی سائیکل پڑی تھی۔ یہ وہی سائیکل تھی جس پر نقوی صاحب گھر سے کالج تک اور کالج سے دفتر کامران تک سفر کرتے تھے۔ ایک دفعہ یہ سائیکل تانگے سے ٹکرا گئی تو نقوی صاحب کا کولھا اتر گیا۔ یہ خستہ حال سائیکل دیکھ کر مجھے افسانہ نگار ڈاکٹر اعظم کریوی کی سائیکل یاد آگئی جس کا عبرت ناک نقشہ ضمیر جعفری صاحب نے ان کے خاکے میں پیش کیا تھا۔ میں نے سائیکل کی حالت دیکھ کر کہا:

''نقوی صاحب! کیا یہ ہم دونوں کا بوجھ برداشت کرلے گی۔ کہیں حشر کے دن بے رحمی کے جرم میں ہم دونوں کا دامن نہ پکڑ لے؟''

نقوی صاحب بولے یہ ریلے کی اصلی مضبوط سائیکل ہے۔ میں نے ٹائر ٹیوب نئے ڈالے ہیں۔ آپ بالکل نہ گھبرائیں اور یہ بتائیں آپ آگے بیٹھیں گے آرام دہ ڈنڈے پر یا پچھلے کیریر پر؟''

سجاد نقوی انکسار کی رو میں تھے وہ سنگل پسلی کے جوان تھے۔ میرا جسم محکمہ آبپاشی کے بنگلوں میں دودھ، مکھن اور اپنی پولٹری کے مرغے کھا کھا کر فربہ ہوگیا تھا۔ نقوی صاحب کا وزن سو پاؤنڈ تھا

تو میرا یقیناً اڑھائی سو پاؤنڈ ہوگا۔ میں نے کہا نقوی صاحب! آپ کا سائیکل میں چلاؤں گا۔ آپ ''کامران'' کے مدیر ہیں اور میں آپ کا معمولی سا قلمکار۔ سائیکل چلانا اور مدیر کو کھینچنا میرا فرض بنتا ہے۔ محکمہ نہر میں مجھے سائیکل چلانے کی بڑی پریکٹس ہوگئی ہے۔

نقوی نے ایک معنی خیز جانتی بوجھتی مسکراہٹ ہونٹوں پر لاتے ہوئے کہا اچھا تو یوں کرتے ہیں آدھے فاصلے میں سائیکل میں چلاؤں گا۔ آدھا فاصلہ آپ چلائیں۔ نصف اول میرے ذمے!

یہ کہہ کر وہ سائیکل پر سوار ہوگئے۔ مجھے اپنے پیچھے بٹھالیا۔ میں نے کہا جہاں نصف فاصلہ ختم ہوجائے مجھے بتادیجئے گا۔ نقوی صاحب کے دھان پان جسم میں بلا کی پھرتی تھی۔ سائیکل پر بیٹھتے ہی پہیے تیزی سے گھومنے لگے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب سرگودہا کی سڑکوں پر تانگے بھی آکا ڈکا ہی نظر آتے تھے۔ پیدل چلنے والوں کی بھیڑ بھی نہیں تھی۔ کمپنی باغ سے آگے شہر ختم ہوجاتا تھا۔ ریلوے لائن عبور کرتے ہی سول لائن میں داخل ہوجاتے تھے لیکن آغا صاحب کی حویلی ایک دور افتادہ ویران اور خاموش سے مقام پر تھی۔ بعد میں یہ حویلی اسی مقام پر ایک خوش نما ''کوٹھی'' میں تبدیل ہو گئی لیکن شہر کی حدیں پھیلنے لگیں۔ آغا صاحب کے بنگلے کے سامنے ایک سینما بن گیا اور اس نئی تعمیر کے بعد آغا صاحب کا گھر شہر کے وسط میں آگیا۔

ایک مقام پر پہنچ کر نقوی صاحب نے سائیکل کو بریک لگائی، اپنے قدم زمین پر جمائے تو میں نے باقی نصف حصے کا سفر طے کرنے کے لیے سائیکل چلانے اور اپنی باری بھگتانے کی تیاری کرلی لیکن نقوی صاحب نے یہ کہہ کر حیرت زدہ کردیا کہ ہم منزلِ مقصود پر پہنچ گئے ہیں۔ سامنے ایک حویلی تھی۔ بالکل قلعہ نما۔ اس حویلی کے بڑے چوبی دروازے سے گزر کر اندر داخل ہوئے تو ایک ملازم نے بتایا کہ وزیر آغا صاحب بائیں طرف کے کمرے میں ہیں۔ ہم کمرے میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ آغا صاحب ایک چارپائی پر بیٹھے ہیں۔ ان کے گرد بہت سی کتابیں پڑی تھیں۔ پاس ہی ان کی معروف فیلٹ پڑی تھی۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ وہ پیڈ پر کچھ لکھ رہے تھے۔ ہمیں دیکھ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ یہ کمرہ طویل وعریض تھا۔ لیکن بالکل ویران سا لگتا تھا۔ یوں محسوس ہوا کہ کمرے

کی سب سے قیمتی چیز وزیر آغا ہیں۔ نقوی صاحب سے ہاتھ ملا کر بولے "میں آپ کا انتظار کر رہا تھا"

میں نے وزیر آغا کے سراپا میں بڑے آغا کا جلال تلاش کرنا چاہا لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ وہ مجھے بیحد دھیمے مزاج کے انسان اور سمندر کی طرح شانت نظر آئے۔ سجاد نقوی نے میرا تعارف کرایا۔ یہ انور سدید ہیں محکمہ نہر میں سب انجینئر ہیں۔ "ماہِ نو"۔ "ہمایوں" اور "نیرنگ خیال" میں افسانے لکھتے رہے ہیں۔ لیکن آج کل صرف نوکری کر رہے ہیں۔ "ادبی دنیا" باقاعدگی سے پڑھتے ہیں۔ آپ کے مضامین اور نظمیں بھی انہوں نے پڑھ رکھی ہیں۔"

وزیر آغا بولے میں نے ان کے افسانے "کامران" میں پڑھے ہیں۔ سالنامہ "کامران" میں انہوں نے ڈاکٹر سید عبداللہ کی کتاب "نقد میر" پر جو تبصرہ لکھا تھا اسے سیّد صاحب نے بہت پسند کیا ہے۔" یہ کہہ کر انہوں نے اپنے کاغذات سے ڈاکٹر سید عبداللہ کا خط نکالا اور مجھے پکڑاتے ہوئے پوچھا۔

"انور سدید صاحب! آپ نے افسانہ لکھنا کیوں چھوڑ دیا ہے؟"

میں نے مؤدبانہ کہا دو وجوہات ہو سکتی ہیں۔ یا تو انجینئرنگ کا پیشہ مجھ پر غالب آگیا ہے۔ یا پھر افسانے نے مجھ سے منہ موڑ لیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ دوسری وجہ درست ہے۔"

آغا صاحب سن کر بولے کبھی کبھی لکھنے پر ایسا وقت بھی آتا ہے جب تخلیق کی دیوی فنکار کے حسب خواہش اس پر مہربان نہیں ہوتی۔ اس وقت اپنے اظہار کی صنف تبدیل کر لینی چاہیے۔ پھر انہوں نے کہا کہ جب نظم مجھ پر وارد نہیں ہوتی تو میں کسی تنقیدی مضمون کی طرف متوجہ ہو جاتا ہوں یا انشائیہ لکھتا ہوں یہ کہہ کر انہوں نے شمس آغا کے افسانوں کا مجموعہ "اندھیرے کے جگنو" مجھے دیا اور کہا اس کتاب پر ایک تنقیدی مضمون لکھ دیجئے۔ نقوی صاحب اسے "کامران" میں چھاپیں گے۔ شمس آغا اس وقت دنیا سے روپوش ہو چکا تھا۔ اس نے آٹھ دس افسانے لکھ کر ادبی دنیا میں اپنی دھاک بٹھادی تھی۔ کرشن چندر جیسے بڑے افسانہ نگار نے بھی شمس آغا کی تعریف کی تھی۔ میں نے "ادبی دنیا" میں اس کے سب افسانے پڑھے تھے۔ وزیر آغا صاحب کے مضمون "ٹوٹا ہوا

تارا۔ "شمس آغا" نے ایک عجیب سی جذباتی فضا پیدا کر رکھی تھی۔ اگرچہ سجاد نقوی اس کتاب پر "کامران" کے لیے تبصرہ لکھ رہے تھے لیکن آغا صاحب نے بطور خاص مجھے بھی لکھنے کے لیے کہا۔ چنانچہ میں نے مضمون لکھنے کا وعدہ کرلیا۔ اب چائے کی ٹرالی آ چکی تھی۔ آغا صاحب چائے بنانے لگے۔ اتنے میں صدر دروازے سے غلام جیلانی اصغر آتے دکھائی دیے۔ شام ڈھلنے تک مسعود الرؤف ڈپٹی کمشنر سرگودہا۔ پروفیسر خورشید رضوی۔ ایس پی فضل حق۔ فخر الدین بلے اور ایم ڈی شاد آ گئے۔ اور شام دوستاں آباد ہو گئی۔ لمحہ بے کراں وسعت اختیار کر رہا تھا۔ یہ پہلی ملاقات دنوں، مہینوں اور برسوں پر پھیلتی جا رہی تھی۔ تا آنکہ وقت آ گیا جب وزیر آغا صاحب سفید چادر میں لپٹے ہوئے خاموش تھے اور ہم انہیں لحد میں اتار رہے تھے۔

"دن ڈھل چکا تھا اور پرندہ سفر میں تھا"

بیرسٹر سلیم قریشی (لندن)

ہمدم دیرینہ۔ محمود اختر سعید

زندگی ایک سفر ہے۔ دوران سفر جہاں ہم سفر ملتے ہیں ہمارے ذہن پر اپنے نقوش چھوڑ جاتے ہیں۔ ان میں جو دل اور دماغ کو اپنی یادوں سے روشن کیئے رکھتے ہیں۔ محمود اختر سعید بھی انہی لوگوں میں سے تھے۔

سعید صاحب سے میری رفاقت نصف صدی کا قصہ ہے۔ ۱۹۵۶ء میں جب میں ایس۔ ای کالج بہاولپور میں زیر تعلیم تھا تو نوجوانانِ بہاولپور نے ایک ادبی، ثقافتی تنظیم کے قیام کی اسکیم بنائی۔ اس کی سربراہی کے لیے سب کی نگاہیں جناب منصور عاقل پر مرتکز ہو گئیں۔ جو اس وقت سی۔ ایس۔ پی کی تیاری میں مشغول تھے اور بہاولپور کی ادبی اور ثقافتی محفلوں کے روح و رواں تھے۔ تنظیم نیشنل یوتھ کونسل کے نام سے وجود میں آئی اور عاقل صاحب اس کے صدر چن لیے گئے اور راقم جنرل سیکرٹری۔ کمشنر بہاولپور سید ہاشم رضا کی دلچسپی اور سفارش سے ایس۔ ڈی۔ ہائی اسکول کے عقب میں آفس کے لیے ایک کمرہ اور ہال فراہم کیا گیا۔ سعید صاحب کونسل کے بنیادی اراکین میں سے تھے۔ اور کونسل کی تقاریب میں گہری دلچسپی لیتے تھے۔ کونسل کے آفس میں انہوں نے ایک چھوٹی سی لائبریری قائم کر لی تھی جو اراکین کی دلچسپی کا باعث بنی رہی ۱۹۵۸ء میں پہلے مارشل لاء کی بگل سنائی دی، اس دوران عاقل صاحب کو پہلے میانوالی پھر ملتان کالج میں تدریسی سلسلے میں ملازمت کے لیے جانا پڑا۔ راقم کو بھی تدریسی سلسلے میں بہاولپور سے باہر جانا پڑا، اس طرح نیشنل یوتھ کونسل کی سرگرمیاں ٹھنڈی پڑ گئیں، اس دوران احباب نے سعید صاحب کے گرد حلقہ بنا لیا۔

سعید صاحب بہاولپور سنٹرل لائبریری میں اسسٹنٹ لائبریرین کے عہدے پر فائز

تھے۔نوجوان ملازم پیشہ اور طالب علموں میں بہت مقبول تھے جو مطالعہ کے لیے ان کی حوصلہ افزائی اور کتابوں کے انتخاب میں ان کی رہنمائی کیا کرتے تھے۔نوجوان لائبریری سے باہر بھی ان کے حلقۂ احباب میں شامل ہوگئے۔ان میں ایس۔ای کالج اور میڈیکل کالج کے طلبہ کے علاوہ ملازم پیشہ نوجوان بھی شامل تھے۔ اسٹنٹ لائبریرین کی حیثیت سے کتابوں کی درجہ بندی اور کیٹالوگنگ سعید صاحب کے فرائض میں داخل تھے۔لائبریری میں آنے والی ہر کتاب ان کی نظر سے گزر کر شلف میں جاتی اس طرح سعید صاحب نے دنیا جہان کی کتابیں پڑھ ڈالیں اور حافظہ اس قدر قوی تھا کہ ان کی اہم عبارتیں سعید صاحب کے ذہن میں محفوظ رہتیں۔

۱۹۶۱ء میں راقم کو تعلیم و تدریس کا سلسلہ جاری رکھنے کے لیے کراچی جانا پڑا، وہاں کنٹونمنٹ پبلک اسکول میں ملازمت اور شام کو ایس۔ایم لاء کالج میں کلاسیں پوری کرنے میں اس قدر مشغولیت رہی کہ سعید صاحب سے رابطے میں تعطل آگیا۔اپریل ۱۹۶۴ء میں انگلستان چلا آیا یہاں آنے کے بعد تھوڑے ہی عرصے میں رابطہ استوار ہوا، اس کے بعد یہ سلسلہ جاری رہا ان کے خطوط یادوں کا سرمایہ ہیں۔

دل کے آئینے میں ہے تصویر یار　　　جب ذرا گردن جھکائی دیکھ لی

نہ صرف دل کے آئینے میں سعید صاحب کی تصویر دکھائی دیتی ہے بلکہ ان کے خطوط میں بھی ان کا عکس نظر آتا ہے۔مشتے از خروارے ذیل میں راقم کے نام دو خطوں کے اقتباس ملاحظہ فرمایئے۔

اسلام آباد

۱۶ اکتوبر ۲۰۰۴ء

برادر مکرم سلیم قریشی صاحب، السلام علیکم

آپ فی الحقیقت سلیم الطبع بھی ہیں اور حلیم الطبع بھی۔قدرت نے آپ کو بیشمار خوبیوں سے نوازا ہے۔آپ از فرق تابہ قدم پیکرِ خلوص و محبت ہیں۔آپ کی کمپنی میں وقت کا احساس ہی نہیں رہتا۔جب سے یہاں آیا ہوں میرے حاشیۂ خیال میں آپ ہی کی پرچھائیاں ہیں۔آپ کی

باتوں کی، یادوں کی مہکار ہے۔ آپ کی محبت وانسیت کی زلفِ گرہ گیر میں کہیں یوسف چاند ہیں، تو کہیں حلقہ تعارف میں محمد شریف بقاء صاحب جیسے جامع الصفات مفکّر و دانشور، محترمہ ہما پرائس جیسی نکتہ داں کے علاوہ بیشمار اربابِ ادب وثقافت مانند کہکشاں جگمگا رہے ہیں۔

اس مرتبہ چونکہ داستان سیر وسیاحت قلمبند کرنے کا خیال تھا، بایں وجہ لندن میں مقیم اہل وطن کی ادبی وسماجی مصروفیات اور مشاغل کا جائزہ لیتا پھرا۔ یہی وجہ ہے کہ آتے ہوئے دردِ دل کا تحفہ بھی ساتھ لایا ہوں۔ لندن کے دیارِ رنگ و نور کے ہاتھوں نہیں بلکہ آپ کی رومان پرور مصاحبت چھوڑتے ہوئے، بس دل بیٹھ سا گیا۔ بہر حال یار زندہ صحبت باقی۔

محترمی ومکرمی قبلہ محمد شریف بقا صاحب کی علم وادب سے بھرپور باتیں تاحال سماعت میں رس گھول رہی ہیں۔ مجھے بے حد افسوس ہے کہ سامان کی زیادتی کی وجہ سے میں ان کی عطا کردہ کتابیں ساتھ نہ لاسکا۔ ایئرپورٹ پر کافی سامان کم کرنا پڑا۔ عاقل صاحب کو بھی میں نے بتادیا تھا کہ بقا صاحب نے ان کے لیے بھی مضامین القرآن کا نسخہ عطا کیا تھا، جو لندن میں رہ گیا۔۔۔

مکتوب دوم

برادرم سلیم قریشی صاحب، اسلام وعلیکم

'بے کم وکاست' پر آپکا بڑا پُر لطف تبصرہ موصول ہوگیا تھا۔ میں نے آپ کا یہ خط محترمی عاقل صاحب کو بھی دکھایا تھا۔ وہ بھی محظوظ ہوئے۔ 'بے کم وکاست' پر کئی دوستوں نے اپنے اپنے نقطۂ نظر سے اظہارِ خیال کیا ہے۔ اپنے ایک مضمون میں اِن تبصروں کو یکجا کرنے کا خیال ہے۔ سہ ماہی 'الاقرباء' (اپریل تا جون) دو تین روز تک چھپ کر آجائیگا۔ منصور عاقل صاحب پرچہ چھپنے کے انتظار میں، لندن پہنچنے کے لیے پابہ رکاب بیٹھے ہیں۔ والسلام

خیر اندیش

محمود اختر سعید

جولائی ۲۰۰۳ میں سعید صاحب کی کتاب ''بے کم و کاست'' (باہم رویوں کی داستان) منظر عام پر آئی یہ کتاب مصنف کے وطن مالوف لدھیانہ (مشرقی پنجاب) کی تقسیم ہند سے قبل کی تاریخ ہے۔ تقسیم اور ہجرت کے بعد پاکستان میں اپنی طالب علمی سے لے کر چک لالہ راولپنڈی ٹی وی سے ریٹائرمنٹ تک کے واقعات درج ہیں۔

مصنف نے راقم اور جناب منصور عاقل نیز ہماری مشترکہ تنظیم نیشنل یوتھ کونسل کا تفصیلی ذکر کیا ہے، مصنف نے اپنے لندن کے قیام کے دوران کتاب کا مسودہ دے کر اس کا پیش لفظ لکھنے کی فرمائش کی تھی جو میں اپنی پیشہ وارانہ مصروفیت کے باعث نہ لکھ سکا،

''بے کم و کاست'' مصنف کے احباب اور رفقائے کار کے باہم رویوں کی بھی داستان ہے۔ آپ بیتی سے زیادہ جگ بیتی ہے کہا تھا ''چلو تو چاند ستاروں کو ساتھ لے کے چلو'' چنانچہ سعید صاحب نے چاند ستاروں میں جناب منصور عاقل کو سرفہرست رکھا اور راقم جیسے پرِ کاہ کو بھی ساتھ رکھا۔ اس میں نیشنل یوتھ کونسل بہاولپور اور اس کے اراکین کا تفصیلی ذکر ہے۔

سعید صاحب ویسے تو شروع سے ہی سخن فہم اور سخن شناس تھے بعد میں احباب نے شاعری میں ان کے ذوق و شوق کو دیکھتے ہوئے انہیں دھکیل کر سخن وری کی وادی میں لے آئے، سعید صاحب بوقت ضرورت ہی شعر کہتے تھے، ٹیلیویژن کی سروس سے ریٹائرمنٹ پر دوست احباب نے سعید صاحب کے لیے الوداعی پارٹی کا اہتمام کیا جس کا انہوں نے 'بے کم و کاست' میں ذکر کیا ہے، اس موقع پر انھوں نے جو الوداعی نظم کہی اس کے چند شعر درج ذیل ہیں:

دوستوں کو الوداع کہنے کی ساعت آگئی — بزمِ رنگ و نور سے رخصت کی نوبت آگئی
اب تصور میں رہیں گی دوستوں کی صورتیں — پیار کی اخلاص کی، مہر و وفا کی مورتیں
دوستوں کا، ساتھیوں کا، یہ نگر اچھا لگا — مڑ کے جب میں دیکھتا ہوں یہ سفر اچھا لگا
رنگ و رامش کے جہاں سے آخری اپنا پیام — دوستوں کو، ساتھیوں کو السلام و والسلام

ملازمت بھی انہیں ان کے مزاج کے مطابق ملی، ان کا تخیل انہیں سفر پہ اکساتا تھا، ہاتھ کی

لکیروں کے ساتھ ساتھ وہ پاؤں کی لکیروں کے بھی قائل تھے، وہ اکثر کہا کرتے تھے پاؤں کی لکیریں انہیں نگری نگری لیے پھرتی ہیں۔ سعید صاحب زندگی کے آخری ایام تک سفر میں رہے۔ اس دفعہ پچھلے سال کے موسم گرما میں بیٹے حمید کے پاس گلاسکو آئے، ۲۵ دسمبر کو وطن واپسی کے لیے سیٹ بک کرائی اور وطن پہنچنے کے بعد دو ہفتوں کے اندر اندر آخری سفر پر روانہ ہو گئے ، ایسے سفر پر جس کا سفر نامہ وہ ہم تک نہیں بھیج سکیں گے۔

پچھلے تین عشروں میں وہ کئی دفعہ لندن آئے۔ اتفاق سے ہمارے ایک ہمدم دیرینہ مقبول الٰہی اور ان کے بیٹے حامد کی قیام گاہیں میرے مکان سے قریب تھیں۔ اس لیے رات گئے تک میرے ہاں نشست ہوتی کبھی کبھار اور لوگ بھی آجاتے۔ لندن کے قیام کے دوران ہم دونوں مختلف محفلوں میں شرکت کرتے، کچھ تو سعید صاحب کے لیے سجائی جاتیں۔ خود میری طرف سے جناح سوسائٹی کی تقاریب میں جو پاکستان ہائی کمیشن میں منعقد ہوئیں سعید صاحب کی دونوں مذکورہ کتابوں کی رونمائی ہوئی۔ سعید صاحب نے ان محفلوں کا اپنی کتاب ' قریہ بہ قریہ کوبہ کو' میں تفصیلی ذکر کیا ہے۔

ایک دفعہ اسلام آباد قیام کے دوران ایک دوپہر میں نے سعید صاحب کے ساتھ گزاری شام کو عاقل صاحب کے پاس پہنچے تو میں نے کہا آج ہماری خوب باتیں ہوئیں عاقل صاحب سعید صاحب کی خاموش طبیعت سے واقف تھے کہنے لگے باتیں آپ نے کی ہوں گی میں نے کہا کہ مجھے بات کرنے کا موقعہ ہی نہیں ملا اس پر ہم سب ہنس پڑے۔ سعید صاحب نے انگلینڈ اور اسکاٹ لینڈ کے علاوہ یورپ اور سنٹرل ایشیا کے طول وعرض کا بھی سفر کیا۔ اگر وہ ان ممالک کا سفر نامہ لکھتے (جیسا کہ انکا ارادہ تھا) تو یہ بھی ایک نہایت دلچسپ سفر نامہ ہوتا، وہ جہاں جہاں بھی گئے ہیں وہاں سے مجھے خطوط لکھتے رہے ہیں۔ تحریر اتنی شستہ اور جاندار کہ جیسے دیکھ رہے ہیں ویسے سناتے جا رہے ہیں ان کے بیشتر خطوط میرے پاس محفوظ ہیں کاش میں انہیں یکجا کرسکوں تو یہ بھی سعید صاحب '' کا بچشم خود، بقلم خود'' ایک سفر نامہ بن جائیگا جنیوا سے بھیجے گئے ایک خط کا اقتباس

ذیل میں پیش کرتا ہوں:

محترمی سلیم قریشی صاحب!۔۔۔السلام علیکم

میں ۹ا اگست کی صبح اسلام آباد سے روانہ ہو کر اسی صبح گیارہ بجے دوبئی پہنچ گیا تھا۔ دوبئی میں قیامت کی گرمی تھی۔ جیسے سورج سوا نیزے پر آ گیا ہو۔ صرف شام کو تین گھنٹے کے لیے ہوٹل سے باہر نکلنا ہوا۔ دوبئی خوبصورت پلازوں اور تھوک مارکیٹوں کا شہر ہے۔ سڑکیں کشادہ اور صاف ستھری ہیں۔ کاروباری اور تاجر طبقہ کے لیے کہتے ہیں کہ جنت ہے مگر لگتا ہے کہ یہاں کے لوگوں کو پڑھنے لکھنے سے کوئی زیادہ دلچسپی نہیں ہے۔ جہاں جہاں میرے قدم گئے، کتابوں کی کوئی دوکان نظر نہیں آئی، ویسے جتنے 'نامی گرامی' مشاعرے دوبئی میں ہوئے ہیں اور ہوتے ہیں۔ ویسے مشاعرے ہندوستان اور پاکستان میں بھی نہیں ہو رہے۔ دوبئی سے ۱۰ اگست کو اٹلی کے شہر میلان پہنچا۔ وہاں میرے دوست کے بھانجے ندیم کاظمی صاحب لینے آئے ہوئے تھے۔ ان کی رہائش ضلع بریشیاء (Brescia) کے قصبہ پلازالوسُل اولیگلیو (Palazzalo Sui oligio) میں ہے۔ اس کے چند کلومیٹر کے فاصلہ پر Iseo کے علاقہ میں جھیل ہے۔ شام تک اس جھیل کے کنارے حسنِ فطرت کو رواں دواں دیکھا کیے۔ ۱۱ اگست کو میں اکیلا ہی دو گھنٹہ کی مسافت پر ایک تاریخی شہر ویرونہ دیکھنے چلا گیا۔ یہ بہت بارونق اور خوبصورت شہر ہے۔ لیکن اِسے زیادہ شہرت شیکسپئر کے ڈرامہ ''رومیو جولیٹ'' سے ملی۔ اِن عاشقان پاک طینت کا تعلق اِسی شہر ویرونہ سے تھا۔ اپنی اپنی قسمت ہے کسی کو ویرونہ اور کسی کو ویرانہ نصیب ہوا۔

ما و مجنوں ہم سبق بودیم در دیوانِ عشق ۔۔۔ او بصحرا رفت و ما در کوچہ ہا رسوا شدیم

جیولیٹ کا گھر، اس کا مقبرہ اور رومیو کی حویلی۔ یہ مقامات سیاحوں کی توجہ کا مرکز بنے ہوئے تھے۔ جولیٹ کے گھر کے آنگن میں جولیٹ کا خوبصورت مجسمہ نصب ہے۔ ہجر و فراق کے مارے اس مجسمہ سے لپٹ لپٹ کر تصاویر بنوا رہے تھے۔

۱۲ اگست کو عجائبات عالم کا منفرد شہر وینیزیا (Venezia) دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ میں اور

ندیم صاحب چار پانچ گھنٹے ریل کا سفر کر کے آبِ رواں پر تیرتے ہوئے اس شہر میں جا پہنچے۔ ایک خلقِ خدا اسے دیکھنے کے لیے امڈ آئی تھی۔ کہتے ہیں کہ کولمبس اور مارکو پولو کا تعلق بھی اسی قابلِ دید شہر سے تھا۔ ۱۳ اگست کی صبح بریشیاء اور میلان گئے۔ دونوں شہر بارونق اور صاف ستھرے ہیں۔ میلان میں زیادہ رونق تھی۔ شہر کے وسط میں ایک تاریخی قلعہ ہے، جسے اب ایک میوزیم میں ڈھال کر سیاحوں کے لیے کھول رکھا ہے۔ قریب ہی ایک چرچ ہے، یہ چرچ اپنے فنِ تعمیر کی وجہ سے عجائباتِ عالم میں شمار کیا جاتا ہے۔ یہاں بھی عقیدت کے ماروں کا اور کچھ ہم جیسے لوگوں کا ایک ہجوم تھا۔ رات کی فلائٹ سے جنیوا آ گیا تھا۔ برادرم اصغر ایئر پورٹ پر لینے آ گیا تھا اصغر کا گھر شہر سے تقریباً آٹھ کلو میٹر باہر ہے۔ یہ جگہ میران کہلاتی ہے۔ اس کے تین اطراف میں فرانس ہے۔ یعنی قدم قدم پر فرانس ہے۔ کھلی کھلی خوبصورت بستی ہے۔ جنیوا کے لوگوں کو سبزہ و گل سے ایک گونہ رغبت ہے۔ روش روش دامانِ باغبان و کفِ گلفروش ہے۔ گویا عمر خیام کی رباعیوں کو اوراقِ تخیل سے فرشِ زمین پر اُتار لیا ہے۔ دستِ قدرت اور دستِ ذوق و شوق کی یہ مینا کاری باعثِ تسکینِ قلب و نظر ہے۔

یورپ کے حسنِ فطرت کے گُن آپ کے سامنے کیا گاؤں، آپ تو خود اِن ہواؤں کے پالے ہوئے ہیں۔ لیکن یہ سب کچھ لکھنے کا مقصد آپ کو جنیوا آنے کے لیے راغب کرنا ہے۔ آپ نے میرے ساتھ لندن سے جنیوا آنے کے لیے 'عندیہ' ظاہر کیا تھا۔ اصغر کا ایڈریس اوپر لکھ دیا ہے۔ فون نمبر یہ ہے: 7824164

اصغر کے پاس 'دی نیشن' لندن' آتا ہے۔ اس کے جمعہ کے ایڈیشن میں خالد رانجھا کے ساتھ گروپ فوٹو میں آپ کی تصویر بھی ہے۔ میں نے یہ تراشہ سنبھال لیا ہے۔ اس تراشہ سے رشتۂ سخن کی کئی گرہیں کھلیں گی۔ اور کئی پہلو سے گفتگو ہوگی۔ مجاہد ترمذی صاحب سے بھی اردو مرکز کے حوالے سے ملنے کی خواہش ہے۔ میں انشاء اللہ ۱۴ اکتوبر کو سوئس ایئر لائن سے ساڑھے سات بجے شام، لندن پہنچ جاؤں گا۔ والسلام

خیر اندیش محمود اختر سعید

سعید صاحب کی تیسری معرکہ آرا کتاب: اعتزافات و اختلافات، (مجموعہ مضامین و مقالات) بھی چھپ کر منظر عام پر آ چکی ہے یہ کتاب پندرہ تحقیقی مضامین اور مقالات پر مشتمل ہے۔ کتاب کی ابتدا شبلی نعمانی کے اس قول سے ہوتی ہے۔ ”تحقیق کا کام دراصل چیونٹیوں کے منہ سے شکر چھین کر شیرہ بنانے کے مترادف ہے“۔ بیشتر مضامین سہ ماہی الاقرباء کے مختلف شماروں کے اوراق کی زینت بن چکے ہیں۔ سعید صاحب نے 'عرض مصنف' میں یوں اعتراف کیا ہے' میں معروف سخن ور نقاد و دانشور سید منصور عاقل صاحب (صدر الاقرباء فاؤنڈیشن اور صدر نشین مجلس ادارت سہ ماہی الاقرباء اسلام آباد) کے لیے سراپا سپاس ہوں، جن کی توجہ اور حوصلہ افزائی کی بدولت یہ مضامین ضبط تحریر میں آئے'

یوں تو اس کتاب کا ہر مضمون تحقیق کے مراحل طے کرتا ہوا آیا ہے، اولیات اردو ادب۔ تحقیقی مطالعہ اردو کے آغاز اور ارتقاء پر تاریخی اہمیت کا حامل ہے۔ ۵۶ صفحوں پر پھیلا ہوا یہ مضمون اردو کی تقریباً ۶ صدیوں کی تاریخ اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔

ایک اور تحقیقی مضمون 'سہ ماہی الاقرباء کے اداریے' ہیں۔ اس میں مصنف نے ادبی صحافت کے آغاز سے لے کر موجودہ دور تک کے رسائل اور جرائد کی ادارہ نویسی کا تحقیقی جائزہ لیا ہے اور ساتھ ہی جناب منصور عاقل صدر نشین مجلس ادارت کو خراج تحسین پیش کیا ہے کہ۔۔۔ اس مجلّہ نے ادرایہ نویسی کے باب میں جو تمام تر جناب منصور عاقل کے فکر و نظر اور رخامۂ جدت طراز کا مرہون منت ہے ایک کہنہ روایت کو ایک نئی جہت عطا کی'

سعید صاحب نے ایک بھرپور زندگی گزاری، سنٹرل لائبریری بہاولپور میں ان کی ملازمت ان کے مزاج کے مطابق تھی، وہ خود بہت اسمارٹ اور انکا لباس بہت نفیس ہوتا تھا، ہمیشہ تھری پیس سوٹ میں ہوتے۔ لباس کے انتخاب میں ان کی رفیق حیات کی رفاقت بھی شامل رہتی، جس کا انہوں نے اپنی کتاب بے کم و کاست میں ذکر کیا ہے۔ خاموش طبیعت، اپنے کام سے کام رکھتے تھے۔ کوئی زیادتی کرے تو اس کا احساس تو ہوتا تھا لیکن برداشت کر لیتے،

آخری سفر:

سعید صاحب نے ۲۵ دسمبر کو اسلام آباد کے لیے اپنی سیٹ بک کرائی تھی، دسمبر کے مہینے میں موسم کی خرابی کی وجہ سے پروازیں متواتر ملتوی ہوتی جا رہی تھیں لیکن سعید صاحب کی پرواز بحال رہی، وطن پہنچنے کے بعد دو ہفتوں کے اندر اندر سفرِ آخرت کے لیے رختِ سفر باندھ لیا۔ آخری وقت تک ہوش و حواس میں افرادِ خاندان کے ساتھ خوش گپیاں کرتے رہے اور اسی حالت میں داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ اِنّا لِلّٰہ وَ اِنّا اِلیہِ رَاجِعُون۔

انہی کی ایک تحریر سے دستیاب شعر سے یادوں کا یہ ایک باب اختتام کو پہنچا

کچھ ایسے بھی اس بزم سے اٹھ جائیں گے جن کو ۔۔۔ تم ڈھونڈنے نکلو گے، مگر پا نہ سکو گے

"یا وکیل، یا قاضی الحاجات"
۱۴ ہجری ۳۲

"درج تواریخ نشر"
۲۰ عیسوی ۱۱

"تم من مصابیح آربیح"
۱۴ ہجری ۳۲

"آہ اختر محمود"
۱۴ ہجری ۳۲

"آہ! مرگِ اختر اندوہناک سالِ جدائی ہے۔ قمر آ"
۲۰ عیسوی ۱۱

"ہر دل عزیز الاقربا کے رکن مجلسِ ادارت، آہ ہو وفا وہ"
۲۰ عیسوی ۱۱

"اختر ادیب تھے اور بکمال محب باوفا"
۲۰ عیسوی ۱۱

"خالق کر گیا جو سیر الفت، موت کا رخ"
(در صنعت ... ۱۴۶۸۴ + ۴ =) ۳۲ ہجری ۱۴

"تم محمود ہو، محب ہو، یہ رازِ دل نہ جانی موت"
۱۴ ہجری ۳۲

"رب العالمین پاک! ہو عطا انھیں قرب سرور"
۱۴ ہجری ۳۲

"گل کی صورت وجود، اختر میں گل رنگ"
۱۴ ہجری ۳۲

"ہم عصر، ہم قلم، پاک باطن وہ"
(در صنعت تضارب ۷۱۶ × ۲ =) ۳۲ ہجری ۱۴

"راہِ حق پر ہمسرہ پائے رہے محمود تم عمر بھر"
۲۰ عیسوی ۱۱

"آہ اختر محمود"
۱۴ ہجری ۳۲

"آہ اختر محمود"
۱۴ ہجری ۳۲

"درج کرد از انتخاب علی کمال ۔ کراچی"
۲۰ عیسوی ۱۱

"یوم منگل، مورخہ یکم مارچ سن دو ہزار گیارہ سال"
۲۰ عیسوی ۱۱

بیادِ محمود اختر سعید مرحوم

پروفیسر اقبال گل

ایک غم گسار دوست کا سفرِ آخرت

سعید صاحب مرحوم نے اپنی زندگی کے آخری تین مہینے سکاٹ لینڈ میں گزارے۔ اُن کے سفر پر جانے سے پہلے میں اُن کو لیک من ٹیتھ، برنم وڈ، فال کرک، گلاسگو اور ایڈنبرا کے نواح و جوار میں خوابیدہ پُر اسرار کہانیاں سنایا کرتا۔ ایڈنبرا وہ شہرِ خوش عذاراں ہے جہاں میں نے پینتالیس برس پہلے اپنی اجڑی ہوئی جوانی کے شب و روز گزارے تھے۔ میں سعید صاحب کو ہر ہفتے فون کرتا ان کی خیریت اور مصروفیت پوچھتا۔ ہماری اس گفتگو کے حاشیوں میں وہ اکثر اُن باتوں کو دہراتے جو ہم دونوں اسلام آباد میں کیا کرتے تھے۔ اس طرح میں ایک بار پھر الفاظ اور آواز کے ذریعے برسوں چھوٹے ہوئے شہرِ خواب میں اُن کا ہم سفر ہو جاتا۔ اسلام آباد میں ان کی رہائش گاہ میرے غریب خانے سے سات آٹھ منٹ کے پیدل فاصلے پر ہے۔ جب وہ ۲۶ دسمبر ۲۰۱۰ء کو وطن واپس آئے تو مجھے اطلاع دی کہ میں خریت سے پہنچ گیا ہوں، آنے والے دو تین دنوں میں ملاقات ہو جائے گی۔ چنانچہ میں ۲۹ دسمبر کو ان سے ملاقات کے لیے ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ نہایت گرم جوشی سے ملے۔ دیر تک مجھے گلے سے لگائے رکھا۔ شہر و دیار اور احباب کی عافیت دریافت کی۔ محبی سیّد منصور عاقل صاحب صدر نشین الاقرباء کے بارے میں محسوس محبت کا اظہار کرتے ہوئے ادھر اُدھر دیکھنے لگے۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ انہیں تلاش کر رہے ہوں۔ پھر چار پانچ روز بعد ''الاقرباء'' جس کے وہ مدیر تھے کی اشاعت اکتوبر تا دسمبر ۲۰۱۰ کے مندرجات کے علاوہ ٹائٹل تک کی بے حد تعریف کی۔ اُن کے آخری الفاظ جواہر کی صورت میں میرے پاس ان کی امانت کے طور پر محفوظ رہیں گے۔

سعید صاحب کی زندگی یادوں کا چمن زار تھی۔ اس میں خارِ مغیلاں بھی تھے مگر بہت کم۔ جب وہ اپنی ملازمت کے تاباں اور دھندلے دنوں کا ذکر کرتے تو اپنے ہم کاروں کے کام

کو اس طرح سراہتے کہ اُن کی آنکھوں میں کروٹیں لیتی ہوئی روشنی قابلِ دید ہوتی اس روشنی کی لہروں میں بیتے دنوں کے واقعات از خود ذہن پر ابھرتے، چمکتے اور یادوں کا حصہ بن جاتے۔ لکھنے پڑھنے کا موضوع زیرِ بحث آتا تو تحقیق کے پُر پیچ کوچوں میں گم ہو جاتے۔ فرمایا کرتے تھے کہ اس کام میں جذبہ ہمہ وقت جستجو کا ہم رکاب ہوتا ہے۔ تخلیقی اور معلوماتی تحریروں میں بڑا فرق یہ ہے کہ تخلیق قدرت کا عطیہ ہے جب کہ معلوماتی مواد کا مرتب عصری ذہانت کا امین ہوتا ہے۔ ''الاقرباء'' سے وابستگی کے باعث دنیا کے کنارتا کنار صاحبانِ دانش اُن کے نام سے آشنا تھے۔ اُن کی آخری کتاب ''اعترافات واختلافات'' جب اشاعت پذیر ہوئی تو اس کے دو نسخے راقم کو عطا کر کے مراسم کی کبھی نہ بجھنے والی قندیل روشن کر دی۔ ''سخن ہائے گفتنی دارم'' زیرِ تکمیل تھی کہ

دل پہ اک لگنے نہ پایا زخم کاری ہائے ہائے ہاتھ ہی تیغ آزما کا کام سے جاتا رہا

میں سعید صاحب کے مبلغ علم اور یادگار شائستگی پر ان کی رحلت کا غم کم ہونے پر اپنے تاثرات لکھوں گا۔ یہ مختصر تحریر تو ان کی شخصیت جو آغازِ سرما کی چاندنی سے معمور تھی اُس کا ایک ادھورا سا خاکہ ہے ۹ جنوری ۱۰۱ء کی صبح کو محترم منصور عاقل صاحب کا فون آیا کہ سعید صاحب ہمیشہ کے لیے ہم سے جدا ہو گئے ہیں میں دم بخود رہ گیا۔ اور بغیر کسی تاخیر کے ان کی رہائش گاہ پر پہنچ گیا۔ ظہر کے بعد صحن مسجد میں تقریباً تین سو افراد نے نمازِ جنازہ میں شامل ہو کر ایک غریب الوطن ادیب کو آخری بار الوداع کہا۔ مرحوم دو دن تک علالت سے نبرد آزما رہے۔ آخر دل کا عارضہ غالب آیا۔ آٹھ جنوری کی رات کو ان کی سانس اکھڑ گئی اور پھر:

کفن سرکاؤ میری بے زبانی دیکھتے جاؤ

اسلام آباد کے قبرستان میں ایک طرف اعزہ واقارب اُن کی تربت پر کھڑے ان کی مغفرت کی دعا مانگ رہے تھے۔ دوسری جانب وقت مٹی کے ڈھیر پر دیا ئے وفا تعمیر کرنے میں مصروف تھا۔

سید انتخاب علی کمال

اظہارِ عقیدت (تاریخ ہائے وفات)

حکیم اصغر حسین راغب مرادآبادی کا بروز جمعرات ۲۰ جنوری ۲۰۱۱ء مطابق ۱۵ صفر المظفر ۱۴۳۲ ہجری کراچی کے علاقے فیڈرل بی ایریا میں انتقال ہوا۔ مرحوم کو النور قبرستان میں سپردِ خاک کیا گیا۔ راغب مرادآبادی ایک نامور اور کہنہ مشق شاعر تھے۔ آپ نے ہر صنف میں شعر کہے ہیں۔ بہت عمدہ رُباعیات کہتے تھے۔ مرحوم ایک اچھے تاریخ گو شاعر بھی تھے۔ اُن کا شعری مجموعہ ''رگِ گفتار'' ۱۹۸۹ء میں شائع ہو کر پذیرائی حاصل کر چکا ہے۔ اُن کے قطعاتِ تاریخ قلمی نسخہ کی شکل میں موصوف کے پاس محفوظ تھے۔ اکتوبر / دسمبر ۲۰۰۶ء میں راقم الحروف نے سہ ماہی الاقرباء کے

مُنیرِ بَاسِطِ غَنِیؔ
۱۴ ہجری ۳۲

''رَاغِبِ بزرگ''
۱۴ ہجری ۳۲

''رَاغِب، طبیبِ دانا چلے عدم کے سفر پر''
۲۰ عیسوی ۱۱

''ایک کہنہ مشق شاعر تھا موصوف نہ رہا''
۲۰ عیسوی ۱۱

''غم اُس کا شدید، فضل علم جس کا تھا بلیغ''
(در صنعتِ تناقص) (۳۰۲۲ - ۲) ۲۰۱۱

''باکمال تھا وہ نامور رَاغِب''
۲۰ عیسوی ۱۱

''برجستہ گوئی کا تھا انمول نقیب''
۱۴ ہجری ۳۲

''زندگی بھر رہی فصیحانہ شاعری عزیز''
۱۴ ہجری ۳۲

''رُباعی و تاریخ گوئی میں عمدہ ماہر''
۲۰ عیسوی ۱۱

''گلستانِ ادب، علم زیبا'' ''وقارِ اہلِ ادب، تجلّی ملکِ بزرگ''
۷۱۶ × ۲ = ۱۴۳۲ ہجری (در صنعتِ تقطیع) — ۷۱۶ × ۲ = ۱۴۳۲ (در صنعتِ تقطیع)

''از طبعِ حلیم انتخاب علی کمال''
۱۴ ہجری ۳۲

''رحلت بروز جمعرات بیسں جنوری دو ہزار گیارہ عیسوی''
۲۰ عیسوی ۱۱

لئے ایک مقالہ "فنِ تاریخ گوئی پر یک صد/۱۰۰ مطبوعات ومخطوطات کا اِشاریہ" تحریر کیا تھا۔ اس سلسلے میں موصوف سے رابطہ کر کے مجموعے کا نام دریافت کیا تو موصوف نے اُس کا نام 'تاریخ ہائے مرحومین' بتایا تھا۔ مرحوم اُس وقت اس کی اِشاعت کے لیے کوشاں تھے۔ کاش اس کی اِشاعت ہو سکے۔

مُندرجہ ذیل مادّہ ہائے تاریخِ وفاتِ رَاغب مرادآبادی چار مختلف صنعتوں کے حامل ہیں: (۱) صَنعتِ تَرصیع: یعنی ہر جملے یا ہر مصرعہ سے تاریخ کہنا۔ (۲) صَنعتِ توشیح: ہر جملے یا مصرعے کے پہلے اور آخری حروف کے اعداد سے مرحوم کی وفات کا مادّہ تاریخ "راغب بزرگ" ۱۴۳۲ ہجری حاصل ہوتا ہے (۳) صنعتِ تناصف: یعنی حاصل شدہ کل اعداد کو نصف کرنے سے مرحوم کا سالِ وصال برآمد ہوتا ہے۔

بیادِ مظفر وارثی

ہدیۂ سپاس: سید انتخاب علی کمال

"یا مجیب الدعوات یا شہنشاہِ اقالیم"
١٤٣٢ ہجری

"تو اسے بخش شہرِ اجمل"
٢٠١١ عیسوی

"جمالِ مظفر وارثی"
٢٠١١ عیسوی

ج (٣) — "جوہر ٹاؤن لاہور میں مدفون ہوئے وہ محترمِ احباب آج"
١٤٣٢ ہجری

م (٤٠) — "مرگِ ناگہاں، مردِ پاک باطن کو جزو و کل سے کر گئی محروم"
١٤٣٢ ہجری

ا (١) — "اعلیٰ نعتیہ شاعر، وہ مردِ قابل تھا"
٢٠١١ عیسوی

ل (٣٠) — "لطافت بصدق، حقیقت بہ کمال"
١٤٣٢ ہجری

م (٤٠) — "معانی طراز مظفر اب چلے گئے سوئے اِرم"
٢٠١١ عیسوی

ظ (٩٠٠) — "ظاہر و باطن میں محبِ آلِ نبیؐ، تھا محمدؐ کی لحاظ"
(در صنعت تنصیف) ٢٨٦٤ ÷ ٢ = ١٤٣٢ ہجری

ف (٨٠) — "فکر سے فدائے رسولؐ تھے، نیک وصف"
١٤٣٢ ہجری

ر (٢٠٠) — "رعشہ تھا آزار، چلنے پھرنے سے قاصر"
٢٠١١ عیسوی

و (٦) — "وقارِ نعت تھا، جہدِ کمال نمو"
١٤٣٢ ہجری

ا (١) — "احسن نعتیہ شاعر، وہ رونقِ بیاں تھا"
٢٠١١ عیسوی

ر (٢٠٠) — "رنگِ نعت میں وہ تھا جادو کلک، منفرد، ماہر"
٢٠١١ عیسوی

ث (٥٠٠) — "ثمر ملے فی نفسہٖ اعلیٰ یا اللہ یا وارث"
٢٠١١ عیسوی

ی (١٠) — "یا اللہ! دعائے کمال ہے مرحوم کو نہایت قربِ نبیؐ دے"
١٤٣٢ ہجری

"جمالِ مظفر وارثی" ٢٠١١

"جمالِ مظفر وارثی" ٢٠١١

پرداز فکر یعنی آراستگیٔ فکر

"نتیجۂ فکر از انتخاب علی کمال، کراچی"
٢٠١١ عیسوی

بکمال تاریخ: یکم فروری، منگل
٢٠١١

انتخاب علی کمال
یکم فروری ٢٠١١ء
"خاص اہلِ فکر الاقربا کے لیے"

حضرت حسان بن ثابتؓ ☆

عربی نعت

اردو ترجمہ

الصبح بدامن طلعته
والیل دجامن و فرته

ہے نورِ سحر چہرے سے تیرے
اور شب کی رونق زلفوں سے

اللہ اللہ اللہ اللہ
اللہ اللہ اللہ اللہ

کنزالکرم مولی النعم
هادی الامم لشریعته

نعمت کا خزینہ ہیں مولاؐ
گنجینۂ رحمت ہیں آقاؐ
ہادی ہیں وہ ساری امت کے
اور راہنما ہیں شریعت کے

اللہ اللہ اللہ اللہ
اللہ اللہ اللہ اللہ

سَعَتِ الشجر نطق الحجر
شق القمر باشار ته

انگلی کے اشارے پیڑ چلے
اعجاز سے پتھر بول اٹھے
اور چاند ہوا ہے دو ٹکڑے
انگشت کے ایک اشارے سے

اللہ اللہ اللہ اللہ
اللہ اللہ اللہ اللہ

☆ صحابی رسولؐ حضرت حسان بن ثابتؓ جن کے بقول "میں اپنے الفاظ سے حضرت محمدؐ کی تعریف نہیں کرسکتا تھا۔ البتہ میرے الفاظ کو حضرت محمدؐ نے قابلِ تعریف بنادیا"

جبریل آتی لیلة اسرئ
والرب دعافی حضرته

جبریلِ امیں پیغامِ خدا
لے کر آئے تھے شب اسریٰ
اللہ نے عرش پہ بلوایا
قربت کا شرف انکو بخشا

اللہ اللہ اللہ اللہ

فمحمد ناهو سیدنا
فَالعِزُّلَنَا لِاَجَابَتِهٖ

ہیں سرورؐ دیں (محمدؐ) اپنے آقا
اس نام سے اپنی عزوبقا

اللہ اللہ اللہ اللہ

الصبح بدامن طلعته
واللیل دجا من وفرته

ہے نورِ سحر چہرے سے تیرے
اور شب کی رونق زلفوں سے

سید احمد خاںؒ

نعت ☆

فلاطون طفلکے باشد بہ یونانے کہ من دارم
مسیحا رشک می آرد ز درمانے کہ من دارم

زکفر من چہ میخواہی ، زایمانم چہ می پرسی
ہماں یک جرعۂ عشق است ایمانے کہ من دارم

خدا دارم، دلے بریاں زعشق مصطفےٰ دارم
نہ دارد ہیچ کافر ساز و سامانے کہ من دارم

ز جبریلِ امیں قرآں بہ پیغامے نمی خوانم
ہمہ گفتارِ معشوق است قرآنے کہ من دارم

فلک یک مطلع خورشید دارد با ہمہ شوکت
ہزاراں مطلع ہا دارد گریبانے کہ من دارم

زبُر ہاں تا بہ ایماں سنگ ہا دارد رہِ واعظ
نہ دارد ہیچ واعظ ہم چو بُرہانے کہ من دارم

☆ ماخوذ از مقالۂ پروفسور دکتور محمد زاہد صدر شعبۂ اردو علی گرھ مسلم یونیورستی۔ (ص ۳۳)

محمد اویس جعفری ۔ (سیاٹل ۔ امریکہ)

بیعتِ نُور

موذنِ صبحِ نو کو سنیے
وہ کہہ رہا ہے، یہ دن نیا ہے
یہ مظہرِ[1] شانِ کبریائی
پیامِ رحمت، یہ نور و نکہت، تمام راحت
بڑھیں اور اس کو گلے لگالیں
کہ حاصلِ زندگی یہی ہے
خزینۂ آگہی یہی ہے
اگرچہ یہ مختصر بہت ہے
مگر غنیمت ہے اس کی مدّت
ردائے ہستی اِسی سے بُنیے
یہی ہے کشتِ عمل کا عرصہ
اِسی سے گُلہائے علم چنیے
فراغِ حسنِ ازل اسی میں
یہی کمالِ ابد کا محرم
اِسی کو کردار ساز کیجے
ہر اک گھڑی کا حساب کیجے
اور اس کی وسعت دراز کیجے
ہر ایک لمحہ کی قدر کیجے
گرفت کیجے ہر ایک ساعت
دل و نظر اس پہ وار دیجے
کہ مہلتِ تزکیہ یہی ہے

موذنِ صبح کہہ رہا ہے
وہ کل کا دن جو گزر گیا ہے
وہ اک فسانہ، وہ اک کہانی
وہ دولت گم شدہ سراسر
گرفت کی دسترس سے باہر
وہ دن ہے غرقابِ بحرِ ماضی
بھلا وہ اب کس کے ہاتھ آئی
درِ تاسف کو باز کیجے
پر اُس سے عبرت ہزار لیجے

موذن صبح کہہ رہا ہے
وہ کل کہ ہم جس کے منتظر ہیں

---

[1] بحوالہ سورۃ الانعام ۔ فالق الاصباح ۔ والعصر

بساطِ فردا کی زیب و زینت
محض تصور
حصارِ جہد و عمل سے باہر
تمام تر خواہشوں کا دفتر
نہ اُس پہ ایوانِ آرزو کی اَساس رکھیے

موذنِ صبح کہہ رہا ہے
یہ یاد رکھیے
کہ وہ جو خلاقِ دو جہاں ہے
کہ وہ جو تفسیرِ کُن فکاں ہے
وہ ذاتِ اعلیٰ بزرگ و برتر وہ سب سے بالا
ہمارے آقاؐ کا حکم ہے یہ
ہمیشہ اُس کا دھیان رکھیے
اور اُس سے اچھا گمان رکھیے
اُسی کے فرمان کے مطابق
ہمارے ایک ایک روز و شب کے یہ سارے لمحے
جو اُس کی تخلیق و ملکیت ہیں
موذن صبح کی نوا پر
وہ بیعتِ نور کر چکے ہیں

عقیل دانش (لندن۔ برطانیہ)

حمد

بحر و بر تیرے ہیں اور دشت و بیاباں تیرے
جن و انسان و ملک سب ہیں ثنا خواں تیرے

ذرّے ذرّے میں ترا نور نظر آتا ہے
دل کا آئینہ بھی اِک طور نظر آتا ہے

ہر نفس سایہ کناں سب پہ ہے رحمت تیری
رنگ بھر دیتی ہے ہر شے میں عنایت تیری

بے نواؤں کی نوا تُو ہے سہارا تُو ہے
شبِ ظلمت میں چمکتا ہوا تارا تُو ہے

تُو ہے انسان کی تقدیر بنانے والا
راستے وادیٔ غربت میں دکھانے والا

سب کا رازق ہے تو ہی پالنے والا تُو ہے
ہر مصیبت کو سوا ٹالنے والا تُو ہے

تیرے قبضے میں ہے امکان کی طاقت مولا
فکر کی سوچ کی اور حرف کی دولت مولا

خالقِ لوح و قلم مجھ پہ عنایت کر دے
میرے امکان میں تو لفظ کی دولت کر دے

محمد طارق غازی (آٹوا۔کینیڈا)

الذّٰرِیات

(قرآن حکیم کی اکیاونویں سورہ)

'الذّٰرِیات، علّمَ آدم'☆ کے ذیل میں

جن کو عطا ہوئی تھی بڑے منتخب تھے وہ
دربارِ کُن فکاں میں بہت باادب تھے وہ

دونوں جہاں کے تھے وہ سلاطینِ روح و جسم
تھا ان کا انہماک نگارِ سرائے علم

تھا ان کا عتدالِ اتم عدلِ مستقل
تھا ان کا اختیار نظامِ دماغ و دل

مامور تھے وہ خیر کی ترویج تام پر
لگ جائیں وہ دوبارہ اگر اپنے کام پر

رشتہ ابوالبشرؑ کی وراثت سے جوڑ لیں
ذروں سے کائنات کا جوہر نچوڑ لیں

شفق ہاشمی

نعت

رحمۃ للعالمین محبوبِ علاّم الغیوب
جن کی اک چشمِ کرم سے بدلے عالم کے قلوب

پرتوِ مہرِ مبیں ہے تو بھی کسبِ نور کر
ڈوبنا ہے گر تجھے اُن سرمگیں آنکھوں میں ڈوب

ہے اگر اُن کی نگاہِ لطف کی تجھ کو طلب
عیب ہوں اپنے نظر میں ہوں نہ غیروں کے عیوب

زندگی کی ہر سحر ہو اُن کی بستی سے طلوع
اور دمِ آخر ہو یارب اُن کی چوکھٹ پر غروب

اپنے آقاؐ کے تصدق جن کی بستی میں شفق
زندگی کرنی بھی اچھی موت آجائے تو خوب

☆ عَلَّمَ آدَمَ الاَسمَاءَ کُلَّھَا۔ البقرہ ۲:۳۱

سلمان غازی (ممبئی۔ انڈیا)

حمد باری تعالیٰ

میرے خدائے لم یزل تیری ثنا میں کیا کروں
قلب ونظر کی کیفیت، لفظوں میں کیا ادا کروں

عقل سے تو ہے ماورئی۔ تجھ کو سمجھ سکا ہے کون
دل میں تُو جب ہے جاں گزیں تجھ کو سمجھ کے کیا کروں

میرے ہر اک سوال پر تیرا کرم فزوں ہوا
تیری عطائے ناز سے مانگوں نہیں تو کیا کروں

وہ بھی نہیں دیا کہ جو مجھ کو نہ خوش تال تھا
جو کچھ نہیں نصیب میں اس کا میں کیا گلا کروں

سجدے میں رکھ کے سر کبھی راز کی بات کہہ سکوں
کاش یہی ہو ملتقا[1]، تجھ سے یہیں ملا کروں

تو نے جو دی تھی زندگی مجھ پہ وہ اب بھی قرض ہے
میری بساط کیا کہ میں قرض ترا ادا کروں

میری سرشت میں گناہ روزِ ازل سے ہے رقم
اُس تیرے فضل سے کروں جو بھی کروں بجا کروں

جوشِ نمو سے کیوں ابھی اُبلے نہ چشمۂ حیات
تیرے لئے میں دل کو جب درد سے آشنا کروں

لے کہ میں تیری شان میں کچھ بھی کہوں تو کس طرح
لفظ نہیں، زباں نہیں، حسنِ ادا کا کیا کروں

تیری بہشت میں اگر جائیں گے صرف صالحین
سجدے مرے جو ہوں قبول، اتنے پہ اکتفا کروں

ذلت ہے تیری ذی وقار میرا وجود کسرِ شان
عفو میں شان ہے تری کتنی بھی میں خطا کروں[2]

---

[1] ملنے کی جگہ (Rendezvous) اردو میں کوئی لفظ نہیں ملا، اس لیے پانچویں شعر میں عربی لفظ ''ملتقا'' استعمال کیا ہے۔

[2] آخری شعر میں ایک نکتہ پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ ممکن ہے کچھ قارئین کا ذہن اس طرف نہ پہنچے جس کا سبب انداز بیان کا نقص بھی ہو سکتا ہے اس لیے تشریح پیش ہے کہ اے خدا تو ذی وقار ہے لیکن گناہوں کے سبب میرا وجود تیری کسرِ شان ہے، اب شان کو باقی رکھنے کی صرف یہی ایک امکانی صورت ہو سکتی ہے کہ تو مجھے معاف کرتا رہے چاہے میں کتنے بھی گناہ کروں یعنی معاف نہ کرنے پر تیری ہی شان پر نقص آتا ہے جو محال ہے۔

سید محمد حسن زیدی

نعت

یاد آئے جو فیضانِ شاہِ اُمم
رب کے ہونے لگے مجھ پہ لطف و کرم

میں نے لکھنے کو جوں ہی اُٹھایا قلم
خود بخود نعتِ سرکارؐ ہوتی گئی

☆☆

نعت لکھنے کا جب بھی ارادہ کیا
نعت تحریر کرنے ہی بیٹھے تھے ہم

وصفِ احمدؐ ہی سے استفادہ کیا
خود بخود نعتِ سرکارؐ ہوتی گئی

☆☆

آپؐ جیسا کوئی ہو یہ دُشوار ہے
جب کہا ہم نے کھا کر خدا کی قسم

آپؐ سا یا نبیؐ کون غمخوار ہے
خود بخود نعتِ سرکارؐ ہوتی گئی

☆☆

آپؐ کا رُوئے اجمل کروں کیا بیاں
جب کہا بعد رب آپؐ ہیں ذی حشم

آپؐ کی ذاتِ اکمل کروں کیا بیاں
خود بخود نعتِ سرکارؐ ہوتی گئی

☆☆

کوئی رُوئے فلک پر نہ رُوئے زمین
جب کہا آپؐ ہی صرف ہیں محترم

آپؐ سے زیادہ ہمدردِ اُمت نہیں
خود بخود نعتِ سرکارؐ ہوتی گئی

☆☆

آپؐ سنتے ہیں سب بیکسوں کی صدا
جب کہا میری بھی سُنیئے رُودادِ غم

اے حبیبؐ خدا اشرف الانبیاء
خود بخود نعتِ سرکارؐ ہوتی گئی

☆☆

اے شہنشاہِ کونین فخرِ رُسلؐ
جب یہ نکلا زباں سے کہ کیجیے کرم

ہو نہ جائے سراجِ حیات اپنا گُل
خود بخود نعتِ سرکارؐ ہوتی گئی

☆☆

ہے دُعا نعت گوئی ہو شغلِ حسن
تھا ابھی فکر میں اک عجب زیر و بم

نعتیہ شعر قرآن کا ہوں متن
خُود بخود نعتِ سرکارؐ ہوتی گئی

عظمت کمال

نعت

تیرا چہرہ اتنا روشن دنیا کیوں گم رات میں ہے
چاند ترے قدموں میں بچھا ہے، سورج تیرے ہات میں ہے

تیرے ایک اک حسنِ عمل میں پھولوں کے گلدستے ہیں
رنگ کا اور خوشبو کا گلستاں تیری ایک اک بات میں ہے

تیری کملی کے سائے میں گرم رُتیں ، ٹھنڈے موسم
تیرے بادل ، تیری بارش ، تیری مہک برسات میں ہے

تیری زیارت میں حائل ہے گرچہ مری بے بال وپری
خاک بنوں اور تجھ تک پہنچوں ، یہ تو مری اوقات میں ہے

صبح ازل سے شامِ ابد تک سب صدیاں ان پر قربان
اتنی لذت ، اتنی حلاوت دید کے ان لمحات میں ہے

آؤ چل کر اپنی جبینیں خاکِ طیبہ پر رکھ دیں
آؤ اُن ذرّات کو چومیں ، سورج جن ذرّات میں ہے

عظمت کی دنیا اور عقبیٰ جس کے اثر سے تابندہ
میرے آقاؐ ! ایسی تجلی تیری ذات و صفات میں ہے

شارق جاوید

نعت رسولِ مقبولؐ

آپؐ ہیں چارہ گر ، سچے پیغامبر ، میرے حالات پر ، اک خصوصی نظر
اک خصوصی نظر ، میرے آفاق پر ، جلوہ حدِ نظر ، چمکے نورِ سحر

اے شہؑ انبیاء سارے شاہ و گدا ، کہتے ہیں برملا ' مصطفیٰؐ مصطفیٰؐ
آپؐ خیرا لوریٰ ، آپؐ سب سے جدا ، سب کے دل کی صدا ، آپؐ خیرالبشر

رہنمائے امم ، سب پہ لطف و کرم ، تاجدارِ حرم ، سب کا رکھیں بھرم
اے شہِؐ محترم ، کیا لکھے یہ قلم ، آپؐ رب کی قسم ، رشکِ نجم و قمر

اے رسولِؐ مبیں ، رحمت العالمیںؐ ، آپؐ سب سے حسیں ، میرے دل کے قریں
اب کہیں بھی نہیں ، لمحۂ بے یقیں ، اے شہِؐ مرسلیں ، آپؐ پر ہے نظر

در زمان و مکاں ، آپ سا ہے کہاں ؟ خامۂ بے زباں ، کیا کرے گا بیاں
صحنِ گُل میں نہاں ، اہل دل میں عیاں ، آپؐ سے دوریاں ، رو پڑے ہر شجر

اُن کے در جائیں گے ہم اگر جائیں گے ، ہم سنور جائیں گے ہم نکھر جائیں گے
کس نگر جائیں گے ، ہم کدھر جائیں گے ، ہم تو مر جائیں گے ، آپ کو چھوڑ کر

میری مشقِ سخن ، ذکر شاہِؐ زمن ، کاوشِ فکروفن ، باعثِ فخرِ من
آپ سے ہے لگن ، راحتِ جان وتن ، شارقِ بے وطن ، اب نہیں در بدر

ڈاکٹر مظہر حامد

نعت

جو نہیں دیکھا تھا دکھلایا شہِ لولاکؐ نے
اک جھلک ایسی بھی دکھلائی مجھے ادراک نے

سجدہ گاہ قدسیاں ہیں جو زمیں اس کے لیے
خود کو سجدے میں گرایا نازشِ افلاک نے

ہے یہ آقائے دوعالم ہی کا فیضانِ قدم
ہر جہاں روشن کیا اُس سرزمین پاک نے

زندگی تاریک راہوں سے گریزاں ہو گئی
جب اُجالا کر دیا دل میں درودِ پاک نے

اپنے محبوبِؐ حقیقی کی محبت دی ہمیں
کر دیا کتنا بڑا احساں خدائے پاک نے

تھا زمین و آسماں سے نورِ طیبہ ماوراء
عکس ہی پایا ہے اُس کا وسعت افلاک نے

آج تک لازم ہے مظہرؔ پیروی اس رسم کی
حجرِ اسود کو جو چوما تھا رسولؐ پاک نے

جاوید بدایونی۔ مقسط (امان)

نعت

وہاں تک جو بھی جاتے ہیں مرادیں دل کی پاتے ہیں
چلو ہم بھی مدینے چل کے قسمت آزماتے ہیں

جب اپنی نعت کے اشعار ہم سب کو سناتے ہیں
فرشتے بھی ہماری بزم میں چھپ چھپ کے آتے ہیں

اگر اک بار وہ اشکِ ندامت سے وضو کر لیں
تو ایسے عاصیوں کو بھی پیمبرؐ بخشواتے ہیں

پہنچنا ان کے روضے تک کہاں سب کے مقدر میں
وہی جاتے ہیں جن کو مُرسل اعظمؐ بلاتے ہیں

جہاں سے جائیں گے ہم دولت حُب نبیؐ لے کر
وہ ہونگے اور جو دنیا سے خالی ہاتھ جاتے ہیں

کہی جب نعت تو جاوید یوں لگنے لگا ہم کو
کہ جیسے آج فکروفن کی ہم معراج پاتے ہیں

زُہیر کنجاہی

نعت

طوفانِ حوادث میں ہے محصور سفینہ
اِک چشمِ کرم مجھ پہ بھی سرکارؐ مدینہ

اصحاب کی ہر سانس بھی ہر وقت مُعطّر
تھا مشک سے بڑھ کر مرے آقاؐ کا پسینہ

اے سرورِؐ کونین مجھے دَر پہ بُلا لیں
تڑپاتی ہے ہر دَم مجھے دُوریِ مدینہ

اعجاز عطا ہو مرے درماندہ قلم کو
آئے مجھے مِدحت کے بھی لکھنے کا قرینہ

ہر چند کہ خاطی ہوں گنہ گار ہوں لیکن
ہے آپؐ کی یادوں سے منوّر مرا سینہ

میرا تو زُہیر آج بھی ایمان یہی ہے
موت آئے مدینے میں تو مرنا بھی ہے جینا

سید حبیب اللہ بخاری

نعت

ہے یہی میری تمنا ہے مری یہ آرزو
ہو زباں پر اسم احمدؐ دل کہے اللہ ہوٗ

میں شفاعت کا ہوں طالب اے شفیع المذنبیں
دائمی بخشش ہے میری زندگی کی آرزو

چاہتا ہوں ہو مجھے حاصل ترا جُود و کرم
کر رہا ہوں اپنے اشکوں سے میں پیہم جستجو

میں سراپا غرق عصیاں بے سہارا بے نوا
پیکرِ رحمتؐ ہے تو اور شافعِ محشرؐ ہے تو

مُلتجی ہوں سہل ہو جائیں مری سب مشکلیں
حشر میں چشمِ کرم ہو جب میں آؤں روبرو

محمد طارق غازی

○

تم کہاں ، تمرین روز افزوں کہاں
حاصل شب گیسوئے شبگوں کہاں

بے فراست ، بے نظر ، بے دست وپا
میں تری دنیا کے قابل ہوں کہاں

دشت لا حاصل ہے اب جان حزیں
اب یہاں مستی کہاں مجنوں کہاں

تھامے پھرتا ہے کدو فرعون آج
مصر میں ہاماں نہیں ، قاروں کہاں

اس خرابے میں خموشی بس گئی
جان محزوں میں دل محزوں کہاں

دوستوں نے نذر دشمن کردیا
اب رگ جاں میں ہماری خوں کہاں

ہر فسانے میں کہاں افراسیاب
ہر پٹارے میں یہاں افسوں کہاں

آدمی ہے اب فقط زخم زمیں
گم ہوا یہ نسخۂ گردوں کہاں

مختلف دشت بلائے نجد ہے
غول پھرتے ہیں وہاں مجنوں کہاں

اس کی مرضی پر جھکا دے اپنا سر
اس کی مرضی میں چرا و چوں کہاں

مجمع البحرین پر کوئی نہیں
یا الٰہی خود کو اب ڈھونڈوں کہاں

جن کے پیروں میں ہے زنجیر زمیں
ان کے ذہنوں میں بھلا گردوں کہاں

کیسا صدیوں میں اندھیرا بھر گیا
یہ شب غم تو بتا کاٹوں کہاں

رہ گئی بنجر زمیں پھر خشک چشم
ابر بھی پوچھا کیا برسوں کہاں

ایسے شعروں سے بھی کچھ حاصل نہیں
پھر طبیعت بھی تری موزوں کہاں

ہے متاع شرم عصیاں ایک اشک
ورنہ طارق تم کہاں جیحوں کہاں

امین راحت چغتائی

O

پابند ہو سکے نہ کبھی ہم جہاں رہے
تہذیب نقش تھے سرِ آبِ رواں رہے

کس طرح کم ہوا خطِ پیمانہ کیا کہیں
کچھ دیر ہم بھی رونقِ بزمِ مغاں رہے

کب تک بچو گے تند ہواؤں کے زور سے
طوفاں کی زد میں کب کوئی کچا مکاں رہے

سورج ڈھلا تو ڈرنے لگے وہ بھی سائے سے
جو لوگ زیرِ سایۂ پیرِ مغاں رہے

گر عزمِ جستجو ہو تو اوجِ سما بھی کیا
بے بال و پر تھے جو وہی وقفِ فغاں رہے

یہ آگہی کی کون سی منزل ہے دوستو
ہم خود سے پوچھتے ہیں کہ اب تک کہاں رہے

راحت مفاہمت کے مزے کچھ نہ پوچھیے
ہم خار تھے گلوں کے مگر درمیاں رہے

O

مَیں ڈھونڈتا ہوں وہ لمحہ جو پھول جیسا تھا
کہ تیرے قرب سے میرا بدن مہکتا تھا

وفورِ شوقِ طلب کا بھی مرحلہ کیا تھا
سمٹ سمٹ کے ترا پیرہن نکھرتا تھا

اُسی پہ وا ہوئے اپنے مکاں کے دروازے
وہ میہماں جسے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا

وہ جان لیوا تھیں کیا ساعتیں، بتائیں کیا
وہ آئینے سے بھی جا جا کے جب اُلجھتا تھا

گزرنا مثلِ صبا پھر مرا و تیرا ہوا
وہ شاخِ گُل کی طرح ایک بار لچکا تھا

پھر اُس کے بعد کئی لوگ دھیان میں آئے
کل اپنے صحن میں اِک پھول کِھلتا دیکھا تھا

وہ رات کیسے سجاؤ کی رات تھی راحت
بگڑ بگڑ کے وہ ہر بات پر سنورتا تھا

سیّد مشکور حسین یاد

O

ہم خود کو شمار کر رہے ہیں
کیوں خود سے فرار کر رہے ہیں

کرنے کو جو کچھ نہیں رہا ہے
ہم آر کو پار کر رہے ہیں

حاضر کے حضور سے نکل کر
حاضر کو حصار کر رہے ہیں

اندر کی چھپی ہوئی خزاں کو
باہر سے بہار کر رہے ہیں

ہم دور چلے گئے تھے خود سے
نزدیک کو پار کر رہے ہیں

ہر حرف کا اپنا طنطنہ ہے
سطروں کو ستار کر رہے ہیں

خاطر میں جو لا نہیں رہے یاد
خطروں کو خمار کر رہے ہیں

O

بات برات لیے ہے
جملہ جہات لئے ہے

جس بھی ذات کو دیکھو
صف میں صفات لئے ہے

ہجر و وصال کی صورت
ہاتھ میں ہات لیے ہے

مستقبل کے سامنے
حال قنات لئے ہے

من کی مدھر آواز تو
گیت میں گات لیے ہے

ہستی ہست سے آگے
موت نہ مات لیے ہے

زلف تو یاد اس رخ پر
دن میں رات لئے ہے

محشر زیدی

O

حیات گو ہوئی آرام سے بسر پھر بھی
سکونِ دل نہ ملا قصہ مختصر پھر بھی

نہ مرگ وزیست پہ قادر نہ رہبری میں کمال
خدائی کرنے کی ہے نیتِ بشر پھر بھی

اُمڈ کے آئے بہت رنگ ونور کے طوفاں
اُسی کا حُسن رہا حاصلِ نظر پھر بھی

نگاہ اُس کے کرم پر رہی لبوں پہ سکوت
کوئی ادا نہ ہوئی اپنی معتبر پھر بھی

یہاں ہے بندِ غلامی سے بال بال بندھا
نکل رہے ہیں ارادوں کے بال وپر پھر بھی

یہ کیسا دل ہے ہوا ہے تباہ جس کے لیے
اُسی کو ڈھونڈ رہا ہے نگر نگر پھر بھی

شکوہِ قیصر ودارا پہ کیوں نگاہ کریں
عظیم تر نہ سہی اپنا گھر ہے گھر پھر بھی

زمانہ ہے مری پروازِ فکر سے آگاہ
بنا رہیگا مگر یوں ہی بے خبر پھر بھی

ہزار جان سے عاشق ہیں جس پہ ہم محشر
وہ اپنا میت نہیں بن سکا مگر پھر بھی

مضطر اکبر آبادی

o

نہیں ہے موت سے کم یہ عذاب میرے لئے
کہ بن گئی ہے حقیقت بھی خواب میرے لئے

قدم قدم پہ تمنا کے ریگ زاروں میں
سجا دیئے ہیں یہ کس نے سَراب میرے لئے

بڑھا رہی ہے، قدم، موت کی طرف میرے
یہ زندگی ہے مسلسل عذاب میرے لئے

اگر میں ہوں تری سب سے عظیم تر تخلیق
تو پھر ہے کیوں یہ جہان خراب میرے لئے

مرے اشاروں پہ یہ کس لیے نہیں چلتے
جو ہیں نجوم و مہہ و آفتاب میرے لئے

ہے مجھ سے پیار تو آ کھل کے سامنے میرے
عذابِ جاں ہے ترا یہ حجاب میرے لئے

ہیں اضطراب میں موجیں مرے لئے مضطر
ہیں دَم بخود سرِ دریا حباب میرے لئے

خالد حسن قادری لندن (برطانیہ)

o

اٹھو اور اپنے دار و رسن مشکبو کرو
بہتر ہے خامشی سے کہ کچھ ہاؤ ہو کرو

درویش بے نیازِ غمِ خوب و زشت ہے
بے آبرو کرو اسے یا سرخ رو کرو

پھینکو اُتار جامۂ پیوند کار کو
فرصت کہاں کہ بیٹھ کے اس کو رفو کرو

جائے گا اس طرف سے جلوسِ شہیدِ عشق
روشن تمام بام و در و کاخ و کو کرو

یہ مصلحت سہی مگر اتنا کہاں دماغ
تحسینِ زلف بھی کرو اور موبمو کرو

ہم سادہ دل ہیں فنِ سخن پروری سے دور
جو گفتگو بھی ہم سے کرو دو بدو کرو

حور و ملک بشر کے مقابل نہ ہو سکے
ہم سا جو کوئی ہو تو اسے رو برو کرو

شبِ خامشی سے تاروں کی چھاؤں میں کٹ گئی
اب کیا کسی سے وقتِ سحر گفتگو کرو

صابر عظیم آبادی

○

تنگ دستی میں جلائے کیا کوئی دولت کی شمع
جل رہی ہے میرے گھر میں آج بھی غربت کی شمع

ہر نظر کو بخشتی ہے تابشِ عکسِ جمال
عنبریں زلفوں کے سائے میں تری صورت کی شمع

ہو گئے ہیں گل چراغِ راہ تو کچھ غم نہیں
عنبریں زلفوں کے سائے میں تری صورت کی شمع

جل رہا ہوں آتشِ ہجراں میں پیہم اس طرح
جیسے ویرانے میں جلتی رہتی ہو تربت کی شمع

کام ہے دونوں کا جلنا اپنی اپنی آگ میں
دوستو ! پروانہ ہو یا محفلِ عشرت کی شمع

تیری یادوں کو لگا کر سینۂ صد چاک سے
رات بھر آنسو بہاتی ہے مری خلوت کی شمع

بدلے گا کروٹ زمانہ اک نئے انداز سے
ضوفشاں جب ہو گی ان کی آنکھ میں غیرت کی شمع

ہو سکے تو غم کی تاریکی کا کر لینا علاج
توڑ دے گی دم کوئی دم میں مری حسرت کی شمع

وہ کبھی افلاس کا صابرؔ نہیں ہوتے شکار
ظلمتِ غم میں جلا لیتے ہیں جو محنت کی شمع

○

دوستو ! داغِ جدائی نہیں دینے والی
یہ محبت تو رہائی نہیں دینے والی

اچھے کاموں کے صلے کی نہ تمنا کرنا
تجھ کو اعزاز خدائی نہیں دینے والی

کس طرح طور پہ جانے کا ارادہ کرتے
اُس کی صورت تو دکھائی نہیں دینے والی

موت ہی اس کا مداوا نظر آتی ہے مجھے
زندگی غم سے رہائی نہیں دینے والی

اس قدر شور ہے اس شہر کے زندانوں میں
کوئی آواز سنائی نہیں دینے والی

لاکھ الزام کی تردید عدالت میں کروں
وہ مرے حق میں صفائی نہیں دینے والی

جتنا آرام تجھے ماں نے دیا ہے صابرؔ
اتنا آرام خدائی نہیں دینے والی

پروفیسر حسن عسکری کاظمی

O

صحرا میں قدم تھا کہ مری جاں پہ بنی تھی
خوشبو کے تعاقب میں عجب تشنہ لبی تھی

اک موجِ حوادث تھی جو گزری مرے سر سے
اک خواب پریشاں تھا کہ آشفتہ سری تھی

بھولا نہیں میں اس کی جدائی کا وہ لمحہ!
طوفان تھا آنکھوں میں کہ اشکوں کی جھڑی تھی

قربت کے زمانے بھی رہے یاد نہ مجھ کو
یہ سوچ کے ملنے کی بھی خواہش نہ رہی تھی

بستی میں کہیں سایہ دکھائی نہیں دیتا
جنگل میں درختوں کی کبھی چھاؤں گھنی تھی

سب کچھ تو لٹا حرفِ غزل رہ گیا باقی
دامن میں مرے اک یہی پونجی تو بچی تھی

زردار کے ہاتھوں میں دیا ہاتھ نہ میں نے
یہ رسمِ کہن میرے گھرانے سے چلی تھی

سرِ قامت نیزہ پہ رہا راہِ سفر میں
سورج کی انی رات کے سینے میں گڑی تھی

ٹھہرا نہ کسی قریۂ بے درد میں یوں بھی
لکھی ہوئی قسمت میں حسنؔ دربدری تھی

O

ہم تشنہ لب تھے اور قدم تھا سراب میں
صحرائے بے اماں کا سفر تھا شباب میں

برسا بھی کیا کہ خشک رہیں کھیتیاں تمام
پانی کی ایک بوند نہیں تھی سحاب میں

دیکھا جو ہم نے سر میں ہوا تھی بھری ہوئی
قوسِ قزح کے رنگ سبھی تھے حباب میں

اظہارِ مدعا کے قرینے ہیں اور بھی
تم بھول کے بھی پھول نہ رکھنا کتاب میں

نشہ اسے تھا زہد کا اور عرش پر دماغ
واعظ بھی جیسے ڈوبا ہوا تھا شراب میں

کیا رہبروں سے کیجیے شکایت کہ ان دنوں
ہر فرد مبتلا ہے طلب کے عذاب میں

فرصت کسے کہ حالِ دلِ دوستاں سنے
تکیہ تھا جس پہ وہ بھی نہ آئے گا خواب میں

شامِ فراقِ یار کا منظر رہے گا یاد
پلکوں سے خوں گرا تھا حسنؔ اضطراب میں

محمود رحیم

O

مجھ کو رکھتا ہے اپنے دھیان میں بھی
اور پھر حرفِ بدگمان میں بھی

سانحہ کون سا ہُوا ہے یہاں
لوگ چُپ ہیں بھرے مکان میں بھی

شاخ پر آندھیوں کی زد میں رہے
مسئلہ تھا یہی اڑان میں بھی

وہ پلٹ کر شکار کرتا رہا
تیر آئے مری مچان میں بھی

بے ثباتی سی بے ثباتی رہی
اس زمیں پر بھی، آسمان میں بھی

چُپ کا آسیب ہے بھرے بازار
خامشی بھر گئی دکان میں بھی

اک اذیّت بھری مری بنیاد
اک اذیّت مری اٹھان میں بھی

تجھ کو سوچا خدا کو بھی سوچا
ہاں تجھے یاد رکھا گیان میں بھی

کرامت بخاری

O

غیر تو آگ لگا دیتے ہیں
اپنے اور ہوا دیتے ہیں

یادوں کے آوارہ بادل
آئینہ دھندلا دیتے ہیں

ہجر کی رات ہوا کے جھونکے
آس کا دیپ بجھا دیتے ہیں

سوچیں عمر گھٹا دیتی ہیں
فاقے فکر بڑھا دیتے ہیں

لکھتے ہیں تحریر تمنا
لکھ کے آپ مٹا دیتے ہیں

عدل انصاف عدالت منصف
حصہ اور گھٹا دیتے ہیں

محفل کو دیوانے تیرے
آہوں سے گرما دیتے ہیں

شفق ہاشمی

O

تمہاری ضد ہے کوئی تم سے خوب تر نہ لگے
مری دعا ہے کسی کی تمہیں نظر نہ لگے

نظر اٹھا کے جو دیکھوں تو جائے صبر و قرار
نظر جھکے تو کوئی جاذبِ نظر نہ لگے

وہ ایک خواب جو دن بھر بسا ہے آنکھوں میں
وہ اک خیال کہ آنکھ اپنی رات بھر نہ لگے

تمہارے شہر میں کس کس پہ اعتبار کیا
یہ اپنا حال ہے اب کوئی معتبر نہ لگے

اِدھر خزاں ہے اُدھر فکرِ آشیاں بندی
چمن نژاد، مگر شاخ پر ثمر نہ لگے

جو ہم کلام نہ ہو اس کی ہم نشینی کیا
وہ ہمسفر ہی بھلا کیا جو ہمسفر نہ لگے

سفر تمام، نہ منزل کہیں نگاہوں میں
جہاں قیام ہے اپنا وہ اپنا گھر نہ لگے

اسی کی راہ میں اپنا شفق طلوع و غروب
سرابِ راہ ہے جو اس کی رہگزر نہ لگے

O

تری زلفوں کی خوشبو سے مرے زخموں کی بو اچھی
رخِ زیبا کی رعنائی سے طبعِ نیک خو اچھی

سراپا حسن کہتے ہیں تجھے تو ٹھیک کہتے ہیں
مگر فطرت ہو جس کی خوب شے وہ خوب رو اچھی

یہ بزمِ ناز کی سرگوشیاں بارِ سماعت ہیں
وہ سننے میں بھی اچھی ہے جو سب کے روبرو اچھی

سفر کی ابتدا ہے اور تھکن سے پاؤں بوجھل ہیں
ملے گا گوہرِ مقصود گر ہو جستجو اچھی

اندھیرے جس سے روشن ہوں وہی آتش نفس اچھا
متاعِ جسم و جاں اچھی کہ شمعِ آرزو اچھی

شفق حسنِ بیاں بھی خوب اگر ہو حسنِ معنی بھی
دلوں میں جو اتر جائے وہ طرزِ گفتگو اچھی

ظفر اکبرآبادی

○

ہر روز اک سحر ہوئی پھر شام ہوگئی
یوں عمر نذرِ گردشِ ایام ہوگئی

گہرائیوں میں دل کی نہاں تھی جو تیری یاد
آ کر وہی زباں پہ ترا نام ہو گئی

وہ زندگی جو ساغرِ آبِ حیات تھی
اس سے بچھڑ کے زہر بھرا جام ہوگئی

کیجیے پھر التجائے توجہ کسی سے کیا
جب بے توجہی کی روش عام ہوگئی

ہے مختصر سا تذکرۂ مرگِ آرزو
تھی ایک شمع، گُل جو سرِ شام ہو گئی

یہ حُسنِ اتفاق بھی ہوتا رہا ظفر
کوشش ہر ایک کوشش ناکام ہو گئی

○

دھڑکنوں میں وہ چھپا ہو جیسے
ہر صدا اُس کی صدا ہو جیسے

ایک مانوس مہک یوں ہے محیط
تیری خوشبوئے قبا ہو جیسے

اب تو لُو بھی وہ سکون بخشتی ہے
تیرے دامن کی ہوا ہو جیسے

بے وفائی پہ ہیں مائل یوں لوگ
بے وفائی بھی وفا ہو جیسے

دل ہوا اس طرح رِکرچی رِکرچی
آئینہ ٹوٹ گیا ہو جیسے

یہی محسوس ظفر ہوتا ہے
وہ مجھے بھول گیا ہو جیسے

عقیل دانش (لندن۔ برطانیہ)

O

گرچہ سینے میں دبی درد کی حدّت رکھنا
اپنے چہرے پہ بھی لوحِ مسرت رکھنا

کتنا آسان ہے افکار کا چرچا کرنا
کتنا مشکل ہے یہ افکار سلامت رکھنا

خونِ دل کتنا چراغوں کو بہم پہنچائیں
صبح کے واسطے اندازۂ ظلمت رکھنا

اک نظر جس کی پلٹ دیتی ہے دل کی دنیا
ذہن میں ایسے ہی کردار کی عظمت رکھنا

بے نوا بچے کو سینے سے لگایا تھا کبھی
زادِ رہ ساتھ یہ تم بہر شفاعت رکھنا

بھیڑیئے لاکھ ملیں بھیس میں انسانوں کے
کچھ بھی ہو جائے بس انساں سے محبت رکھنا

یہ ہمیشہ سے ہے افکار کی عظمت کا امیں
تم سدا پیشِ نظر حرف کی حرمت رکھنا

مستقل کوئی ستم ہوتا نہیں دنیا میں
جس طرح کا ہو ستم سہنے کی ہمت رکھنا

راہِ اُلفت کا سفر جی کا زیاں ہے دانش
چل ہی نکلے ہو تو سادات کی عزت رکھنا

انور جہاں برنی (ایشبرن، ورجینیا امریکہ)

O

فغانِ عندلیب زار کب تک
سکوتِ لالہ و گلزار کب تک

زمانہ کر رہا ہے کچھ اشارے
کنایاتِ نگاہ یار کب تک

کبھی تو مات کھائے گا زمانہ
رہے گا بر سرِ آزار کب تک

فسردہ ہو رہی ہے بزم ہستی
مسیحائی ترا اظہار کب تک

سنو آواز کیسی آرہی ہے
اٹھو یہ لمحۂ افکار کب تک

بڑھو صبح وطن کی آرزو میں
شب دیجور کا ادبار کب تک

سنا اب بر بطِ ہستی پہ نغمے
حکایاتِ لب و رخسار کب تک

کوئی "قُم" کہہ کے دنیا کو جگا دے
گراں خوابی کا یہ آزار کب تک

رہے گا شب کی تاریکی میں انور
نہفتہ مطلع انور کب تک میں

سید صفدر حسین جعفری

○

کو بہ کو خاک اُڑا کر مجھے حیران کیا
زعم باطل نے مجھے کتنا پریشان کیا

لوٹ کر آئی مرے کلبۂ احزاں میں صدا
بازگشتِ غمِ دل نے مجھے ویران کیا

چاندنی رات بکھرتے ہوئے دیکھی میں نے
صبحدم مجھ کو ستاروں نے پریشان کیا

بوئے گل گل کے تصرف میں کہاں تک رہتی
خود پریشان ہوئی مجھ کو پریشان کیا

پہلے اس عہد ستم کیش نے مارا مجھ کو
پھر مجھے سیل بلا خیز نے ویران کیا

مجھ پہ کیا خوب کیا مری محبت نے کرم
زخم پر زخم لگا کر مرا درمان کیا

میری یادوں نے مجھے چین سے جینے نہ دیا
مجھ کو ویران کیا بے سروسامان کیا

○

بے خبر کہتے ہیں ہم سجدوں سے کیا لیتے ہیں
ہم ترا عکس جبینوں پہ سجا لیتے ہیں

کیا خبر پائیں نہ پائیں اُسے ہم اگلے برس
ہم ہر اک شب کو شبِ قدر بنا لیتے ہیں

در گزر کرتا ہے وہ ہم سے کریم ایسا ہے
خاک پہ گر کے اُسے روز منا لیتے ہیں

بے وفائی کے سبب جب نہیں اُٹھتیں آنکھیں
غم واندوہ کو چہرے پہ سجا لیتے ہیں

تاکہ چُھولے نہ کہیں نارِ جہنم بڑھ کر
دامنِ دل میں تری یاد بسا لیتے ہیں

مست رہتے ہیں مئے خوف ورجا سے صفدر
حُسنِ تدبیر سے تقدیر بنا لیتے ہیں

ڈاکٹر مظہر حامد

O

اک نظر دیکھ لینا بھی دشوار ہے
میں بھی مجبور ہوں تو بھی لاچار ہے

یاد آنا تیرا ، بھول جانا تجھے
یہ بھی آزار ہے وہ بھی آزار ہے

کس نے دیکھا تھا کس کی طرف غور سے
میں ہوں مجرم مجھے اس کا اقرار ہے

گردش آسماں سے یہ پوچھے کوئی
تیری گردش کو کیوں ہم سے پیکار ہے

تیرے جاتے ہی اے دوست ایسا لگا
جیسے در ہے کوئی اور نہ دیوار ہے

پوچھتے کیا ہو نظروں کی آوارگی
حسرتِ دید کا دل طلبگار ہے

مظہر خستہ کو جو طلب ہے تری
شاعری اس طلب ہی کا اظہار ہے

پروفیسر زہیر کنجاہی

O

تاریکیوں میں ڈوب رہا ہے جہانِ صُبح
گم چشمِ مُنتظِر سے ابھی ہے نشانِ صبح

جو رات بھر رہے سرِ مژگاں ستارہ بار
ایک ایک کر کے ٹوٹ گئے رازدانِ صُبح

یہ دِن نہیں، ہے خندۂ صُبح جمال ناز
یہ شب نہیں، ہَیں گیسوئے عنبر فشانِ صُبح

چشمِ فلک سے گرتے رہے رات بھر جو اشک
اُن کے لہو سے لکھی گئی داستانِ صُبح

رودادِ ظلمتِ شب ہجراں کے ساتھ ساتھ
اچھا رہے جو چلتی رہے داستانِ صُبح

ہم کو نصیب ہو نہ سکی ایک بھی کرَن
ہر چند عمر بھر رہے افسانہ خوانِ صُبح

اہل زمانہ قدر ہماری کریں زہُیر
ہم لوگ اِس زمانے میں ہَیں پاسبانِ صُبح

سلیم زاہد صدیقی

○

ہاتھ پکڑ کر دیکھ کے چلنا گلیوں میں چوباروں میں
ہاتھ چھٹا تو کھو جاؤ گے میلے میں بازاروں میں

کارِ محبت ختم ہوا ، اب آؤ گھر کو لوٹ چلیں
شام کے سائے پھیل چکے ہیں گلیوں میں بازاروں میں

جگنو کے ہم پیچھے پیچھے دشت جنوں میں آ نکلے
جیب و گریباں چاک ہوئے سب دامن الجھا خاروں میں

تپتے رخ پر اس کی آنکھیں ہم کو دھوکا دیتی ہیں
لگتا ہے دو پھول کھلے ہیں دہکے سرخ انگاروں میں

ہم نے بدلتے دیکھا ہے اس وقت کے ہاتھوں دنیا کو
ہم تو نہیں اصحابِ کہف جو سوتے رہے ہوں غاروں میں

اول تو بتلائیں کیا ہم اور پھر اس کا حاصل کیا؟
کل تک ہم بھی شامل تھے اس بستی کے معماروں میں

مشق تو ہم نے کافی کی ہے چھونے کی انگاروں کو
اک دن چھو کر دیکھیں گے ان ہونٹوں کو رخساروں کو

عشق و محبت روگ ہے ایسا دم کے ساتھ ہی جاتا ہے
اہلِ خرد تجویز کریں کیا، دارو ہم بیماروں کو

رات کے پیچھے دن کا آنا ، نا تردید حقیقت ہے
کالے بادل کیا روکیں گے، سورج کے اجیاروں کو

اپنے اپنے کونے میں بازار سجائے بیٹھے ہیں
شیخ و برہمن کیوں ڈھائیں گے نفرت کی دیواروں کو

وقت کا مرہم بھر دیتا ہے، زاہد ہر اک زخم مگر
دل تو یاد کیا کرتا ہے راہ میں بچھڑے یاروں کو

انوار فیروز

O

ہم لوگ تو نفرت سے مفر مانگ رہے ہیں
بس ایک محبت کا نگر مانگ رہے ہیں

آلام و مصائب سے ڈرے ہیں نہ ڈریں گے
کیا لوگ ہیں دریا میں بھنور مانگ رہے ہیں

یا رب تو مظالم سے رہائی ہمیں دے دے
ہم تجھ سے دعاؤں میں اثر مانگ رہے ہیں

یہ پنجرے میں رہتے ہوئے اچھے نہیں لگتے
یہ پنچھی ہیں، اڑنے کا ہنر مانگ رہے ہیں

جھنکار پہ سکوں کی کبھی بکتے نہیں یہ
مزدور ہیں محنت کا ثمر مانگ رہے ہیں

انوار ہیں کچھ لوگ اندھیروں کے پجاری
ہم لوگ فقط نورِ سحر مانگ رہے ہیں

O

پہنچ کے شہر میں کچھ بھی نظر نہیں آیا
یہ اور بات پلٹ کر میں گھر نہیں آیا

وہ پیڑ جس کو بڑے چاؤ سے لگایا تھا
عجیب بات ہے اس پر ثمر نہیں آیا

نہ جانے کیسی ہوائیں چلی ہیں گلشن میں
کوئی پرند کسی ڈال پر نہیں آیا

نہ جانے کون سی زنجیر اس کے پاؤں میں ہے
کہا تھا اس نے کہ آؤں گا پر نہیں آیا

شکستہ ناؤ پہ سارا سفر تمام کیا
خدا کے فضل سے کوئی بھنور نہیں آیا

سروں پہ اپنے قیامت کی دھوپ تھی انوار
ہماری راہ طلب میں شجر نہیں آیا

صوفیہ انجم تاج

O

وہ طاق وہ چھت وہ محرابیں وہ گھر وہ عمارت مانگے ہے
انگنائی میں بیلے جوہی کی خوشبو کی طراوت مانگے ہے

وہ ٹھنڈی ہوا وہ پگڈنڈی ، سبزے کی لہک ، وہ ہریالی
اور شام کی ہلکی خنکی میں جگنو کی حرارت مانگے ہے

اس رنگ برنگے موسم میں کچھ اور نہیں مانگے ہے یہ دل
ہاں انکی چشم عنایت کی تھوڑی سی رعایت مانگے ہے

اس شہر میں کیا کیا جگ مگ ہے لیکن یہ دلِ سادہ میرا
کلیوں کی کہانی مانگے ہے پھولوں کی حکایت مانگے ہے

ہو نیم کا اک چھتنار درخت اور سائے میں اس کے سبزے ہوں
اور سبزے کی نرمی پہ یہ دل سونے کی اجازت مانگے ہے

جن لفظوں کو میں نے بچپن میں گہنے کی طرح پہنا انجم
ہر لفظ مرے ہی گہنے کی اس دور سے قیمت مانگے ہے

پروفیسر اقبال گل

لائل پور، میرا شہر آرزو

(گزشتہ ۶۵ برس سے وابستہ یادیں)

اے مرکز دراز قداں ، شہر دلبراں
ہے تجھ میں دفن میری جوانی کی داستاں

میں آشنا تھا تیرے یمین و یسار سے
فصلِ خزاں سے ، نکہت بادِ بہار سے

ٹھہرے تھے جس میں آ کے محبت کے کارواں
اُس کوچہ جمال سے اٹھتا ہے اب دھواں

وہ حسن، وہ شباب، وہ چاہت وہ زمزمے
کن بستیوں میں جا بسے موسم بہار کے

وہ گفتگو کے رنگ وہ سہمے ہوئے گلے
رہ رہ کے یاد آتے ہیں الفت کے مرحلے

جب ہم ملے تھے میری غریبی کا دور تھا
رنج و الم کا تیرہ نصیبی کا دور تھا

اس کا جمال غیرتِ ماہ منیر تھا
میں اس کے شہرِ خواب میں شب کا فقیر تھا

فصلِ بہار اس کی جوانی کا نام تھا
آلام ہجر میری کہانی کا نام تھا

از بر تھیں اس کے حسن کی جس کو کہانیاں
اُس گلستاں میں خاک اڑاتی ہیں آندھیاں

وہ بے مثال حسن وہ نغمے رباب کے
وہ دلفریب دور وہ قصّے شباب کے

باقی نہیں کلام میں کچھ لذتِ بیاں
اب میں ہوں اور ہجر کی راتوں کی تلخیاں

اے چرخِ آرزو پہ فروزاں مہ تمام
کیا تجھ کو یاد ہیں مری غربت کے صبح و شام

وہ دن ہی اور تھے وہ زمانہ ہی اور تھا
میری محبتوں کا فسانہ ہی اور تھا

پھر میرے غم کدے میں فروزاں ہے اُس کی یاد — تیرہ شبوں میں ماہِ درخشاں ہے اس کی یاد
پھر رہ گزارِ شوق میں کھلنے لگے ہیں پھول — بادِ صبا ہے بوئے گلستاں ہے اُس کی یاد
اُس بے وفا کے زخم جدائی کے باوجود — غربت میں وجہ لطفِ عزیزاں ہے اس کی یاد
اک معجزہ ہے یہ مرے ذوقِ جمال کا — صحنِ خیالِ حسن میں رقصاں ہے اس کی یاد
وابستہ اُس کے نام سے راتوں کی رونقیں — خواب طرب ہے جشنِ شبستاں ہے اس کی یاد

اک خامشی کا نام ہے اُس مہ جبیں کا ذکر
اک التفاتِ پردہ نشیناں ہے اس کی یاد

جی چاہتا ہے گرمی صحرائے درد میں — میں اپنے آنسوؤں کی گھٹاؤں کو بھیج دوں
اُن گیسوؤں میں شانہ کشی کے خیال سے — عنبر فروش مست ہواؤں کو بھیج دوں
اس کے دلِ حزیں کی تسلی کے واسطے — اُس شہرِ آرزو میں دعاؤں کو بھیج دوں
اُس دلربا کو ہجر کی راتوں کے نام سے — ٹوٹے ہوئے دلوں کی صداؤں کو بھیج دوں
اک نظم اُس کے نام سے لکھوں بصد نیاز — فرطِ ادب سے اُس کی اداؤں کو بھیج دو

دشتِ شب فراق میں اے کاش میرے نام — اُس بنتِ ماہ تاب کا آئے کبھی پیام
ملنے کی خواہشیں ہوں جوانی کے خواب ہوں — لفظوں کے پیچ وخم میں محبت کے باب ہوں
ہر لفظ میں چھپی ہو کہیں بوئے پیرہن — جیسے شبِ بہار میں مہکا ہُوا چمن

اللہ کرے کہ گردشِ دوراں رکی رہے
امید التفات کی کونپل کھلی رہے

شفق ہاشمی

ارضِ امید

نہیں، یہ میرا وطن نہیں ہے !
نہیں، امیدوں کا یہ مرا وہ جہاں نہیں ہے،
جہاں مجھے موسموں کی زد سے بچانے والا
کوئی شجر سائباں نہیں ہے،
مری وفا کا جہاں کوئی قدرداں نہیں ہے،
نہیں، امیدوں کا یہ مرا وہ جہاں نہیں ہے!
میرا وطن شہرِ نو ہے،
جس کی فصیل سے جورِ ناروا کا گزر نہیں ہے،
جہاں محبت کی چاندنی ہے،
وفا جہاں دربدر نہیں ہے،
جہاں ہر اک حرف معتبر ہے
کسادِ علم و ہنر نہیں ہے
روش روش دل کشا ہے منظر
فسادِ اہلِ نظر نہیں ہے،
جہاں کسی مرغِ خوش نوا کو
کوئی غمِ بال و پر نہیں ہے،
میرا وطن شہرِ نو ہے ہمدم، مرے لہو میں نمود جس کی
مری اذانِ سحر سے پیدا کشاکشِ ہست و بود جس کی!

صوفیہ انجم تاج

(والدہ مرحومہ کی یاد میں)

چلتے پھرتے یاد آتی ہیں تری باتیں مجھے
ہر گھڑی ملتی ہیں تیرے غم کی سوغاتیں مجھے

دن کو رہتا ہے تصور تیرا میرے ساتھ ساتھ
جلوہ زا ہیں تیرے رخ کی چاندنی راتیں مجھے

تو جو زندہ تھی مجھے تھا زعمِ دانائی بہت
موت لیکن تیری آ کے دے گئی گھاتیں مجھے

دن کو اکثر گم سی ہو جاتی ہوں تیری یاد میں
رات کو مصروف رکھتی ہیں مناجاتیں مجھے

یاد آ جاتا ہے جب ہنستا ہوا چہرہ ترا
دیتی ہیں تسکین پھر اشکوں کی برساتیں مجھے

دل میں انجم کے کھلیں گے تیری یادوں کے گلاب
یعنی مرنے بھی نہیں دیں گی تیری باتیں مجھے

امین راحت چغتائی

ہائیکو نظمیں

صبح کے آنگن میں
گونجے چڑیوں کی تہلیل
خواب میں آدم زاد

گجرے چمپا کے
مالن پھر لے آئی تھی
شب بھر سویا کون !

دیوانہ حیران !
لڑکے بالے گلیوں میں
پتھر سوئے سے☆

سب کچھ کھو بیٹھی
دھن دریا سے ملنے کی
ندیا پچھتائے

آنگن میں تلسی
مرجھائی ، مرجھائی سی
دیپک جلتا ہے

باہر ایک برات
شرمائے شرمائے سے
شیشے کھڑکی کے

دیوا دیوٹ پر
جھلمل جھلمل جلتا ہے
کھڑکی کے پٹ وا

دلہن کا کمرا
بھیگی بھیگی سی خوشبو
آتش داں دہکے

☆ دیوانہ بہ راہے رود وطفلاں بہ راہے   یاراں! مگر ایں شہرِ شما سنگ نہ دارد!

صابر عظیم آبادی

رباعیات

پنجرے میں پرندہ نہیں دیکھا جاتا
مردہ ہو کہ زندہ نہیں دیکھا جاتا
پیتا ہے لہو جو بھی یہاں انساں کا
مجھ سے وہ درندہ نہیں دیکھا جاتا

☆☆☆

سینے میں الم بوئے رہیں گے کب تک
دیوانگی میں کھوئے رہیں گے کب تک
اب تم ہی بتاؤ کہ سلگتی شب میں
انگاروں پہ ہم سوئے رہیں گے کب تک

☆☆☆

مہتاب کی تنویر بدل جاتی ہے
حالات کی تصویر بدل جاتی ہے
یہ قول بزرگوں کا ہے بالکل سچّا
تدبیر سے تقدیر بدل جاتی ہے

☆☆☆

اے دوست تری بات سے گھبراتا ہوں
فرقت کی ہر اک رات سے گھبراتا ہوں
گھبراتا نہیں تیرے تغافل سے مگر
میں تیری عنایات سے گھبراتا ہوں

☆☆☆

پلکوں پہ ستارے نہیں دیکھے جاتے
دل سوز نظارے نہیں دیکھے جاتے
دکھ اپنا تو سہ لیتا ہوں ہنس کر لیکن
یہ درد تمہارے نہیں دیکھے جاتے

☆☆☆

جینے کا ہر اک ڈھنگ سکھایا جائے
جو راستہ سیدھا ہے بتایا جائے
تہذیب سے واقف جو نہیں ہیں اُن کو
حالات کا آئینہ دکھایا جائے

☆☆☆

خورشید کے جاتے ہی ستارے جاگے
بینائی جو سوئی تو نظارے جاگے
پہلے سے خبر ان کو نہیں کیا لوگو
ہم ڈوب گئے ہیں تو کنارے جاگے

☆☆☆

اب کیسے ہیں حالات تمہیں کیا لکھوں
جو دل میں ہے اک بات تمہیں کیا لکھوں
تنہائی کے لمحات میں روتے روتے
کس طرح کٹی رات تمہیں کیا لکھوں

☆☆☆

قطعات

شفق ہاشمی

رموز اقبال از ”پیامِ مشرق“

فارسی — **اُردو ترجمہ**

تنے پیدا کن از مشتِ غبارے
تنِ محکم تر از سنگیں حصارے
درونِ او دلِ درد آشنائے
چوں جُوئے در کنارِ کوہسارے

جو مشتِ خاک ہے اس سے نمو اک تن کی ہو جائے
اک ایسا تن حصارِ سنگ و آہن سے ہو طاقت ور
حصارِ جسم میں پھر ہو دلِ درد آشنا ایک
کہ جیسے چشمۂ آبِ رواں کہسار اندر

گزشتی تیزگام اے اخترِ صبح
مگر از خوابِ ما بیزار رفتی
من از نا آگہی گم کردہ راہم
تو بیدار آمدی بیدار رفتی

ستارہ صبح کا یک بار گزرا
تھا مستِ خواب میں ، بیزار گزرا
مری ناآگہی، گم کردہ راہی
وہ بیدار آیا تھا ، بیدار گزرا

چہ لذّت یارب اندر ہست وُ بود است
دلِ ہر ذرّہ در جوشِ نمود است
شگافد شاخ را چوں غنچۂ گل
تبسم ریز از ذوقِ وجود است

عجب لذت ہے یا رب زندگی میں
دل ہر ذرّہ میں جوشِ نُمو ہے
کلی نے شاخِ گل سے سر ابھارا
تبسم ریزِ ذوقِ آرزو ہے

جہاں یا رب چہ خوش ہنگامہ دارد
ہمہ را مستِ یک پیمانہ کر دی
نگہ را بانگہ آمیز دادی
دل از دل ، جاں ز جاں بیگانہ کر دی

جہاں یارب عجب ہنگامہ پرور
ملا وہ جام سب مخمور و سرشار
نظر ملتی تو ہے باہم نظر سے
مگر دل دل سے، جاں سے جاں ہے بیزار

نقد و نظر

کتاب : اردو ادب ۔۔۔ تہذیب و تنقید

مصنفہ : ڈاکٹر شمیم طارق

مبصر : سید منصور عاقل

ناشر : مثال پبلشرز ۔ امین پور بازار فیصل آباد

قیمت : ۲۲۰ روپے

تحقیق و تنقید دو ایسے شعبے ہیں جو ادب کے معیار و کردار کے پروردگار بھی ہیں اور حرمت و عظمت کے ضامن بھی۔ ایک زمانہ تھا کہ اردو زبان و ادب کے ان شعبوں کو بے بضاعتی پر محمول کیا جاتا تھا۔ لیکن اب اس ضمن میں ایک توانا و ارتقا پذیر تسلسل نظر آتا ہے۔ البتہ تخلیقی رجحان معیار سے زیادہ مقدار پر مرکوز ہے جس کے اثرات نثر سے زیادہ شعری اصناف پر مرتب ہو رہے ہیں غالباً اس کا اہم سبب کلاسیکی ورثے سے خاصی بے خبری ہے۔ اس طرف نسلِ نو کو سنجیدہ توجہ دینا پڑے گی۔ ورنہ شعری دواوین کی تعداد تو بڑھتی رہے گی لیکن تنقید کے ارتقا پذیر معیار انھیں مسترد بھی کرتے رہیں گے۔

مجھے یہ احساس ڈاکٹر شمیم طارق کی زیرِ نظر کتاب کے مطالعہ سے ہوا۔ ان کا تنقیدی شعور پختہ اور وسعتِ مطالعہ سے مالا مال ہے۔ مصنفہ نے کتاب میں اپنے دس مطبوعہ مضامین شامل کیے ہیں جن میں سے بیشتر تنقید و تحقیق کی تاریخ کے جائزے پر مشتمل ہیں جن سے خاص طور پر جامعات کی سطح کے طلباء و طالبات استفادہ کر سکتے ہیں۔ کتاب میں اردو زبان و ادب کے تدریجی فروغ کے متوازی عہد بعہد کی تخلیقات کا جس بلاغتِ نظر سے جائزہ لیا گیا ہے وہ مصنفہ کی اصابتِ رائے کا

مظہر ہے اس سلسلہ میں ان کا پہلا اور آخری مضمون خاصے اہم ہیں۔

ڈاکٹر شمیم نے زبان اور ادب کی نشو ونما میں صوفیاء اور اُمرا کے بنیادی کردار کو معتبر حوالوں اور مثالوں سے واضح کیا ہے۔ شیخ فریدالدین گنج شکرؒ کے ''ملفوظاتِ اولیاءؒ'' کا حوالہ شیخ شرف الدین بوعلی قلندرؒ کے دو ہے۔ حضرت امیر خسروؒ کی فارسی و ہندی الفاظ کے امتزاج پر مشتمل مقبولِ خاص و عام شاعری ہی نہیں بلکہ مصنفہ نے کبیر اور گورونانک کے کلام میں اسلامی عقائد وافکار کی طرف توجہ دلائی ہے اور اپنے دعوے کے ثبوت میں حافظ محمود شیرانی کی تحقیق ''پنجاب میں اردو'' سے بھگت کبیر سے متعلق درج ذیل عبارت نقل کی ہے:

''ہندی زبان کا درحقیقت پہلا بڑا شاعر ہے۔ اس کا کلام سادگی، تاثیر، صفائی، جدت، معنی آفرینی، سوز وگداز اور شیرینئ ادا کے اوصاف سے آراستہ ہے۔''

اُمراء کی شعری ولسانی سرپرستی کے حوالے سے ڈاکٹر شمیم نے گولکنڈہ۔ اور بیجاپور کے بہمنی سلاطین کا ذکر کیا ہے جنھوں نے اہلِ قلم صوفیاء کی سرپرستی کی۔ عادل شاہ کے عہد میں حضرت برہان الدین جانم کی تصانیف ''ارشاد نامہ'' ''منفعت الایمان اور ''وصیت الہادی'' قابل ذکر ہیں۔ بہمنی سلطنت میں فخر الدین نظامی کی مشہور مثنوی 'کدم راؤ پدم راؤ' تخلیق کی گئی ابراہیم عادل شاہ ثانی کے عہد میں اردو کو سرکاری زبان کی حیثیت دی گئی۔ عادل شاہ کے دربار کا 'ملک الشعراء' نصرتی تھا۔ اسی کے دور میں سید میران شاہ ہاشمی کے قصائد اور مثنوی کے علاوہ غزل کی شہرت بامِ عروج کو پہنچی۔ بیجاپور کی سلطنت کے قیام کے تقریباً اٹھارہ سال بعد قطب شاہی سلطنت کی بنیاد پڑی اس سلطنت کے اکثر بادشاہ خود شاعر تھے۔ سلطان قلی قطب شاہ اردو زبان کا پہلا صاحب دیوان شاعر ہے۔ اس کے دربار سے وابستہ شعراء میں شیخ احمد گجراتی اپنی مثنویوں ''لیلیٰ مجنوں'' اور ''یوسف زلیخا'' کے لیے بہت مشہور ہیں۔ قلی قطب شاہ کے دربار کا ملا وجہی ''ملک الشعراء'' تھا جس کی مثنوی ''قلب مشتری'' نثری تخلیقات ''سب رس'' اور ''تاج الحقائق'' معروف کتب ہیں۔

مصنفہ نے اپنے مقالے میں صوفیاء اُمراء کی ادب دوستی کے تقریباً تمام عنوانات کا اجمالاً

جائزہ لیا ہے اور اہل علم میں دیگر کے علاوہ ابن نشاطی اور غواصی کی تخلیقات کے حوالے دیے ہیں۔ انھوں نے میر وسودا کی شاعری کا بھی سماجیاتی جائزہ نہایت دقتِ نظر سے لیا ہے اور کہا ہے کہ ''میر وسودا کا دور اُس انتشار کے دور سے تعلق رکھتا ہے جب برصغیر کی سلطنت میں اندرونی سازشوں کے ساتھ ساتھ نادر شاہ اور احمد شاہ جیسے وحشی حملہ آوروں نے دلّی کی اینٹ سے اینٹ بجادی تھی۔ یہ وہ حالات تھے جن میں میر اور سودا نے اپنے عہد کا کرب، انتشار اور اضطراب اپنے شعروں میں بیان کیا'' میر کا درج ذیل شعر اسی حقیقت کی تصدیق کرتا ہے

شہاں کہ کحلِ جواہر تھی خاکِ پا جن کی　　　　انھیں کی آنکھوں میں پھرتی سلائیاں دیکھیں

مصنفہ نے ''لکھنوی تمدن اور اردو شاعری'' کے زیر عنوان لکھا ہے کہ ''لکھنوی معاشرہ ایک افسانوی معاشرہ تھا'' مصنفہ کا یہ جملہ ادب وشاعری کے اُس معروضی احوال کا ترجمان ہے جو سلاطین اودھ کے درباروں میں شعری ابتذال کی علامت بن گیا تھا۔ اور بقول رام بابو سکسینہ ''شعراء نے اپنے ہاتھوں خود کو ذلیل کرلیا'' ڈاکٹر شمیم نے لکھنؤ کی ہوس گزیدہ شاعری کے اس دور میں دیا شنکر نسیم کی مثنوی ''گلزار نسیم اور نواب مرزا شوق کی ''زہر عشق'' کو اردو شاعری کا بجا طور پر اثاثہ قرار دیا ہے۔ انھوں نے صنف مرثیہ میں انیس و دبیر کو خراج تحسین پیش کیا ہے، جنھوں نے مرثیے کو معراج کمال تک پہنچایا۔

کتاب کے زیر نظر مضامین میں (۱) ''اکبر، اقبال اور تہذیبِ فرنگ (۲) ''نو آبادیاتی دور میں کلاسیکی اصناف کا زوال' (۳) سرسید تحریک اور ادبی تغیرات (۴) ترقی پسند انتقادی معیارات اور (۵) 'تحقیق و تدوین ۔۔ بنیادی اصول اور مباحث' بصیرت افروز مضامین ہیں۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد کے حالات کا معروضی جائزہ لیتے ہوئے ڈاکٹر شمیم طارق اُن تین طبقات پر توجہ مرکوز کرتی ہیں جو ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے ردعمل کے طور پر ہندوستانی معاشرے میں واضح طور پر نظر آرہے تھے۔ پہلا طبقہ اجنبی تہذیب اور مقامی معاشرت میں ہم آہنگی کا خواہاں۔ دوسرا نئی تہذیب کو قبول کرنے سے منکر اور تیسرا نظام نو کا مخالف۔ رسالہ ''اودھ پنچ'' اس طبقہ کا ترجمان

تھا اور سر سید کی تحریک کا شدید مخالف۔ اکبر الہ آبادی مشرقی تمدن کے قصرِ عالیشان کے انہدام پر سخت رنجیدہ تھے اور اسی وجہ سے سر سید کے مخالف تھے۔ اس سلسلہ میں مصنفہ نے ڈاکٹر وزیر آغا کے حوالے سے لکھا ہے کہ وہ اکبر کی مغرب پر تنقید کو ان کا احساس کمتری سمجھتے تھے لیکن اس کے ساتھ ہی ڈاکٹر تحسین فراقی کا یہ قول بھی نقل کیا ہے۔

"اکبر کی شریعت کا اقبال تسلسل ہیں جس طرح حضرت عیسیٰ سے پہلے یوحنا نے ظہور کیا، اقبال سے پہلے اکبر نے ظہور کیا"

اس قول کی تصدیق میں ڈاکٹر تحسین نے علامہ کے ایک خط کا حوالہ دیا ہے چنانچہ ڈاکٹر شمیم کہتی ہیں:

"اقبال کا اکبر کو اپنا پیرو مرشد تسلیم کرنا اپنی جگہ لیکن اس حقیقت سے بھی انکار ممکن نہیں کہ تہذیب مغرب پر اقبال کی تنقید میں جو عمق اور وسعت ہے وہ ان کے پیش رو کے ہاں خال خال ہے۔"

مصنفہ کا مزید یہ کہنا کہ "کسی بھی عہد یا خطہ مین مروج شعری اصناف کی تشکیل صرف بحور، عروضی نظام یا قوانی کی ترتیب کے باعث نہیں ہوتی بلکہ اس کے مزاج اور ماحول سے متشکل ہوتی ہے" اپنی جامعیت کے اعتبار سے ایک عالمگیر صافت کے مصداق ہے۔ اس سلسلے میں وہ دیگر نقادوں مثلاً ڈاکٹر عبادت بریلوی، مجتبیٰ حسین، گوپی چند نارنگ اور ڈاکٹر جمیل جالبی وغیرہ کی آرا پیش کر کے اپنے نقطۂ نظر کو کہ نو آباداتی دور میں کلاسیکی اصناف روبہ زوال رہیں معاونت فراہم کرتی ہیں، وہ سر سید اور اُن کی تحریک کو خراجِ تحسین پیش کرتی ہیں۔ رہا ترقی پسند اقتصادی معیارات کا سوال تو مصنفہ یہاں بھی اپنے مطالعہ کی بنا پر اپنی رائے کا اظہار کرتی ہیں ان کے خیال میں ترقی پسند ناقدین میں سب سے اہم نام اختر حسین رائے پوری کا ہے جنھوں نے اپنی کتاب "ادب اور انقلاب" میں ترقی پسندی کا مفہوم واضح کیا۔ سجاد ظہیر ترقی پسند تحریک کے روح رواں تھے اور بحیثیت ناقدین احتشام حسین اور مجنوں گورکھپوری کے نام بھی بہت وقیع اور معتبر ہیں۔ ان کے

خیال میں علی سردار جعفری نے اپنی کتاب ''ترقی پسند ادب'' لکھ کر خود کو تحریک کے لیے ناگزیر بنالیا تھا۔ جب کہ ممتاز حسین کے بارے میں یہ قول نقل کیا ہے کہ انھوں نے ترقی پسندوں کی 'بوطیقا' (poetics) لکھی ہے تاہم اس سلسلہ میں عزیز احمد کے نام کو ڈاکٹر شمیم قابلِ قدر سمجھتی ہیں۔ عزیز احمد نے شاعری اور فکشن پر تنقید کی جب کہ وہ خود بھی ایک اعلیٰ پائے کے ناول نگار تھے۔

ڈاکٹر شمیم فیض صاحب کو بحیثیت شاعر ترقی پسندوں میں زیادہ معتبر سمجھتی ہیں اور ان کے مجموعہ مضامین ''میزان'' کو اُن کی ترقی پسندی کا ثبوت! دیگر ناقدین جن کا انھوں نے اس ضمن میں توصیفی ذکر کیا ہے ان میں آلِ احمد سرور، سید وقار عظیم اور ڈاکٹر عبادت بریلوی شامل ہیں۔

زیرِ نظر کتاب کا آخری باب ''تحقیق و تدوین'' سے متعلق ہے جس میں وہ ڈاکٹر عبداللہ سمیت دیگر اساتذۂ ادب کی آراء کی روشنی میں ادب میں تحقیق و تدوین کے بعض اہم اور بنیادی اُصول بیان کرتی ہیں جو یقیناً تحقیق کی دنیا کے نوواردوں کو بامعنی رہنمائی مہیا کرسکیں گے۔ ڈاکٹر شمیم طارق کی زیرِ تبصرہ کتاب کو بلاشبہ اُن کے فنی شعور کا درخشاں دیباچہ کہا جا سکتا ہے جس میں مستقبل کے بے پناہ امکانات کی نشان دہی ہوتی ہے۔

نام کتاب : جوش ملیح آبادی (شخصیت، افکار اور زبان و بیان)

مصنف : ڈاکٹر یحییٰ احمد

مبصر : پروفیسر اقبال گل

ناشر : نیا زمانہ پبلی کیشنز ٹمپل روڈ لاہور

قیمت : ۴۰۰ روپے

ڈاکٹر یحییٰ احمد کا مقالہ (جوش ملیح آبادی شخصیت، افکار اور زبان و بیان) اُن کی تحریر، تحقیق اور گرفت کو بصیرت کی حدوں تک لے جاتا ہے۔ انھوں نے ایک سو پینتیس عنوانات کے تحت جوش

کی ولادت سے لیکر موت تک چھوٹے بڑے اہم اور غیر اہم واقعات، اُن کی شاعری کا امڈے ہوئے بادلوں کی طرح دل کی وادیوں پر چھا جانا، رقص کرتے ہوئے الفاظ، نغمہ بار بحریں، مضامین شعر کا حیرت ناک تنوع، روانی جس کو جوئبار خیال کی لہریں اٹھ اٹھ کر دیکھیں نیز اُن کی اَن گنت فنکارانہ خوبیوں کو اپنی تیز بیں نگاہوں سے ہر صفحہ نہیں' ہر پیراگراف نہیں' ہر سطر نہیں، بلکہ ہر لفظی ترکیب میں یوں اجاگر کیا ہے کہ پڑھتے جایئے اور محظوظ ہوتے جایئے۔ مقالے کی عبارت میں وہی تازگی اور روانی ہے جس کا شاعرِ شباب متقاضی ہے جوش کے کلام کے بارے میں مشاہیر کی آرا چاہے وہ متضاد ہیں یا حق میں 'من وعن پیش کردی گئیں ہیں۔ ایسے اشعار، الفاظ اور تراکیب جو شاعر کی شخصیت کو استعجاب کے دریچے میں لا کھڑا کرتی ہیں بلا تامل لکھ دی گئی ہیں۔ خوبصورتی اور بدصورتی دونوں کو ہم قدم چلتے دکھایا گیا ہے۔ تقریباً ہر دوسرا تیسرا صفحہ اشعار کی دھنک سے مزین دکھائی دیتا ہے۔ شاعر کی زندگی کے معلوم اور کچھ نامعلوم واقعات جو یادوں کی برات میں بچپن سے فروغ پیری تک پھیلے ہوئے ہیں ان کو بڑی وضاحت سے فکر ونظر کے حوالے کردیا ہے۔ جوش صاحب نے اپنے اٹھارہ معاشقوق کا ذکر کیا ہے مگر ہمارے محقق نے اُن کا ستر برس کی عمر میں انیس واں عشق بھی دریافت کرلیا۔ ''یہ فتنۂ آخر الزماں لاہور کے ایک کالج میں پڑھاتی ہیں۔''

ڈاکٹر یحییٰ نے جوش کے اشاعت شدہ شعری اور نثری سرمایہ کی علاوہ ان کے غیر مطبوعہ نثر کا حوالہ اور خاکہ بھی سپردِ قلم کردیا ہے۔ تاکہ مستقبل کے نقاد شاعر کے ادبی خزانے کا کھوج لگا سکیں۔ مصنف کا کہنا ہے کہ میرا موضوع ''جوش کی زبان ہے'' درست مگر ڈاکٹر صاحب نے ان کی زبان کے علاوہ ان کے افکار و گفتار کو اجاگر کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ موجود حوالوں اور مواد کو پیش نظر رکھتے ہوئے بڑی دیانت داری سے صاحبانِ دانش کی آرا کو پیش کرکے اپنے مقالے کو ادبی سند کے درجے تک پہنچا دیا ہے۔ جوش کی نظموں کے موضوعات سے وابستہ حوالے ہر مقام اور ہر سطح پر موجود ہیں۔ جن نظموں نے جوش کو شاعرِ شباب اور شاعرِ انقلاب کی منزل تک پہنچایا ہے ان کے تذکرے نے مقالے کے نثری حصوں کو ایسا توجہ طلب بنا دیا ہے کہ قاری کی توجہ ایک لمحے

کے لیے بھی منتشر نہیں ہوتی۔ کیونکہ جوش ساغر بدست بادہ خانے کے دروازے پر کھڑا دعوت سے نوشی دیتا رہتا ہے۔ جن شعرا کے کلام، الفاظ و بیان، فکر و نظر، انسانی رشتوں کی بُنت لہجہ و گفتار سے شاعر متاثر نظر آتا ہے۔ اُن میں ٹینی سن کے علاوہ حافظ، خیام، ٹیگور، انیس اقبال، فیض، نذر الاسلام اور غنی خان قابلِ ذکر ہیں۔ مقالہ نگار کی رائے ہے کہ جوش کو اقبال کا ہم پلہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ اور یہ رائے بھی لکھ دی ہے کہ ایک گروہ جوش کو شاعر تک تسلیم نہیں کرتا۔ جب کہ حقیقت یہ ہے کہ دونوں بڑے شاعروں کے فکری دھارے مختلف سمتوں میں بہتے ہیں منظر کشی میں جوش ایک بے مثل نقاش ہے Moving Images میں وہ انیس کے شانہ بشانہ دکھائی دیتا ہے۔

یہ بحث کہ کون کس مقام پر فائز ہے ادبی تنقیدی حلقوں میں باعث گرمیٔ بازار رہی ہے اور رہے گی۔ مصنف نے بعض صف اول کے شعرا سے جوش کا موازنہ بھی کیا ہے ایسے موازنے کو مختلف زاویہ ہائے نگاہ سے دیکھنے والے دانش ور موجود ہیں۔ دراصل ہر فنکار اپنے تخیل ندرت بیان لب و لہجہ، تمثیل نگاری، مظاہر فطرت کی عکاسی، انسانی جذبات کی ترجمانی اور خیال حسن میں حسنِ عمل کے اعتبار سے اپنا مقام خود پیدا کرتا ہے۔ موازنے میں ذاتی پسند وناپسند کے عناصر کا سایہ فگن ہونا ناممکنات میں سے نہیں ہے موازنہ انیس و دبیر کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ حالانکہ دونوں عظیم مرثیہ نگار ہیں۔ جوش کی شاعری میں الفاظ کا طلسم اور الفاظ کے ناز نخرے شاعر کے تابع فرمان رہتے ہیں۔ جوش صاحب کی اپنی رائے یہ ہے کہ ''الفاظ کو کاغذ پر روشنائی کی لکیریں مت سمجھو۔ نہ تو وہ بے جان لکیریں ہیں اور نہ ہی ہوا میں گرہیں الفاظ تو ذی حیات ہیں، انسانوں کی طرح ذی حیات الفاظ بھی آدمیوں کی طرح پیدا ہوتے ہیں، اور مرتے ہیں، بیمار پڑتے اور تندرست ہوتے ہیں، بڑھتے گھٹتے ہیں گوشہ نشیں رہتے ہیں اور سفر کرتے ہیں۔''

اپنے مقالے میں بیان کردہ نکات کی ترتیب کو سمیٹتے ہوئے ڈاکٹر یحییٰ اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ جوش زبان کا بادشاہ فطرت نگار مجاہد آزادی، شاعرِ انقلاب، شاعر شباب و شراب، صبح پرست مفکر العصر، فارسی پسند، رجز خواں کے علاوہ رنگیں نثار اور قادر الکلام شاعر ہے۔ اردو میں جس کی

شہرت عالم گیر ہے اپنی کاوشوں کو ضابطۂ تحریر میں لانے کے لیے مقالہ نگار نے اپنے ذوق جستجو، تحقیق سے قلبی لگاؤ، اردو زبان سے عشق اور اس کے مختلف ادوار سے فکری وابستگی کا اظہار کر کے دیارِ حسن کے تاجدار، حافظ اور خیام کے ہم پلہ شاعر کی توقیت اور سخن وری کے محاسن گنوا کر اردو ادب کی قابلِ تکریم خدمت سرانجام دی ہے۔ مقالے کی قدر و قیمت اور توصیف اپنی جگہ، اسے تو اردو کے غریب الوطن شاعر کے لیے ایک ادیب کا عظیم الشان خراج تحسین سمجھنا چاہیے۔ جس خراج تحسین سے وہ اپنی زندگی میں سیاسی، لسانی، گروہی اور مسلکی وجوہات کی بنا پر محروم رہا۔ میں سمجھتا ہوں وقت کا پروردگار جوش پر قصرِ شہرت کے دروازے کبھی بند نہیں کرے گا۔

کتاب : بے گیان گوتم

مصنفہ : منیرہ ہاشمی

مبصرہ : نعیم فاطمہ علوی

ناشر : پورب اکادمی۔ اسلام آباد

قیمت : ۱۹۵ روپے

احمد شمیم کی خوبصورت نظم ''کبھی ہم بھی خوبصورت تھے'' نیرہ نور نے اپنی مترنم آواز میں گا کر امر کر دی ہے۔ اسی طرح منیرہ، احمد شمیم سے وابستہ ہوئی تو حسن و جمال کے اس شاعر کے سحر میں پوری طرح ڈوب گئی۔ بیوی جب شوہر کو استاد اور دوست کے منصب پر فائز کرتی ہے۔ تو گویا محبت اور احترام کی ساری منزلیں طے کر لیتی ہے۔ من وتو کا فاصلہ ختم ہو تو تکمیل محبت فنا کا پیش خیمہ بن جاتی ہے۔ قربتوں نے فاصلوں کا انتخاب کیا تو منیرہ نے جدائی کے اِن لمحوں کو قلم کی طاقت بنا کر کہانیاں تخلیق کرنی شروع کر دیں۔

دکھ کی کوکھ سے جنم لینے والی زندگی کو مایوسی سے بچالیا جائے تو شعور کی ایسی شمع جل جاتی ہے۔ جو درویشی کی طرف راستہ دکھاتی ہے۔ تنہائی، اداسی، ادھورا اور اکیلا پن یا تو انسان کو مایوسی کی طرف لے جاتا ہے۔ یا پھر م فلسفی بنا دیتا ہے آگہی سے زندگی کے تہہ در تہہ پہلوؤں کے وہ گوشے آشکار ہو جاتے ہیں۔ جو تمام لوگوں کی زندگیوں سے اوجھل رہتے ہیں۔

''کیا تصویروں اور یادوں کے ساتھ زندگی کی خواہش پوری ہو سکتی ہے۔ زندگی تو باتیں کرتی ہے۔ باتیں سنتی ہے۔'' منیرہ کی زیر نظر کہانیاں، لڑکے اور لڑکی کے درمیان ابھرتے جوان جذبوں کی کہانیاں ہیں۔ جنہیں زندگی کے مختلف واقعات سے اخذ کیا گیا ہے۔ پیار اور محبت کی دھیمی دھیمی آنچ پر پختہ تر جذبے اسلوب کے حسن سے آشنا ہیں اور ان کہانیوں کو حکیمانہ طریقے سے الجھایا اور سلجھایا گیا ہے۔ جذبوں کی اُن سچائیوں کو موضوع بنایا گیا ہے جو حقیقت کے بہت قریب ہیں۔

محبت ہر رنگ ہر روپ ہر زمانہ اور ہر نسل کے اندر نیا جنم لیتی ہے۔ ''آنگن میں کالی دھوپ'' کی کہانی زندگی کے اس لیے قریب لگی۔ کہ زندگی بھی تو ادھوری، تشنہ، نامکمل، آس، اُمید اور سمجھوتوں کے درمیان پھیلی ہوئی ایک زنجیر ہی ہوتی ہے۔ جس کی تصویر منیرہ نے بڑی عمدگی سے پیش کی ہے۔ اتصال کے ان چند لمحوں کو جن میں ماضی بھی شامل ہے حال بھی اور مستقبل بھی ان چند لفظوں میں بیان کر کے کہانی مکمل کر دی۔

''لیکن کبھی کبھی یہ دِل کھنڈر کی طرح ویران سا لگتا ہے۔ منصور کے باجود''

''عہد وفا'' بھی مایوسی کے گھٹا ٹوپ اندھیرے سے روشنی کی طرف کا وہ سفر ہے جو سچے جذبوں پر مبنی ہے۔

''یہ کاغذ کے ٹکڑے بعض دفعہ محاذ پر دوا اور روٹی سے زیادہ اچھے ہوتے ہیں۔''

''وحشت تنہائی'' لندن میں انسانوں کے بکھرے وجود خاص طور پر وہ وجود جو مشرقی تہذیب کے تانے بانے میں بُنے گئے ہوں۔ اور یورپ میں جا بسی تہذیبوں کے تصادم میں اچھے ذہن کی منتشر سوچیں اس کا مرکزی خیال ہے۔

منیرہ کی کہانیوں کا تانا بانا رُومانیت کے اردگرد گھومتا ہے۔ وُہ جدائی اور وصل کے جذبوں کی شدت کو جذب کر کے لفظوں کی مالا پرونا جانتی ہیں۔

ان کی کہانیوں میں محبت کبھی راہ چلتے ہوئے کبھی کسی پب میں۔ کبھی کسی گھر کے سُونے کمرے میں، کبھی شراب کے بھرے جام میں کبھی قرآن پڑھنے ولی ماں جی کے زیرِ سایہ کبھی لندن کی ٹھٹھری سردی میں، کبھی مجبوری میں، کبھی آسودگی میں، کبھی راحت کے لیے، کبھی سکون حاصل کرنے کے لیے، کبھی بے چینی کا سدِ باب کرتے ہوئے اور کبھی بے چینی اور اضطراب بڑھانے کے لیے کبھی دکھ کم کرنے کے لیے، اور کبھی دکھ بڑھانے کے مدّ و جزر طے کرتی ہوئی پروان چڑھتی ہے۔ محبت اور جدائی کا ہر رنگ اُن کی کہانیوں می نمایاں ہو کر ابھرتا ہے۔ قلم ہاتھ میں پکڑانے والے کی قربت اور جدائی میں لکھی ہوئی کہانی پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ سچے جذبے بے لگام گھوڑے کی طرح منہ زور اور ایسا جادو ہوتے ہیں جو سر چڑھ کر بولتا ہے۔

کتاب : جدا منزلیں جدا راہیں

مصنفہ : شاہین زیدی

مبصرہ : نعیم فاطمہ علوی

ناشر : علم و عرفان پبلشرز لاہور

قیمت : ۲۰۰ روپے

جدا منزلیں، جدا راہیں دو کہانیوں کے گرد گھومتا ہوا شاہین زیدی کا یہ ناول مختلف مراحل طے کر کے بخیر و خوبی اپنے انجام کو پہنچتا ہے۔ رحمان ولاز کی کہانی اونچے طبقے کے ایسے گھرانے کی کہانی ہے جو مختلف برائیوں میں مبتلا ہو کر رشتے ناطوں کو ہی بھول جاتی ہے۔ یہ کہانی اونچی سوسائٹی کے کھو کھلے جذبات کی پوری طرح نقاب کشائی کرتی ہے۔

دوسری کہانی جس کا پہلی کہانی سے کوئی رابطہ یا تعلق نہیں ہے ایک شریف عورت کے طوائف کے کوٹھے تک پہنچنے کی داستان ہے۔

دونوں کہانیوں میں بظاہر کوئی تعلق نہیں لیکن دونوں کو جس طرح ملا کر ناول تخلیق کیا گیا ہے۔ اُس میں اس طرح ربط پیدا کیا گیا ہے کہ رحمان ولاز کی کہانی جہاں ختم ہوتی ہے اُس کو چھوڑنے میں اور رضیہ کی کہانی شروع ہونے میں قاری الجھتا نہیں بلکہ تسلسل کے ساتھ پڑھتا چلا جاتا ہے اور کوئی تجسس پریشانی کا باعث نہیں بنتا بنیادی طور پر یہ ایک اصلاحی ناول ہے۔ جس میں اصلاح کا پہلو ہر جگہ نمایاں ہے۔ معاشرتی پس منظر میں دیکھا جائے تو رحمان صاحب کے کردار میں کافی جھول نظر آتا ہے۔ ناول کے دو بنیادی کردار رضیہ اور کامران معاشرے کے اچھے کردار بن کر ابھرتے ہیں۔ مگر باقی کردار واضح ہو کر نمایاں نہیں ہوتے۔ رومانس اور منظر نگاری ناول کا اہم جز نہیں۔ شروع کے صفحات میں چھپائی کا نقص مفہوم کو واضح کرنے میں رکاوٹ کا باعث بنتا ہے۔

رحمان ولاز کی کہانی بنیادی طور پر ایک ایسے خاندان کی کہانی ہے جو بھرپور برائیوں کے ساتھ زندگی کے مزے لوٹتا ہے۔ اور پھر ایک فرشتہ صفت اولاد کی وجہ سے اُس کا انجام بھی بخیر ہو جاتا ہے۔ یہ کئی سوالیہ نشانوں کو جنم دیتا ہے۔ کہ کیا انسان کسی معجزے کے انتظار میں برائیاں کرتا رہے یا پھر رشتوں کے احترام میں ظالموں کو معافی دے کر اُن کے ہاتھ مضبوط کرتا رہے۔ البتہ رضیہ کی کہانی کا انجام فطری محسوس ہوا۔ ہر ایک نے اپنی نیت اور اپنے اعمال کی سزا یا جزا بھگت لی۔ مجموعی طور پر یہ ایک اچھا ناول ہے۔ جس کی زبان سادہ، عام فہم ہے۔ تسلسل میں کہیں جھول نہیں۔ دونوں کہانیاں روانی کے ساتھ آگے بڑھتی ہیں۔ اور قاری کی توجہ کا باعث بنتی ہیں۔

مراسلات

محمد طارق غازی۔ آٹوا۔ کینیڈا

الاقرباء کی بڑی علمی شان ہے۔ یہ فقط مجلہ نہیں درحقیقت دنیائے اردو کے بہت ممتاز اہل علم کی انجمن ہے جس میں حاضری خود میرے لئے باعث عز وافتخار ہے، ورنہ میں کیا اور میری تحریریں کیا۔ آپ کا انتہائی کرم ہے کہ ان تحریروں کی پذیرائی کرتے ہیں سچ پوچھئے تو مجھے خود رسالہ کا شدت سے انتظار رہتا ہے اور آئے دن سائبر صفحوں پر تازہ شمارہ کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہوں اور جب رسالہ مل جاتا ہے تو اطمینان سے پڑھتا ہوں اور علم میں اضافہ کرتا ہوں۔

تازہ شمارہ میں جناب سید انتخاب علی کمال نے تاریخ گوئی کے ایک اور پہلو پر بہت اچھا لوازمہ مہیا کیا ہے اس فن پر سید صاحب کا تحقیقی کام قابل ستائش ہی نہیں ہے بلکہ وہ شکر گزاری کے مستحق ہیں تاریخ گوئی کا فن تقریباً معدوم ہو گیا ہے، حالانکہ یہ ہماری تہذیب کا بڑا اہم حصہ تھا اس تہذیب کے سارے ہی عناصر سے ہمیں بیگانگی پیدا ہو گئی جو دنیا میں ہماری وجہ امتیاز تھے اسی لئے محترم سید صاحب کی علمی مساعی لائق صد شکر ہیں کہ اس فن کو نئی نسلوں کے لیے وہ زندہ کر رہے ہیں مراکش کے بادشاہ المنصور باللہ احمد کے قصر کے لئے جو مادۂ تاریخ کہا گیا تھا اس کے مطلع کا پہلا مصرعہ تو بڑے غضب کا، بلکہ شطر الغزل کہیئے اسے الحسن لفظ وہذ القصر معناہ (حسن لفظ ہے اور یہ قصر اس کا معنی ہے)

عرب دنیا میں اردو ادب پر پروفیسر پروین صادق کا مضمون کچھ بنیادی باتوں کا احاطہ کرتا ہے لیکن اس خطہ میں اردو میں ہونے والے کام کی وضاحت نہیں کرتا۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ان ممالک میں اردو کے اہلِ قلم کو عموماً پاکستان و ہند میں وہ درجہ نہیں دیا گیا جو انہیں مل جاتا تو اردو کا کچھ نقصان نہ ہوتا۔ دوسری طرف یہ بھی حقیقت ہے کہ ان دیسوں میں عارضی طور پر بسے ہوئے اردو شاعر و ادیب نے اپنے ادب کو مقامی یا علاقائی حالات اور کیفیات سے دور رکھا تاہم جدہ میں

مقیم شعراء۔ راؤف خلش، اعتماد صدیقی اور رسول احمد کلیمی نے اس سمت کچھ توجہ کی تھی ان میں راؤف خلش کے ہاں مقامی زندگی کا منفی پہلو زیادہ نمایاں تھا اور اعتماد صدیقی نے ثقافتی تنہائی کے درد اور بے مکانی کی کیفیت پر نسبتاً اچھے شعر کہے تھے اوصاف احمد نے نثری شاعری میں فلسطین اور عراق پر دو اچھی نظمیں کہی تھیں نثر نگاروں کا وہاں کال تھا، اگر چہ اب منیزہ جمال افسانہ نگاری کرتی ہیں اور عابد معز، علیم خان فلکی اور نادر خان سرگروہ طنز و مزاح لکھتے ہیں باقی شعرا و ادباء کو موقعہ تھا کہ مثلاً لبنان کی ۱۷ سالہ خانہ جنگی، مسئلہ فلسطین، بالخصوص صبرا اور شتیلہ کا قتل عام، صومالیہ کے دردناک حالات، اور ان ممالک میں عام زبان بندی کے معاشرتی اثرات کو موضوع بناتے تو اردو ادب میں ایک نیا پہلو ادبی تاریخ بنا سکتا تھا اور ان ادیبوں اور شاعروں کی تخلیقات کو ایوان ادب میں مناسب مقام ملتا خلیجی ملکوں میں اردو تحریروں کا پس منظر پاک و ہند کے مسلم معاشرے ہی ہیں تو شائد اسی لئے اندرون وطن ان کی پذیرائی نہیں ہوتی تاہم محترمہ پروین صادق کا مضمون اس لحاظ سے اہم ہے کہ ایک سمت کی نشان وہی تو ہوتی ہے۔

حصہ شعر میں اویس جعفری صاحب کی نظم کمال بے توفیق ان کے کمال فن کا عمدہ نمونہ ہے مسجد قرطبہ کی زمین میں اقبال کے مقام سے بات کی ہے تو زبان ہی نہیں فکر کے تیور بھی وہی رکھے ہیں جو شاعر مشرق کی خصوصیت ہے غزلوں میں امین راحت چغتائی، پروفیسر حسن عسکری کاظمی، اور صوفیہ انجم تاج کی تخلیقات تازہ کار اور اثر انگیز ہیں۔ پروفیسر خیال آفاقی کا یہ شعر بڑی گہری عمرانی معنویت کا غماز ہے۔

اب تری مرضی ہے تو جس دور میں بھی سانس لے ۔۔۔ تیرا ماضی، حال، مستقبل ہے تیرے سامنے

عابدہ تقی کا افسانہ کلوری متاثر کرتا ہے یہ انسانوں اور مویشیوں کے باہمی انس اور درد کے رشتوں کی داستان ہے۔

عقیل دانش۔ لندن (برطانیہ)

اکتوبر۔ دسمبر ۲۰۱۰ء کا الاقرباء نظر نواز ہوا۔ صوری اور معنوی اعتبار سے آپ کی محنت اور

صاحبانِ قلم کا تعاون رنگ لا رہا ہے۔ بلا مبالغہ برصغیر میں اس معیار کا مجلہ خال خال ہی نظر آئے گا۔ اس زرگزیدہ دور میں ادب۔ زبان اور ثقافت کی آبیاری اور ترویج کے لئے جس طرح آپ نے اور آپ کے ساتھیوں نے خُود کو وقف کیا ہے۔ اُس کا ذکر تاریخِ ادب کا حصہ بن چکا ہے۔ آپ نے ذریعہ تعلیم اور قومی تشخص کو اداریے کا عنوان بنا کر ایک بار پھر ثابت کر دیا ہے کہ الاقرباء قومی مسائل پر کس عمیق اور پر تاثر سوچ کا حامل ہے۔ ڈاکٹر محمد معزالدّین اور محترمہ سیّدہ نغمہ زیدی نے اقبال کے فکر و فن کے جن گوشوں کو جس عالمانہ انداز میں اُجاگر کیا ہے اس کے لیے دونوں مبارکباد کے مستحق ہیں۔ یادِ رفتگان میں ڈاکٹر وزیر آغا پر بہت جاندار معلومات افزا اور دل کو چھو لینے والے مضامین قاری کے دل کی دھڑکن بن جائیں گے خیال امروہوی مرحوم کا محسن احسان پر مضمون خاصے کی چیز ہے۔ مضامین و مقالات میں آپ نے کیسے کیسے معیاری مقالات جمع کئے ہیں۔ ان پر فرداً فرداً لکھا جانا چاہئے۔ اُردو دُنیا اب وسیع ہوتی جا رہی ہے۔ محترم طارق غازی۔ پروفیسر پروین صادق اور اُن جیسے اہلِ قلم اردو کی شمع کو روشن رکھے ہوئے ہیں۔ دیارِ غیر میں کتابوں کی نایابی کے باوجود حرف وصوت سے رشتہ ادب سے وابستگی کا جنون ہی ہے اللہ کرے زورِ جنوں اور زیادہ۔ الاقرباء کا شعری حصہ اس بار پھر فکر و فن کے پھول کھلا رہا ہے۔ مجھے اِن اشعار نے پر کیف کر دیا ہے۔

لکھے نہیں گئے تھے تو ہم ہر ورق میں تھے   دستور سے سطور کے عالم میں آ گئے

(سید مشکور حسین یاد)

بدن کو روح کو چہرے کو جگمگائے رکھو   چراغ اپنے لہو میں کوئی جلائے رکھو

(اکبر حیدرآبادی)

تو نے کیا ہے ولولۂ نو مجھے عطا   ممنون ہے ترا مرا پیرایۂ سخن

(مضطر اکبر آبادی)

زخموں کے چراغاں، خونِ شفق اور اہلِ جنوں کی گلکاری
پھر کس نے کہا یہ راہِ طلب بے کیف ہوئی بے نور ہوئی

(ڈاکٹر خالد حسن قادری)

قبادریدہ ہے منظر ترے بغیر یہاں نظر میں ساری خدائی فقیر لگتی ہے

(صابر عظیم آبادی)

عجیب تہمتیں مجھ پر لگائیں دُنیا نے ابھی ہوا تھا نہ میلا ذرا کفن میرا

(پروفیسر حسن عسکری کاظمی)

قوم کے قصّے میں کردار سبھی ہیں مشکوک یہ کہانی ہمیں لکھوائی ہوئی لگتی ہے

(سلمان صدیقی)

شورِ طوفاں میں بھی اک آواز آتی ہے خیال ڈوبنے والے سنبھل ساحل ہے تیرے سامنے

(پروفیسر خیال آفاقی)

میری زخمی انگلیوں کو دیکھ کر بولی صبا اب چمن میں رنگ و بو کی آرزو مت کیجیو

(صوفیہ انجم تاج)

اے شاہِ عرب فخرِ عجم ایک بشارت بس ایک بشارت ہمہ تن گوش ہیں ہم لوگ

(طارق ہاشمی)

مصائب سامنے رُکتے تو کیسے مری ماں نے مرا صدقہ دیا ہے

(طارق ہاشمی)

کتابوں پر تبصرے حسبِ معمول متوازن۔ ہمہ جہت اور معلومات افزا ہیں مبصرین نے کتاب ''قول'' کر نہیں کتاب پڑھ کر کتابوں کے بارے میں لکھا ہے۔ الاقرباء کے نام خطوط پڑھ کر اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ برصغیر سے باہر بھی الاقرباء کے چاہنے والے موجود ہیں۔ اور

اُنھیں کی تخلیقات سے الاقرباء کا چمن مہکا ہوا ہے۔ ایک بار پھر الاقرباء کا معیار برقرار رکھنے اور ادارت کے خوبصورت زاویے پیش کرنے پر آپ کو اور آپ کے ساتھیوں کو خراجِ عقیدت پیش کرتا ہوں اور تمام اہلِ قلم سے یہی گزارش کرتا ہوں کہ:

رہینِ فکر و نظر شہر یار ملک قلم　　لکھو کہ نوکِ قلم زندگی سنوارتی ہے
نشاطِ آبلہ پائی سے چُور ہمسفرو　　چلو کہ راہِ طلب آج بھی پکارتی ہے

(عقیل دانش)

ڈاکٹر انور سدید۔ لاہور

میں نے آپ کا اداریہ ''ذریعہ تعلیم اور قومی تشخص'' متعدد مرتبہ پڑھا۔ پاکستان کا کوئی شخص بھی آپ کے اس بنیادی نقطے سے غیر متفق نہیں ہوسکتا کہ آزادی کے گزشتہ ساٹھ سے زائد برسوں کے دوران ایک مستحکم اور غیر منقسم قومیت کا اجتماعی شعور بیدار نہیں ہوا تو اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ ملک میں تعلیم کو اور بالخصوص ذریعہ تعلیم کو وہ اہمیت نہیں دی گئی جو ایک نظریاتی مملکت میں سیاسی قیادت کی اوّلین ترجیح ہونا چاہیے تھی'' قائداعظم محمد علی جناح نے تعمیر پاکستان کے ابتدائی برسوں میں ہی قولِ فیصل سنا دیا تھا کہ صوبے اپنی اپنی صوبائی زبان کی تربیت و پرداخت کریں لیکن پورے پاکستان کی قومی زبان ''اردو'' ہوگی۔ بدقسمتی کی بات یہ ہے کہ قائداعظم کے اس فرمان کو پسِ پشت ڈال دیا گیا۔ لسانی مسائل کھڑے کر دیئے گئے۔ انگریزی کو برتر حیثیت دے دی گئی۔ نتیجہ یہ ہے کہ ''اردو زبان'' کو آئین پاکستان میں تو مقام امتیاز حاصل ہے لیکن مشرقی پاکستان گنوا دینے کے بعد بھی چاروں صوبوں کے رابطے کی زبان اردو کو عملی طور پر قبول نہیں کیا گیا۔ ڈاکٹر سیّد عبداللہ زندہ تھے تو انہوں نے نفاذِ اردو کی تحریک چلائی تھی۔ مولانا صلاح الدین احمد نے آزادی کے فوراً بعد فرمایا تھا ''اردو پنجاب کی بیٹی ہے۔ اب اردو اپنے میکے میں واپس آگئی ہے'' انہوں نے اپنی زندگی کے آخری لمحے تک ''اردو بولو'' ۔۔۔ ''اردو پڑھو'' ۔۔۔ اور ''اردو لکھو'' کی تحریک جاری

رکھی۔ اردو کے سرکاری نفاذ کے لیے ''مقتدرہ قومی زبان'' نیشنل لینگو ایج اتھارتی) سابق صدر ضیاء الحق کے دور سے قائم ہے۔ لیکن بدقسمتی کی بات یہ ہے کہ اردو نہ سرکاری دفاتر میں نافذ ہے اور نہ اسے ذریعہ تعلیم بنایا جاتا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ ''نوآبادیاتی طرز کی سازش سے قومی تشخص اور نظریاتی وحدت پر ضربت کاری لگ رہی ہے۔ لیکن حکمرانوں کو شاید اس کی پروانہیں۔ ''الاقرباء'' نے یہ اداریہ لکھ کر اپنا فرض پورا کر دیا ہے۔ لیکن نفاذِ اردو سے قومی اتفاق، اتحاد، یک جہتی اور نظریاتی استحکام پیدا کرنے کی منزل ابھی دور ہے۔

مقالات میں جناب محمد انور معین زبیری مجدّدی نے تفہیم مرزا عبدالقادر بیدل کے عنوان سے اچھا مقالہ پیش کیا ہے۔ بیدل سے اردو کے بہت سے شعرا نے استفادہ کیا ہے۔ لیکن فارسی زبان سے ناشناسائی کی وجہ سے بیدل کو بلاواسطہ پڑھنا اب روز بروز کم ہوتا جا رہا ہے۔ زبیری صاحب نے سیّد نعیم حامد علی کے تراجم سے بیدل تک بالواسطہ رسائی ممکن بنادی ہے یہ مقالہ تفہیم بیدل میں بڑی خوبی سے معاونت کرتا ہے۔ اور بیدل سے استفادہ کی مثالیں بھی خوش آئند ہیں۔ طارق بن عمر صاحب نے اپنے مقالے ''اردو افسانہ۔ باطنی اور ظاہری پہلو'' کی بنیاد پریم چند اور منٹو کے چند افسانوں پر رکھی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ موضوع پوری طرح ابھر نہیں سکا۔ اس افسانے کی تخلیقی عمر اب ایک صدی سے زیادہ ہوگئی ہے۔ اس موضوع کا فنی تقاضا یہ ہے کہ راجندر سنگھ بیدی کرشن چندر، غلام عباس، اوپندر ناتھ اشک، ممتاز مفتی، غلام الثقلین نقوی، رشید امجد، شمس آغا، فرخندہ لودھی، اشفاق احمد، بانو قدسیہ، حسن منظر، جوگندر پال، منشایاد، ہاجرہ مسرور، الطاف فاطمہ، اختر اورینوی اور ابوالفضل صدیقی جیسے افسانہ نگاروں کا تجزیہ باطنی اور ظاہری زاویوں سے کیا جائے۔ طارق بن عمر صاحب سے توجہ فرمانے کی درخواست ہے۔

ڈاکٹر وزیر آغا کی وفات سے اردو ادب ایک کثیر الجہت ادیب سے محروم ہو گیا ہے۔ ''الاقرباء'' نے ڈاکٹر مظہر حامد، سیّد مشکور حسین یاد، اور فضہ پروین صاحبہ کے مضامین ایک گوشے میں پیش کر کے وزیر آغا صاحب کو یاد کرنے کی عمدہ کاوش کی ہے میں اس خط کے ساتھ پرفیسر غلام

جیلانی اصغر کا ایک وہ شخصیت نامہ'' پیش کر رہا ہوں۔ انہوں نے یہ مضمون وزیر آغا صاحب کی زندگی میں لکھا تھا اب مجھے ان کے پرانے کاغذات سے دستیاب ہوا ہے۔ جیلانی صاحب اردو کے ممتاز نقاد، شاعر اور انشائیہ نگار تھے۔ وہ وزیر آغا صاحب کے قریبی بے تکلف دوستوں میں سے تھے۔ چند برس قبل وفات پا گئے تو وزیر آغا کی کتاب ''شام دوستاں آباد'' میں شامل ہے۔ جیلانی صاحب کے مضمون کا کاغذ خستہ ہو گیا تھا۔ میں نے دوبارہ نقل کیا ہے۔ ''وزیر آغا سے پہلی ملاقات ''یادنگاری کا سلسلہ ہے۔

ڈاکٹر محمد احسن فاروقی اردو ادب کی ایک اہم شخصیت تھے۔ افسوس یہ ہے کہ اہل ادب نے انہیں بہت جلد فراموش کر دیا۔ ان کا ناول ''شام اودھ'' شائع ہوتے ہی ''کلاسیک'' تسلیم کر لیا گیا تھا۔ لیکن عملی زندگی میں وہ بے نیاز قسم کے انسان تھے۔ اور انہوں نے شہرت کی بند ویگن پر سوار ہونے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ میں نے انہیں یاد کرنے کی کوشش کی ہے۔

''الاقربا'' ادبی لحاظ سے روح کی تازگی کا نقیب بن کر آتا ہے۔ اس کی کامیابی میں آپ کے کلاسیکی مزاج کا عمل دخل زیادہ ہے۔ اور ہر ورق پر مدیر کی مہر لگی ہوئی نظر آتی ہے۔ مبارکباد۔ صد مبارکباد۔

''الاقرباء'' کے قارئین سے دعا کی درخواست کرتا ہوں کہ ''شائیٹک پین'' سے نجات ملے اور ذہنی پریشانی دور ہو۔

بیگم عارفہ صلاح الدین۔ لاہور

تازہ شمارہ نظر نواز ہوا۔ مجھے یہ مجلّہ مختلف اصناف ادب کے حسین امتزاج، تمامتر آب و تاب اور انفرادی مقناطیسیت کے ساتھ ۲۰۰۷ء سے مل رہا ہے۔ ہر شمارہ و مطالعہ سے انصاف کا متقاضی ہے۔ ہر اداریہ تعلیمی اصلاحات، قومی زبان سے آپ کی لگن اور آپ کے قلم کی استقامت کا آئینہ دار ہے۔ اللہ ہماری گراں گوشی کا علاج فرمائے۔ موضوع خواہ ''رسم الخط کے مباحث'' کا ہو ''قومی تعلیمی پالیسی'' ''سائنس اور ادب'' ''زبانوں کا بین الاقوامی سال'' ''پاکستان میں اردو ادبی تحقیق

کا مستقبل'' ''نظام تعلیم کے تہذیبی اور ثقافتی مضمرات'' یا ''اردو۔ مخالفوں اور منافقوں کے درمیان'' ہر ایک کی گونج قومی زبان سے آپ کے عشق اور تعلیمی اصلاحات سے آپ کے فکری اور جذباتی تعلق کی شہادت دے رہی ہے، اس کے ساتھ ساتھ منطقی استدلال اور نسخہ ہائے علاج نے الاقرباء کو ایک مجاہدانہ تاریخ ساز کردار عطا کیا ہے۔ مجھ جیسے قاری کے لیے یہ فخر کی بات ہے کہ الاقرباء کے ذریعہ بیرونی درسگاہوں کے اساتذہ اور دانشوروں کی تخلیقات کو پڑھنے کا موقع ملتا ہے اور الاقربا کا پرچم اپنے ملک کی سرحدوں سے دور باہر کے قلعوں پر بھی لہرا رہا ہے۔

ذریعہ تعلیم اور قومی تشخص کے لیے زبان ایک کلیدی حیثیت رکھتی ہے اور یہ کہ اردو ہماری تہذیب کی نہ صرف امین ایک اہم دستاویز و آئینہ ہے بلکہ ہماری درخشندہ معاشرتی اقدار کے تسلسل کا اہم ترین اور واحد ذریعہ بھی۔ اس سے صرف نظر ایک مجرمانہ غفلت ہے جس کی تلافی آئندہ ناممکن ہوگی اور نتیجتاً ہماری مستقبل کی نسل کا ہم سے تہذیبی رشتہ منقطع ہو جائے گا۔ زبان سے سرد مہری کی چند وجوہات میرے نزدیک یہ ہیں۔

(۱) ہم دیسی انگریزوں کا احساسِ کمتری اور غلامانہ ذہنیت انگریزی کے ساتھ ترجیحی سلوک کرنے کا یہ جواز پیش کرتی ہے کہ ہماری لیاقت کی دھاک، ہماری بات کا وزن اور ہمارے مہذب اور تعلیم یافتہ کہلانے کا بھرم صرف انگریزی زبان ہی رکھ سکتی ہے۔ (۲) غیر ملکی ذرائع ابلاغ کی یورش اور ان کا ہمارے نزدیک معتبر ہونا۔ (۳) کرۂ ارض کا ایک ''گاؤں'' میں تبدیل ہونے کا عمل اور ترقی یافتہ قوموں کے پسماندہ یا ترقی پذیر قوموں پر منفی اثرات اور اجارہ داری۔

آپ اپنے ٹی وی پروگرام ملاحظہ فرمائیے اور اپنے نوخیز و نوجوان شرکاء کی زبان، حرکات، ادائیں، لباس وضع قطع ملاحظہ فرمائیے اور مغرب کی کمال نقالی کی داد دیجیے۔ سیاسی و معاشرتی نجی، سرکاری و نیم سرکاری تقریبات کا جائزہ لیجیے اور انگریزی میں مقالے اور تقریریں سنیے۔ اگر قسمت سے اردو کی تقریر بھی ہے تو اس میں انگریزی الفاظ کی ٹھونس ٹھانس دیکھیے، جہاں اردو میں متبادل

الفاظ نہ ہوں وہاں تو کوئی بات نہیں، ہماری زبان میں دوسری زبانوں کے الفاظ کو اپنانے کے لیے غضب کی لچک موجود ہے اور اسی لیے اس کا دامن بہت وسیع ہے لیکن متبادل الفاظ ہوتے ہوئے انگریزی الفاظ استعمال کرنے کا کوئی جواز نہیں۔ مغربی یلغار نے بیشتر علاقائی اور قومی زبانوں کو ہڑپ کر لیا ہے۔ خدانہ کرے کہ اردو زبان کا بھی انہی افراد کے ہاتھوں جو ''حصول منزل کے لیے شریک سفر نہ تھے'' وہی عبرتناک حشر ہو جو دوسری زبانوں کا ہو رہا ہے۔ نہ ہمیں بابائے قوم کے قول کا پاس ہے اور نہ حکیم الامت مصور پاکستان کی تعلیم کا لحاظ۔ اقبال ایک جگہ فرماتے ہیں:

زخاک خویش طلب آتشے کہ پیدا نیست   تجلی دگرے درخور تقاضا نیست

اور یہ اشعار بطور خاص ملاحظہ ہوں:

ارجمندی از شعارش می برید   من ندانم تو توئی یا دیگری
برزبانت گفتگو ہا مستعار   در دل تو آرزو ہا مستعار

بادہ می گیری بجام از دیگراں   جام ہم گیری مدام از دیگراں
تا کجا طرف چراغ محفلے   خود زآتش سوز گر داری دلے

دراصل ہمیں اپنے تعلیمی نظام کی از سرنو اصلاح کرنی ہوگی اور اپنے قومی تشخص کے بقا کی خاطر اپنی قومی زبان کا مقام و مرتبہ متعین کرنا ہوگا۔ حالیہ شمارہ میں تفہیم بیدل پر انور معین زبیری صاحب کا مضمون بہت دلچسپ اور خیال افروز ہے۔ بیدل تاجک النسل تھے ان کے والد اور چچا ۱۷ویں صدی میں بلخ کے نواح سے ہند آئے تھے اور مغل فوج میں اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے۔ بیدل (۱۶۴۴۔۱۷۲۰ء) عظیم آباد، پٹنہ میں پیدا ہوئے اور کسی دربار سے منسلک ہوئے بغیر دہلی میں وفات پا گئے۔ ان کی نگارشات سولہ (۱۶) کتابوں پر مشتمل ہیں۔ جن میں ۴۷۰۰۰ اشعار ہیں معنی آفرینی اور نازک خیالی کے ساتھ ساتھ تراکیب مشکل ہیں۔ کلام میں ۴۰۰۰ چار ہزار رباعیوں کے علاوہ

ترکیب بند، ترجیع بند اور پہیلیوں کے ساتھ ساتھ ایک مثنوی ''عرفان'' بھی ہے جس میں پریوں کی کہانیاں ہیں اور اکثر تمثیل کے پردہ میں ان کا فلسفۂ زندگی جھلکتا نظر آتا ہے۔ بیدل نے تنگ نظر اور نام نہاد دینی علماء کی جگہ جگہ خوب خبر لی ہے۔

ایران میں ان کی شاعری پر ''سبک ہندی'' کا الزام رہا اور وہ ستائش سے محروم رہے۔ ہندوستان میں بھی اپنی افتادِ طبع اور غالباً مذہبی وسیع النظری کی بناء پر نمایاں مقام نہ پا سکے۔ بیدل ابن عربی کے فلسفہ ''وحدت الوجود'' کے قائل تھے۔ افغانستان اور تاجکستان میں بیدل کی حیرت انگیز حد تک پذیرائی ہوئی اور امن پسند طاقتوں کے شب خون سے پہلے افغانستان میں بطورِ خاص کچھ ادبی حلقے ان کے نام سے منسوب ہوئے اور جن موسیقاروں نے ان کی غزلوں سے محفلوں کو گرمایا ان میں استاد محمد حسین (۱۹۸۳-۱۹۶۴ء) کا نام خاص طور پر قابل ذکر ہے جنھیں حکومت افغانستان نے ''سرآہنگ'' کے خطاب سے نوازا۔ محمد حسین سرآہنگ کی تصنیف ''قانونِ طرب'' میں فنِ موسیقی کے علاوہ افغان موسیقاروں کی سوانح عمریاں بھی شامل ہیں۔ سرآہنگ کی خواہش تھی کہ انہیں بیدل کے مرقد کے قریب دفن کیا جائے۔ ایک روایت کے مطابق بیدل کا جسدِ خاکی افغانی پرستاروں نے دہلی سے بمقام ''خواجہ رادش'' (افغانستان) منتقل کر دیا تھا واللہ عالم! چنانچہ اب بیدل کا مزار دہلی میں بھی ہے اور رادش میں بھی افغانستان اور تاجکستان میں بیدل کو ''ابوالمعانی مرزا عبدالقادر بیدل'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ خوشی کی بات ہے کہ بیدل کی شاعری میں دلچسپی بڑھ رہی ہے۔ حال ہی میں مرحوم کی شخصیت اور شاعری پر ڈاکٹر نبی ہادی نے دہلی سے ایک کتاب شائع کی ہے۔ امید ہے تفہیم بیدل کی آئندہ قسط سالنامہ کی زینت ہوگی۔ بیدل کے یہاں نازک خیالی اور ایک حیرتناک معنی آفرینی ہے جس کا ذکر خود انہوں نے بار بار کیا ہے۔ ان کا ایک شعر ہے۔

بیدل سخت نیست جز انشائے تحیر　　　　کیو آئینہ تا صفحۂ دیوان تو باشد

الاقرباء کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ اس کے صفحات پر خواتین اہل قلم مردوں کے شانہ

بشانہ نظر آتی ہیں اور ان کی تخلیقات اس مجلّہ کے حسن میں مزید اضافہ کرتی ہیں محترمہ شہلا احمد، نعیم فاطمہ علوی، سیدہ نغمہ زیدی، ڈاکٹر نسیم ہائنس، رضیہ مشکور، ڈاکٹر قراۃ العین طاہرہ، نیلم احمد بشیر، ثمر بانو ہاشمی، شمع خالد، نور الصباح، سیمیں برلاس، مہناز خالد، بیگم ثاقبہ رحیم الدین، ڈاکٹر مہ جبیں زیدی ، پروفیسر پروین طارق، پروین صادق، فضہ پروین، قمر وراثت، انور جہاں برنی صبیحہ، عابدہ تقی، سعدیہ راشد وغیرہ خواتین کی اعلیٰ نمائندگی کر رہی ہیں اور قابلِ مبارکباد ہیں۔

الاقرباء اقبالیات پر قابل قدر کام کر رہا ہے بطور خاص جناب ڈاکٹر معز الدین صاحب کے مضامین اس موضوع پر اپنی مثال آپ ہیں۔

میں ہوں صدف تو تیرے ہاتھ میرے گہر کی آبرو   میں ہوں خذف تو تو مجھے گوہر شاہوار کر

رضیہ مشکور (باسٹن۔امریکہ)

امید ہے بخیر ہوں گے۔گزشتہ شمارہ بھی اپنی پوری آب تاب کے ساتھ موصول ہوا۔ہمیشہ کی طرح مضامین کا گوشہ پرمغز ومعنی آفرینی کا جہان لیے ہوئے ہے۔خاص طور سے 'اسلامی تاریخ کے مدوجزر' (محمد طارق غازی) 'رد تشکیل' (ڈاکٹر شبیر رانا) اور 'اردو افسانہ' (طارق بن عمر) پسند آئے۔

اقبالیات میں دونوں مضامین 'اسلام میں اتحاد اور اخوت و مساوات کا تصور' (ڈاکٹر محمد معز الدین) اور 'اقبال اور مردِ مومن' (سیدہ نغمہ زیدی) اچھے لگے۔نغمہ آپا کے مضامین میں بہت شوق سے پڑھتی ہوں۔ان کے اندازِ بیان کی سادگی دل موہ لیتی ہے۔میری جانب سے انہیں سلام پیش ہے۔

یادرفتگاں میں یوں تو بڑے قلم کار موجود ہیں مگر میں خاص طور پر فضہ پروین کے مضمون کا ذکر کرنا چاہتی ہوں جو بڑی خود اعتمادی کے ساتھ اپنے فنی وفکری خیالات ضابطۂ تحریر میں لاتی ہیں۔اللہ کرے ہماری نئی نسل ایسے نوجوان قلم کاروں سے سیکھے اور ان کی ہمت افزائی کرے۔

الاقرباء پابندی سے مل رہا ہے۔آپ جس طرح اسے تواتر کے ساتھ شائع کر رہے ہیں وہ کچھ آپ کا ہی دل جانتا ہوگا۔میں تو اتنا جانتی ہوں کہ اہلِ اردو نے خود ان کے ہی ذوقِ سلیم پر

سوالیہ نشان لگا دیا ہے کہ دیدہ ور کی اشاعت کی ذمہ داریاں اپنے سر لے کر میں بھی اس آگ میں کود پڑی ہوں، شکایت کر نہیں سکتی کہ یہ فیصلہ سراسر میرا ہے۔ دوستوں اور بزرگوں کے مشوروں میں تو نہیں نہیں کی صدا تھی، بہر حال۔ بیرسٹر سلیم قریشی صاحب (لندن) کا شکریہ ادا کرنا میں اپنا فرض سمجھتی ہوں جنھوں نے میرے افسانے کو پڑھ کر اپنی رائے سے نوازا۔ یوں آپ کی محنت اس شمارے کے ہر ہر صفحہ سے عیاں ہے۔ دعا ہے کہ یہ یونہی اپنا سفر جاری رکھے، آمین۔

گزشتہ شمارے میں ''انتخاب دیدہ ور ۲۰۱۰ء'' پر آپ کے تبصرے کے لیے ممنون ہوں، آپ جیسے علم دوستوں کی رائے میرے لیے نہ صرف اہم ہے بلکہ قابلِ تقلید بھی، جزاک اللہ خیر۔

نغمہ زیدی۔ پشاور

الحمدُ للہ! ''الاقربا'' باقاعدگی سے مل رہا ہے۔ جس کے لیے میں آپ کی تہہ دل سے شکر گزار ہوں حسبِ سابق ادارہ یہ ذریعہ تعلیم اور قومی تشخص اذہان کو دعوت فکر و تدبر دے رہا ہے۔ مگر اس دورِ انتشار میں یہ تو بھینس کے آگے بین بجانے کے مترادف ہے۔ جب تک ملک و ملت کے مفاد میں فیصلے کرنے والا کوئی درویش مسندِ حکومت پر جلوہ افروز نہ ہوگا۔ زبان و تعلیم کے مسائل حل نہ ہو نگے۔

شمارے کے تمام مضامین بے حد معیاری اور معلومات افزا تھے۔ خاص طور پر ''عرب دنیا میں اردو'' کا حال پڑھ کر یک گونہ خوشی و اطمینان نصیب ہوا۔ اُردو صوفیا کی زبان ہے۔ اور عشق کے ضمیر میں گندھی ہے۔ موت اس پر حرام ہے۔ انشاء اللہ یوں ہی دنیا بھر کے گوشے گوشے میں ترقی کرتی رہے گی۔

رفتگان کے تمام مضامین بہت خوب تھے۔ افسانہ ''کلوری'' اور ممتا کی ممتا خوبصورت احساسات کی عکاسی کرتے ہیں۔ سیلاب نے جو آفت مچائی اُس پر کلوری افسانہ ایک خوبصورت اضافہ ہے۔

حصہ غزل و نظم کی تابنا کی دل و نگاہ میں اُتر گئی۔ غزل کی کہکشاں سجانے میں الاقربا کو کمال حاصل

ہے۔تمام غزلیں بشمول حمد و نعت لائقِ دادِ و تحسین ہیں۔اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ !

ڈاکٹر وزیر آغا کی ہم سے جدائی ایک سانحہ عظیم ہے۔علم و ادب کا روشن دماغ نہ رہا اردو ادب میں تا دیر اُن کا ثانی نہیں ملے گا۔شاعر، نقاد، سوانح نگار اور بحیثیت انسان وہ ایک باکمال شخصیت تھے۔اللہ تعالیٰ انھیں غریقِ رحمت کرے۔(آمین)

محسن احسان صاحب عظیم شاعر، مثالی اُستاد اور پُر بہار شخصیت کے مالک تھے۔مختلف تقریبات میں اُن سے ملاقات رہتی۔اور خاص طور پر مسز محسن جو ہمارے کالج میں پڑھاتی رہیں ہیں۔اُن سے قریبی تعلق ہوتے ہوئے محسن احسان صاحب اکثر صاحب صدر کی حیثیت سے کالج کی مختلف تقریبات میں مدعو ہوتے۔نہایت مشفق اور علم و ادب دوست تھے۔پشاور میں اردو ادب کے فروغ کے سلسلے میں انھوں نے خاص کردار ادا کیا۔اُن کی موت سے پشاور کے علمی و ادبی حلقوں میں جو خلا پیدا ہوا ہے۔اُسے پُر کرنے میں شاید بہت وقت لگے۔دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ انھیں اپنی رحمتوں سے نوازے۔۔(آمین)

میں قارئین کرام کی شکر گزار ہوں۔جو میرے مضامین کو سراہتے ہیں۔اور اپنی آراء سے نوازتے ہیں۔اللہ تعالیٰ 'الاقرباء' کو اسی طرح چار چاند لگاتا رہے (آمین)

امین راحت چغتائی۔راولپنڈی

الاقرباء اکتوبر تا دسمبر ۲۰۱۰ء مل چکا ہے اور اِس کے بیشتر مضامینِ نظم و نثر پڑھ بھی چکا ہوں۔ آپ کا اداریہ پڑھتا ہوں تو ''یا اپنا گریباں چاک یا دامنِ یزداں چاک'' پر طبیعت اُکساتی ہے۔ پھر سوچتا ہوں دونوں گھاٹے کے سودے ہیں۔کُڑھنا، نسبتاً آسان ہے سو یہ کام کر لیتا ہوں۔اِس میں زیادہ سے زیادہ جان کا ہی زیاں ہے نا! سو یہ کوئی ایسا زیاں نہیں۔

تفہیم مرزا عبدالقادر بیدل کے منظوم ترجمے پر محمد انور معین زبیری مجددی کا مضمون بہت اچھا لگا۔صاحب! جلدی سے ہمیں بیدل کے مترجم سید نعیم حامد علی کا پتا بتایئے۔ان کی پیشانی چوم کر اُنھیں بلندی درجات کی دعا دی جائے اور پھر ترجمے کے حصول کا طریق معلوم کیا جائے۔ایسا

سلیس، سادہ و پرکار ترجمہ ابھی تک میری نظر سے نہیں گزرا۔ کچھ نثری تراجم بی ہادی صاحب کے نظر نواز ہوئے تھے۔ بہت عمدہ ہیں۔ بلکہ اُن کی کتاب ہی بہت اعلیٰ پائے کی ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا پر فضہ پروین کا مضمون اپنی جامعیت کے اعتبار سے دیگر مضامین سے زیادہ اچھا لگا۔ ڈاکٹر خیال امروہوی ☆ شکریہ کے مستحق ہیں کہ انھوں نے محسن احسان مرحوم کو یاد کیا۔ محسن بلند فکر شاعر تھے، چپکے سے بزم، احباب سے اُٹھ گئے بہت پاکیزہ صفت دوست تھے۔ تادیر دلوں میں زندہ رہیں گے۔ ڈاکٹر غلام شبیر بڑی تحقیق سے مضامین لکھتے ہیں۔ مَیں اُنھیں اکثر پڑھتا ہوں۔ ''ردِ تشکیل'' ہمارے جدید طرزِ فکر کا حامل مضمون ہے۔ ڈاکٹر صاحب موصوف اردو تحقیق و تنقید میں قابلِ صد ستائش نام پیدا فرمارہے ہیں ہماری نئی تنقید آج کے ادیب کو اجتہادی روّیوں پر اکساتی ہے اور ڈاکٹر غلام شبیر بڑی خوبی سے اپنا فریضہ ادا کر رہے ہیں۔ اُن کی تحریر پڑھ کر بلاشبہ تازہ فکر کا احساس ہوتا ہے۔ ہماری دعائیں اُن کے ساتھ ہیں۔ اللہ آپ کی مساعی بھی قبول فرمائے۔

محمد فیصل مقبول عجز۔ لاہور

سہ ماہی الاقربا اسلام آباد کا شمارہ جلد نمبر ۱۳ اکتوبر۔ دسمبر ۲۰۱۰ء موصول ہوا۔ اس نوازش کا بہت شکریہ۔ آپ (اور آپ کے ارکان) کی زیرِ ادارت سہ ماہی الاقربا اسلام آباد جس تن دہی سے علم و ادب کی خدمت کا فریضہ انجام دے رہا ہے قابلِ تحسین ہے۔ جان کر خوشی ہوئی کہ آپ ماشا اللہ بہت سی کتب کے مصنف اور کئی سرکاری اور نجی اداروں میں بہ حیثیت سرپرست کے اپنے فرائض انجام دے چکے ہیں۔ آپ کی علمی و ادبی خدمات کا ایک زمانہ معترف ہے جن میں بندہ ناچیز بھی شامل ہے۔

آپ کے نانا مرحوم محترم سید فدا گاؤٹھوی صاحب کا کلام بہت عرصہ ہوا نظر سے گزرا تھا، جو آپ نے ''برگ سبز'' کے نام سے مرتب کیا۔ وہ دبستانِ داغ کے نورتنوں میں سے تھے۔ آپ اُن کی روایات کو نہ صرف پروان چڑھا رہے ہیں بلکہ نئی نسل کے لیے بھی مشعلِ راہ ہیں۔

الاقربا کے شمارہ نمبر ۴ میں ڈاکٹر غلام شبیر رانا کا مضمون ''ردِ تشکیل ۔۔۔ ایک مطالعہ'' اور

پروفیسر صادق کا مضمون ''عرب دُنیا میں اردو ادب'' بہت پر مغز مقالے ہیں۔ گوشہ غزل میں محمد طارق غازی کی غزل جس میں انھوں نے صنعت لفظی (صنعت تکرار) کا بہت اعلیٰ استعمال کیا ہے قابل داد ہے۔

جملہ جملہ اجر و ثواب ہے صفحہ صفحہ قہر و عذاب　　ایک کتاب کا اک اک فقرہ سچا سچا لگتا ہے

لفظ و معنی کے تناظر میں کہے گئے یہ دو شعر بہت اعلیٰ ہیں۔

نظر معانی پہ رکھو اگر ہو حرف شناس　　جو نغمہ گر ہو تو پھر سُر سے سُر ملائے رکھو

(اکبر حیدر آبادی)

الفاظ سرنگوں ہیں جہاں، فکر دم بخود　　ہے صرف تیرا حُسن، فقط تیرا بانکپن

(مضطر اکبر آبادی)

اکبر حیدر آبادی صاحب کا یہ شعر تو اپنی مثال آپ ہے۔ کیا خوب طرز بیان ہے!

ہزاروں کاموں سے بڑھ کر ہے اہمیت جس کی　　وہ کام آج کا کل پر نہ تم اُٹھائے رکھو

ماشاءاللہ تمام غزلیات میں ہی ایسے اشعار موجود ہے جن پر بے ساختہ داد دینے کو دل چاہتا ہے۔ چند اشعار کا ذکر ضرور کرنا چاہوں گا۔

کیا وصل، کہاں کا ہجر، یہ ہیں کیفیت ذہنی کے پردے
وہ راحتِ جاں، وہ روح و رواں، کیا پاس ہوئی کیا دور ہوئی
معراج کمالِ قدوّسی، آغاز شعور انساں ہے
کیا کوئی حقیقت تجریدی، الفاظ میں بھی محصور ہوئی

(خالد حسن قادری)

حال، ماضی اور مستقبل کی اس سے بہتر عکاسی شاید ہی ممکن ہو۔

اب تری مرضی ہے تو جس دور میں بھی سانس لے　　تیرا ماضی، حال، مستقبل ہے تیرے سامنے

(پروفیسر خیال آفاقی)

کیا تھے ہم، کیا ہو گئے ہیں، اور کیا ہو جائیں گے　　یہ متن محتاج ہی رہ جائے گا تفسیر کا

(احتشام ادیب)

علم فلکیات کے حوالے سے بہت سے شعرا نے کہا اور کہہ رہے ہیں شفق ہاشمی صاحب نے کیا خوب حقیقت کشائی کی ہے۔

شفق طلوع و غروب کا بھی معاملہ کچھ عجیب سا ہے

اُبھر رہا ہے جو اپنے محور سے لوٹ کر اپنے گھر گیا ہ

تخلص شفق طلوع و غروب کی حقیقت کے درمیان پردہ بن گیا ہے اور جب یہ پردہ ہٹ جاتا ہے تو طلوع کی کیفیت غروب میں بدل جاتی ہے۔

انسانی جذبات نگاری کے حوالے سے کیا عمدہ اشعار کہے ہیں۔ کہ جی بے اختیار داد دینے کو چاہتا ہے۔

کوئی دریچہ عجب مجھ پہ آگہی کا کھلے　　کہ دل کا ساتھ بھی دینے لگے ذہن میرا

عجیب تہمتیں مجھ پہ لگائیں دُنیا نے　　ابھی ہوا تھا نہ میلا ذرا کفن میرا

(حسن عسکری کاظمی)

یہ سبزہ زار یہ دشت و جبل یہ آب رواں　　ہیں کائنات کی رنگینیاں گواہ تری

(ڈاکٹر نواب خان نفیس)

پانی کی ضرورت پر مانگی تھی دُعا لیکن　　یہ تو نہیں سوچا تھا سیلاب بھی در آئے

(نوید سروش)

ہم اپنے آپ کو کس طرح اپنے سامنے لائیں　　جو غائب ہے ہمارے درمیاں موجود رہتا ہے۔

(سید مشکور حسین یاد)

پروفیسر خیال آفاقی کا یہ شعر بھی لاجواب ہے

عشق کو مجنوں بنا لے حسن کو لیلیٰ سمجھ　　بڑھ کے ناقہ روک لے محمل ہے تیرے سامنے

گوشہ نظم کی تمام نظمیں لاجواب اور قابلِ تعریف ہیں۔شعرا نے جدید دور کے تقاضوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے کیسے کیسے شہ کار تخلیق کیے ہیں۔پاکستان کے یہی شعرا ہماری شاعری کی آن بان اور شان ہیں اور نئی نوجوان نسل ان شعرا کا ہاتھ پکڑ کر اُردو ادب کی خدمت کی جانب گامزن ہے۔

گوشۂ نقد و نظر میں آپ نے ''مجلّہ دیدہ ور'' (اکتوبر ۲۰۰۸ سے اکتوبر ۲۰۱۰ء) انٹرنیٹ میگزین پر سیر حاصل تبصرہ کیا ہے۔اگر آپ فدوی کو اس تک رسائی کی کوئی تدبیر بتادیں تو یہ ناچیز بھی اس علمی و ادبی جریدے سے مستفیض ہو سکے گا۔نہایت مشفق اور علم و ادب دوست تھے۔پشاور میں اردو ادب کے فروغ کے سلسلے میں انھوں نے خاص کردار ادا کیا۔اُن کی موت سے پشاور کے علمی و ادبی حلقوں میں جو خلا پیدا ہوا ہے۔اُسے پُر کرنے میں شاید بہت وقت لگے۔دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ انھیں اپنی رحمتوں سے نوازے۔۔(آمین)

میں قارئین کرام کی شکر گزار ہوں۔جو میرے مضامین کو سراہتے ہیں۔اور اپنی آراء سے نوازتے ہیں۔اللہ تعالیٰ 'الاقرباء' کو اسی طرح چار چاند لگاتا رہے (آمین)

عبدالوہاب خاں سلیم۔(نیویارک۔امریکہ)

اکتوبر۔دسمبر ۲۰۱۰ء کا شمارہ موصول ہوا۔زیرِ نظر شمارے میں ''دیدہ ور'' پر آپ کا تبصرہ پڑھ کر بہت خوشی ہوئی جس طرح آپ نے اُردو زبان و ادب کے عشاق کی فقید المثال محفل پاکستان میں جما رکھی ہے اسی طرح جناب صہیب صدیقی اور محترمہ رضیہ مشکور صاحبہ نے امریکہ میں اُردو کا پرچم بلند کیا ہوا ہے۔اللہ آپ سب کو اپنی رحمتِ خاص سے نوازے۔اُردو زبان جس بے رُخی اور سرد مہری کا شکار ہے، آپ یقین کیجئے کہ اگر آپ جیسے مخلص اہلِ قلم اور روشن ذہن رکھنے والے نہ ہوتے تو اربابِ حل و عقد اسے کب کی موت کی نیند سُلا چکے ہوتے۔اللہ اُنہیں توفیق دے کہ وہ اردو زبان کے ساتھ وہی سلوک کریں جو ہر زندہ اور خود دار و باشعور قوم اپنی قومی زبان کے ساتھ کرتی ہے۔

احتشام الحق تھانوی۔ اسٹاک ہوم (سویڈن)

ماشاللہ اب تو بہت سرعت کے ساتھ ہر شمارہ انٹرنیٹ پر پڑھا جاسکتا ہے وطن سے دور یہ ایک نعمت غیر مترقبہ ہے۔ زیرِ نظر شمارے اکتوبر۔ دسمبر ۲۰۱۰ء میں ڈاکٹر محمد معزالدین صاحب اور سیدہ نغمہ زیدی صاحبہ کے اقبال پر مضامین بہت معلومات افزا ہیں۔ اللہ تعالیٰ اِن دانشوروں کو جزائے خیر دے کہ یہ حکیم الامت کی شخصیت کے نئے نئے پہلوؤں کو اُجاگر کرتے ہیں۔ اور جن پہلوؤں پر لکھا جاچکا ہے اپنی تحقیق سے اُن میں اضافہ فرماتے ہیں۔ زیرِ نظر شمارہ میں جناب شفق ہاشمی نے پیام مشرق سے فارسی قطعات کا اُردو میں کمال کا ترجمہ فرمایا ہے۔ پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ ترجمہ فرمان اقبال ہے۔ براہ کرم اس سلسلہ کو جاری رکھیے اور شفق ہاشمی صاحب کو اس قدر کامیاب ترجمہ پر مبارکباد دیجیے۔

کرامت بخاری۔ لاہور

آپ کا "الاقرباء" حسب روایت اور حسب سابق ارتقاء پذیر نظر آیا، خُدا کرے یہ خوبصورت جریدۂ ادب ایک تحریک ثابت ہو آپ کے ہاں تمام بڑے لکھاری اکٹھے نظر آتے ہیں مقالات سے مکتوبات تک علمی مباحث اور ادبی فکر و فلسفہ نئے نئے نظریات و تاثرات و مشاہدات نمو پذیر ہو رہے ہیں۔ اس دفعہ بھی غزلیات اور منظومات کا پلہ بھاری ہے، اردو سے محبت کرنے والوں کی یہ کہکشاں بیکراں ہوتی جارہی ہے اب تو اردو ادب کی نئی بستیاں آباد ہورہی ہیں۔ گھریلو ٹوٹکے اور خبریات بھی ایک اہم اور مفید سلسلہ ہے پولن الرجی پر زیادہ سے زیادہ ٹوٹکے لکھوائیں، میں بھی اِس مرض کا مریض ہوں، اللہ آپ کو اور آپ کی کاوشوں کو رواں دواں اور جواں رکھے۔

خواجہ مشتاق حسین گلبرٹ۔ آریزونا (امریکہ)

حسب معمول نثر و نظم کا گلدستہ اکتوبر۔ دسمبر ۲۰۱۰ء کا شمارہ ماحول کو معطر کر گیا۔ جناب طارق غازی صاحب کے مضامین علم و تحقیق کا بے بہا خزانہ اپنے دامن میں لیے ہوتے ہیں۔ اس شمارہ

میں اُن کی طویل غزل بھی تخیل اور زبان ومحاورہ پر اُن کی گرفت کی آئینہ دار ہے جناب اویس جعفری صاحب کی نظم ''کمالِ بےتوفیق'' بھی اُن کی شاعرانہ صلاحیتوں کی غماز ہے یہ نظم کس سلیقہ سے مدارج طے کرتی ہوئی نعتِ پاک کے اشعار پر اختتام پذیر ہوئی اس کا کینوس کس قدر وسیع ہے۔ الفاظ کے دروبست اور مزاج نے نظم کی تاثیر کو دوآتشہ کردیا ہے۔ ماشاءاللہ آپ کی محفل میں سات سمندر پار کے ادیب وشاعر شریک رہتے ہیں یہ آپ کی لگن محنت اور ہردلعزیزی کا جیتا جاگتا ثبوت ہے۔ میں ہی نہیں میرے احباب بھی الاقربا کے لیے چشم براہ رہتے ہیں۔ آپ سے ایک فرمائش کررہا ہوں۔ زیرِشمارہ میں جناب محمد انور معین زبیری مجددی صاحب کا مضمون مشامِ جاں کو معطر کرگیا۔ فاضل مصنف نے جناب سید نعیم حامد علی صاحب کے عبدالقادر بیدل کے اردو ترجمہ'' بہارِ ایجادیٔ بیدل'' کا ذکر فرمایا ہے۔ اگر آپ کے توسط سے مجھے یہ کتاب میسر آجائے تو میں آپ کا بہت ممنون ہونگا۔ اس ضمن میں میں جس خدمت کے لائق بھی ہوں آپ کی یادآوری پر بجا لاؤنگا۔ مجھے اُمید ہے آپ میری گزارش پر توجہ فرمائینگے۔ میں آپ کے جواب کا منتظر رہونگا۔

شجاع طلعت۔ بیلویو، واشنگٹن (امریکہ)

دیدہ زیب سرورق سے مزین ۲۰۱۰ء کا آخری شمارہ وصول ہوا۔ شکریہ اس شمارہ کے صفحات پر چند نئے لکھنے والوں سے ملاقات ہوئی اور یہ بات قابلِ فخر ہے کہ آپ کی بیٹھک کچھ ایسا مقناطیسی اثر رکھتی ہے کہ نئے لکھنے اور پڑھنے والے کھنچے چلے آتے ہیں۔ حالیہ شمارہ میں محترمہ صوفیہ انجم تاج کی غزل کا قافیہ اور ردیف کلاسیکی اردو شعراء کی یاد تازہ کرگیا۔ جناب طارق ہاشمی سے بھی پہلی ملاقات ہے ان کی نعت پاک کے علاوہ ایک غزل بھی اچھی ہے مگر ان کی نظم ''ماں'' بہت ہی خوب، سادہ اور محبت کے جذبہ سے مامور ہے۔ انور جہاں برنی سے بھی پہلی مرتبہ ملاقات ہوئی ہے اور نوواردانِ بساط الاقربا میں اُن کی غزلیں اچھی ہیں۔ جاوید بدایونی صاحب کی مناجات ہر حساس دلِ مسلم کی آواز ہے۔ اس شمارہ میں افسانے بہت جاندار ہیں۔ شفق ہاشمی صاحب کو کامیاب شعری تراجم پر مبارکباد دیجئے۔ اُمید ہے وہ ان تراجم سے آئندہ بھی سرفراز فرماتے رہینگے۔

پروفیسر زُہیر کنجاہی۔ راولپنڈی

الاقرباء وصول کرتے ہی سب سے پہلے ''مراسلات'' کی طرف متوجہ ہوتا ہوں کیونکہ ان مراسلات میں تنقید بھی ہوتی ہے اور تحقیق بھی، قارئین کی آرا سے بھی آگاہی ہوتی ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا ہم سے بچھڑ گئے وہ شرافت کا شاہکار تھے وہ ادب میں ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے۔ آزاد نظم، نئی تنقید اور تحقیق کو زمین سے اُٹھا کر آسمان تک پہنچا دیا۔ اُردو ادب میں انشائیہ کے آثار تو دکھائی دیتے تھے۔ مگر انشائیہ کا اپنا وجود نہ تھا۔ انشائیہ کو یہ وجود ڈاکٹر وزیر آغا نے دیا۔ صرف وجود ہی نہیں دیا اسے پختہ بھی کیا اور آگے بھی بڑھایا، نہ صرف خود انشائیہ لکھا، نئے نئے انشائیہ نگار بھی پیدا کیے۔ مشتاق احمد یوسفی تو یہاں تک لکھتے ہیں کہ ''ڈاکٹر وزیر آغا اُردو میں انشائیہ کے موجد بھی ہیں اور خاتم بھی۔''

☆ غالباً محترم مراسلہ نگار کو علم نہیں کہ ڈاکٹر خیال امروہوی پہلے ہی صفِ مرحومین میں شامل ہو چکے ہیں۔ ہم نے مضمون کے حاشیے میں اس طرف اشارہ کر دیا تھا۔ ان کی رحلت کے بعد 'الاقرباء' میں بھی تعزیتی مضمون شائع ہو چکا ہے (ادارہ)

ڈاکٹر مظہر حامد۔ کراچی

''الاقرباء'' کی کامیابی آپ کی محنت شاقہ کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ آپ کے تبصروں میں علمیت، حکمت، فراست اور طرز ادا میں جو ندرت و لطافت پائی جاتی ہے۔ وہ یقیناً فکری صلاحیت اور بالغ نظری ہے۔ اب میں اسے نظریاتی وسعت کہوں یا پھر جذبے کی صداقت، آپ کی ہر تحریر سے تازہ معنویت کے نئے پرت سامنے آتے ہیں۔

گذشتہ ''الاقرباء'' سے محروم رہا، آپ کے پرچے کا شدت سے انتظار رہتا ہے۔ سر دست دو غزلیں پیش خدمت ہیں حمد اور نعت بھی قبول فرمائیے۔ خدا آپ کو سلامت رکھے۔ آمین۔

طاہر نقوی۔ کراچی

الاقرباء کا تازہ شمارہ اکتوبر۔دسمبر ۲۰۱۰ موصول ہوا۔اس تحفے کے لیے ممنون ہوں۔

سب سے پہلے حسب عادت مندرجات پر نظر ڈالی۔ مضامین میں طارق بن عمر کا اردو افسانے پر مضمون پسند آیا۔ سلیم زاہد صدیقی کا خاکہ نہ صرف دلچسپ ہے بلکہ سوچنے کا موقع فراہم کرتا ہے۔ عابدہ تقی اور اختر بیگانہ کے افسانے موضوع اور بیان کے لحاظ سے اچھے ہیں۔ مگر عابدہ تقی کا افسانہ ذرا طوالت کا شکار ہو گیا ہے۔ اختر بیگانہ نے اچھوتے خیال پر افسانہ تخلیق کیا یادرفتگاں کے ذیل میں وزیر آغا پر تینوں مضامین بھرپور ہیں۔ محسن احسان کے متعلق ڈاکٹر خیال امروہوی کی تحریر بھی کم نہیں۔ گھریلو ٹوٹکے کا سلسلہ بھی مفید ہے۔ اس سے استفادہ کیا جاتا ہے۔

مشتاق احمد چوہان۔ (نیویارک۔امریکہ)

حسب معمول جاذب نظر سرورق کی ردا اوڑھے تازہ شمارہ موصول ہوا۔ آپ کے اداریے ہمیشہ ہی اہم ہوتے ہیں۔ زیرِ نظر اداریہ بھی فکر انگیز ہے۔ آپ کا خیال بالکل درست ہے کہ ''قومیت کے اجزائے ترکیبی میں زبان کو بنیادی اہمیت حاصل ہے'' یہ بات قابلِ افسوس ہے کہ نہ ہم نے اپنی علاقائی زبانوں کے فروغ پر توجہ دی ہے اور نہ اپنی قومی زبان کو وہ مقام دیا ہے جس کی وہ بجا طور پر مستحق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قوم کا شیرازہ منتشر ہے اور اس کی یکجائی میں زبان سے ہماری عدم توجہی شگاف ڈال رہی ہے۔ انگریزی جدید علوم وفنون کے لیے ضروری سہی مگر اس کی حدود کا تعین لازمی ہے اور اس کو مادری زبان کی ترویج وترقی میں حائل نہیں ہونا چاہیے۔ تعلیمی حکمت عملی وضع کرنے والے اداروں یا وزارت کو اپنے فرضِ منصبی کا خیال رکھنا ہوگا۔

یہ بے حد خوشی کی بات ہے کہ ہر شمارہ ہر قاری کے ذوق کی تسکین کا سامان فراہم کرتا ہے۔ امت مسلمہ کی تاریخ میرا محبوب موضوع ہے طارق غازی صاحب کا مضمون ''اسلامی تاریخ کے مدوجزر'' ہمیں اپنے نشیب وفراز کا آئینہ دکھاتا ہے اور سامانِ عبرت فراہم کرتا ہے۔ زندہ قومیں

ماضی سے سبق لے کر مستقبل تعمیر کرتی ہیں۔ امید ہے اس موضوع کا تسلسل جاری رہیگا اور غازی صاحب کا قلم اندلس کے زرّیں دور کے علاوہ ہر اس خطۂ ارضی کا احاطہ کریگا جہاں ہمارا علم لہرایا ہے اور جہاں ہمارے فکر و عمل نے غیر فانی نقوش چھوڑے ہیں۔

پروین صادق صاحبہ کا مضمون ''عرب دنیا میں اردو ادب'' اردو کی کرشماتی آب و تاب کا جیتا جاگتا ثبوت ہے۔ خدا اردو کی ان بستیوں کو شاد آباد رکھے، اور یہ شیریں اور چہیتی زبان گلے لگائی جاتی رہے پھلتی اور پھولتی رہے کاش اس کی بہار وطن عزیز پر بھی چھا جائے اور برقرار رہے۔

ہر چند کہ اقبالیات پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے مگر اس کے باوصف سیدہ نغمہ زیدی صاحبہ کا مضمون ''اقبال اور مرد مومن'' کا اسلوب اچھوتا ہے اور انہوں نے قرآن پاک کی روشنی میں انسانِ کامل کی جو تعریف کی ہے اور ابن مشکویہ، الکریم الجیلی، عبدالسلام ندوی اور نیٹشے کے حوالوں سے اپنی تحریر کو دلچسپ اور معلوماتی بنا دیا ہے۔ ڈاکٹر معزالدین صاحب تو ماشاء اللہ ایک مستند دانشور ہیں ان کی ہر تحریر اقبالیات پر ایک قابل قدر اضافہ ہوتی ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا پر محترمہ فضہ پروین صاحبہ کا مضمون بہت سیر حاصل ہے اگر شاگرد میں لگن اور اکتسابی صلاحیت ہو تو لائق اساتذہ کے ''افکار کی ضیا پاشیاں'' اور تربیت انھیں بھی نابغۂ روزگار بنا دیتی ہے۔

نعتیں تو ماشاء اللہ سب ہی بہت اچھی ہیں۔ جناب حبیب اللہ بخاری اور جناب زہیر کنجاہی کی نعتیں کیفیاتی ہیں اور گہرا تاثر چھوڑتی ہیں۔ ''نقد و نظر'' سے نئی مطبوعات کا اندازہ ہوتا ہے۔ کاش وقت، مہلت، وسائل میسر ہوتے اور یہ کتابیں بہ آسانی دستیاب ہو سکتیں۔ ''طب و صحت'' کے صفحات ہمیشہ ہی دلچسپی کا موجب ہوتے ہیں۔ آپ سے ایک گزارش ہے اور امید ہے کہ آپ الاقربا کے اس دور افتادہ قاری کی درخواست رد نہیں کریں گے۔

الاقربا میں سفرناموں کی شدت سے کمی محسوس کرتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ قارئین کی اکثریت خواہ وہ مشرق میں ہوں یا مغرب میں خاکوں، سوانح عمریوں اور سفرناموں کو پڑھنا پسند کرتی ہے۔ کیا اس ضمن میں آپ کے مثبت جواب کا انتظار کروں؟

قاسم محمود احمد۔ سانگلہ ہل

الاقرباء کا تازہ شمارہ موصول ہوا۔یعنی اکتوبر۔دسمبر ۲۰۱۰ء جس کے لیے بے حد ممنوں ہوں۔ مجھ پر دراصل پچھلے شمارے کی رسید دینا واجب تھا لیکن کچھ آفاتِ سماوی اور کچھ ایم فل کے تحقیقی مقالے بعنوان ''مکتوباتِ اقبال بنام سید نذیر نیازی (مطالعہ متن، حواشی وتعلیقات)'' کی تیاری آڑے آتی رہی۔صد شکر کہ اب یہ مقالہ جمع کروا دیا ہے۔ایجوکیشن یونی ورسٹی لاہور میں۔ بہرحال معذرت خواہ ہوں۔

میں اس سے پہلے الاقربا کہیں نہ کہیں سے مانگ کر، خرید کر یا مستعار لے کر پڑھتا تھا۔اب آپ کی عنایت سے خود کفیل ہو گیا ہوں اور مانگنے والوں اور مستعار لے کر پڑھنے والوں کی مدد کرنے کا اہل ہوں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو بہترین اجر سے نوازے۔

الاقرباء اردو ادب کے اساتذہ وطلبا کے لیے یکساں مفید ہے۔اس میں شامل مضامین افسانے، غزلیں، نظمیں وغیرہ مدیر کے حسنِ ادارت اور اعلیٰ ذوق کی غماز ہیں۔ یہ چند کلماتِ تشکر خلوصِ دل سے پیش کرتا ہوں۔اور آپ کی درازی عمر اور صحت کے لیے دعا گو ہوں۔

خبرنامہ

الاقرباء فاؤنڈیشن

(اراکین کے لئے)

شہلا احمد

احوال و کوائف

جناب محمد اویس جعفری کے فرزند ارجمند کی شادی خانہ آبادی:

امریکہ (سیاٹل) میں 'الاقرباء' کے خصوصی رابطہ کار جناب محمد اویس جعفری کے فرزند ارجمند عزیزی عرفان محمد جعفری کا نکاح مسنونہ و شادی مورخہ ۲ دسمبر ۲۰۱۰ء کو جناب شاہد عزیز کی دختر نیک اختر عزیزہ عروبہ شاہد سے بخیر و خوبی انجام پائی، معروف عالم دین مولانا منظور احمد کاشمیری نے نکاح پڑھایا۔ آپ نے تلاوتِ کلام پاک کے بعد خطبہ ارشاد فرمایا اور پھر عقدِ مسنونہ ادا کیا گیا۔

اویس جعفری صاحب نے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔ دلہا کی جانب سے جناب جعفری و بیگم مسرت جعفری نے دلہن کے اہلِ خانہ کو بری پیش کی اور دلہن کی جانب سے جناب شاہد عزیز و بیگم بلقیس شاہد نے دلہا کے اہلِ خانہ کو تحائف پیش کیے۔ تقریب رات بارہ بجے اختتام کو پہنچی

تقریب کا اہتمام پُرتکلف انداز لیکن اسلامی شعائر کے مطابق کیا گیا تھا۔ مہمانوں کی ایک بڑی تعداد جانبین کی طرف سے شریک محفل تھی جو اعزاء و اقارب اور احباب پر مشتمل تھی۔ شرکاء کے چند اسمائے گرامی یہ ہیں۔ بیگم عارفہ صلاح الدین، بیگم مہ جبیں علاؤالدین۔ جناب ارشد اقبال و بیگم زریں ارشد۔ جناب پرویز و بیگم پرویز۔ صاحبزادہ عماد و بیگم شہناز عماد۔

جناب اسلم صدیقی۔ جناب سولیجہ و بیگم سارہ سولیجہ ۔ جناب عمران صدیقی و بیگم صبا صدیقی، جناب اویس صدیقی و بیگم رخسانہ صدیقی، جناب محمد علی خاں و بیگم رخسانہ خان، محترمہ مسرت بانو۔ جناب منظور احمد و بیگم عظمیٰ احمد، جناب مظہر علی خاں و بیگم منزہ خاں اور جناب جمیل الرحمٰن کاکاخیل۔

○ ولادتِ فرزند پر تہنیت:

ڈاکٹر سہیل محمد جعفری و بیگم بشریٰ جعفری کو جو امریکہ میں سکونت پذیر ہیں اللہ تعالیٰ نے مورخہ ۲۱ ستمبر ۲۰۱۰ء کو چاند سے بیٹے سے نوازا ہے جناب محمد اویس جعفری و بیگم مسرت جعفری کو اس نسبت سے دادا۔ دادی بننے پر ادارہ سہ ماہی الاقرباء ہدیۂ تہنیت پیش کرتا ہے۔
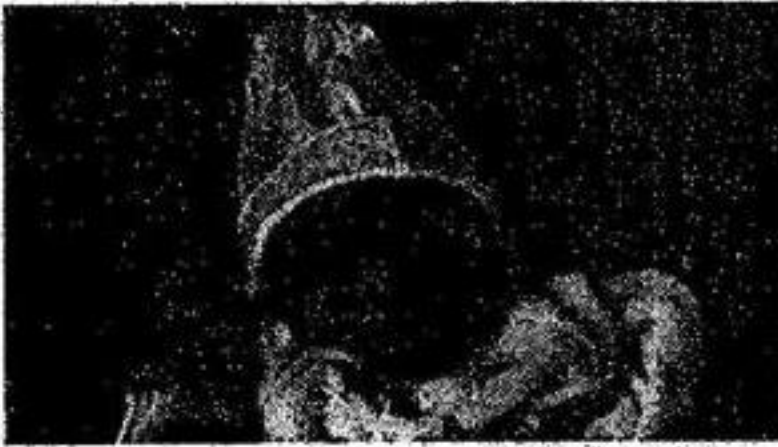
نومولود کا نام محمد یوسف جعفری رکھا گیا ہے۔ ادارہ اس ساعتِ سعید پر نومولود کی خوش نصیبی و درازی عمر کے لیے دعا گو ہے اور دادا۔ دادی کے ساتھ نانا۔ نانی جناب و بیگم محمد اسلم اور جملہ اہلِ خاندان کو دلی مبارکباد پیش کرتا ہے۔

○ ڈاکٹر محمد ایوب علوی و بیگم کا دورۂ برطانیہ اور واپسی:

گزشتہ دنوں سکریٹری جنرل الاقرباء فاؤنڈیشن ڈاکٹر محمد ایوب علوی اور بیگم نعیم فاطمہ علوی اپنے چچا محترم کی عیادت و مزاج پرسی کے لیے کہ وہ ان دنوں علیل ہیں، انگلینڈ تشریف لے گئے تھے۔ انہوں نے دو ماہ (۲۱ دسمبر ۲۰۱۰ء ۔ ۲۱ فروری ۲۰۱۱ء) کا عرصہ زیادہ تر اپنے چچا محترم اور اپنے بچوں فہد علوی، محمد ہارون علوی اور عزیزہ سارہ علوی کے ساتھ گزرا جو وہاں زیرِ تعلیم ہیں۔ صرف نعیم فاطمہ صاحبہ دو ہفتہ کے لیے لندن جا سکیں۔ مورخہ ۲۱ فروری ۲۰۱۱ء کو وہ وطنِ عزیز واپس تشریف لے آئے ہیں۔ ہماری دعا ہے اللہ تعالیٰ ان کے چچا محترم کو شفائے کاملہ کے ساتھ عمرِ دراز عطا فرمائے اور بچوں کو اعلیٰ ترین کامیابیوں سے ہمکنار کرے۔ آمین ثمہ آمین۔۔

○ شادی خانہ آبادی :

الاقرباء فاؤنڈیشن کے ممبر جناب محمد جمال خاں و بیگم حنا جمال کی صاحبزادی اور راقم الحروف (شہلا احمد) کی بھتیجی عزیزہ رابعہ جمال الحمدللہ مورخہ ۱۰ فروری ۲۰۱۱ء بروز جمعرات رشتۂ ازدواج میں منسلک ہوگئیں۔ ان کے شریکِ حیات عزیزی محمد فیصل وارث اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں اور ایک بین الاقوامی کمپنی سے وابستہ ہیں جب کہ وہ خود پاکستان اسٹیٹ آئل (PSO) میں ایگزیکٹو انجینئر کے عہدہ پر فائز ہیں۔ ادارہ سہ ماہی الاقرباء نیز فاؤنڈیشن اس خوبصورت اور مبارک بندھن پر جناب جمال ناصر خان، بیگم ناصر جمال، دولہا دولہن اور جملہ متعلقین کو مبارکباد پیش کرتے ہوئے دعا گو ہیں کہ اللہ تعالیٰ زندگی کی ان حسین راہوں پر عزیزہ رابعہ و فیصل کو شاد و آباد رکھے۔ آمین ثمہ آمین۔

○ ولادتِ باسعادت پر تہنیت :

ممبر مجلس منتظمہ الاقرباء فاؤنڈیشن جناب و بیگم سید حسن سجاد کے صاحبزادے عزیزی محسن حسن کو اللہ تعالیٰ نے پیاری سی بیٹی سے نوازا ہے۔ پیدائش کینیڈا میں ۲۳ جنوری بروز اتوار ۲۰۱۱ء ہوئی۔ نومولود کا نام عیشل محسن رکھا گیا ہے۔ ادارہ سہ ماہی الاقرباء اس پرمسرت موقع پر جناب و بیگم حسن سجاد، عزیزی محسن و فریحہ اور جملہ متعلقین کو دلی مبارکباد پیش کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نومولود کی عمر دراز کرے اور صالح و نیک بنائے آمین ثمہ آمین۔

○ سانحۂ رحلت:

محترمہ حنا جمال، اہلیہ جمال ناصر خان جو کافی عرصہ سے علیل تھیں ۲۱ مارچ ۲۰۱۱ء کو کراچی میں انتقال کر گئیں۔ اناللہ و انا علیہ راجعون۔ ادارہ 'الاقرباء' اس سانحہ پر مرحوم کی مغفرت اور پس ماندگان کو اس صدمہ کو برداشت کرنے کے لیے دعا گو ہے اور محترم شہلا احمد صاحبہ کی خدمت میں دلی تعزیت پیش کرتا ہے جن کی وہ حقیقی بھابی تھیں۔

O بیگم طلیعہ آفتاب کی بیرونِ ملک سے واپسی :

گزشتہ دنوں بیگم طلیعہ آفتاب صاحبہ دوبئی اور دوہا (.U.A.E) اپنے صاحبزادوں ریحان سید اور عمران سید کے پاس تشریف لے گئی تھیں۔ تقریباً پانچ ماہ پر محیط یہ وقت انہوں نے اپنے بچوں اور اہل خانہ کے درمیان خوشیوں، مسرتوں کے پھول چنتے سیر و تفریح میں گزارا۔ مورخہ ۷ فروری کو آپ واپس تشریف لے آئی ہیں۔

O سانحۂ رحلت جناب محمود اختر سعید، مدیر سہ ماہی الاقرباء:

انتہائی دکھ اور افسوس کے ساتھ یہ خبر رقم کی جاتی ہے کہ جناب محمود اختر سعید، مدیر سہ ماہی الاقرباء مورخہ ۸ جنوری بروز ہفتہ ۲۰۱۱ء قضائے الٰہی سے وفات پا گئے۔ اناللہِ وانا الیہ راجعون۔ وفات سے پہلے وہ انگلینڈ اپنے صاحبزادوں اور ان کے اہل خانہ کے پاس تشریف لے گئے تھے اور تقریباً چھ ماہ وہاں قیام کر کے مورخہ ۲۶ دسمبر ۲۰۱۰ء کو واپس تشریف لائے تھے۔ عارضۂ قلب اور ذیابیطس کے مریض ہونے کے باوجود ان دنوں وہ بالکل چاق و چوبند اور معمول کے مطابق تھے۔ لیکن ۸ جنوری ۲۰۱۱ء کو صبح ناشتہ کے بعد ان کو طبیعت میں اچانک گرانی سی محسوس ہوئی تو ان کی بہو نے انہیں آرام کرنے کے لیے بستر پر لٹا دیا۔ بظاہر انہیں کوئی تکلیف یا سینے میں درد وغیرہ محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ صرف سانس پھول رہا تھا۔ چنانچہ انہیں 'پمس' لے گئے جہاں ان کے کئی ٹیسٹ ہوئے جو ٹھیک تھے۔ احتیاطاً ڈاکٹرز نے انہیں CCU میں داخل کر لیا۔ تکلیف اب بھی کوئی نہیں تھی لیکن رات کو ساڑھے آٹھ بجے اچانک بڑی خاموشی سے وہ اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے۔

محمود سعید صاحب نہایت خوش اخلاق، پر خلوص اور دوست نواز تھے۔ صبر و شکر آپ کی شخصیت کا خاصہ تھے۔ ہر ایک سے محبت و شفقت اور اپنائیت سے پیش آتے اور کبھی کسی سے کوئی شکایت نہ کرتے۔ یہاں تک کہ آخری وقت بھی انہوں نے کسی کو کوئی تکلیف دی نہ خدمت کا موقع دیا۔۔۔ پسماندگان میں انہوں نے پانچ بیٹے اور دو بیٹیاں چھوڑی ہیں۔ ایک بیٹی اور اہلیہ پہلے ہی

وفات پا چکی ہیں۔ چار بیٹے انگلینڈ اور کینیڈا میں رہائش پذیر ہیں۔ جب کہ ایک صاحبزادے پاکستان میں ہیں جن کے پاس وہ رہتے تھے۔ سب بچے شادی شدہ اور صاحبِ اولاد ہیں۔

سہ ماہی الاقرباء سے ان کی وابستگی دیرینہ تھی مدیر کی حیثیت سے ان کی خدمات ہمیشہ یاد رکھی جائیں گی۔ ادارہ سہ ماہی الاقرباء اور تمام اراکین فاؤنڈیشن ان کے بچوں اور دیگر اہل خانہ و متعلقین کے غم میں برابر کے شریک ہیں۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کو غریقِ رحمت کرے اور درجات بلند کرے اور جملہ لواحقین کو یہ صدمہ عظیم برداشت کرنے کی طاقت عطاء فرمائے۔ آمین ثمہ آمین۔

○ جناب مدثر اللہ سالاری کو صدمہ:

الاقرباء فاؤنڈیشن کے معتمد مالیات اور رکن انتظامیہ جناب مدثر اللہ سالاری کے ماموں سید اخلاق حسین مورخہ ۲۵ فروری بروز جمعۃ المبارک ۲۰۱۱ء انتقال فرما گئے۔ انا للّٰہ و انا الیہ راجعون۔ آپ ۱۹۹۱ء میں کہوٹہ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ سے ریٹائر ہوئے تھے جہاں وہ ڈپٹی ڈائریکٹر کے عہدہ پر فائز تھے وہ عارضہ قلب میں مبتلا تھے۔ اچانک تکلیف بڑھنے پر KRL ہاسپٹل لے گئے۔ جہاں وہ جانبر نہ ہو سکے اور خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ پسماندگان میں انہوں نے اہلیہ کے علاوہ دو بیٹے چھوڑے ہیں۔ ایک صاحبزادے سعودی عرب میں بغرض ملازمت قیام رکھتے ہیں۔ جبکہ دوسرے اڈیالہ روڈ راولپنڈی میں والدہ کے ساتھ رہائش پذیر ہیں۔

ادارہ سہ ماہی الاقرباء اور اراکین فاؤنڈیشن ان کے غم میں شریک ہیں۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کو غریقِ رحمت کرے اور جنت الفردوس میں بلند درجات عطاء فرمائے اور جملہ لواحقین و پسماندگان اور ان کی شریک حیات کو یہ صدمہ عظم برداشت کرنے کی طاقت عطاء فرمائے اور صبر جمیل سے نوازے آمین ثمہ آمین۔

○ سیدہ ماہ نور فاطمہ اور سیدہ تزئین منصور کی شاندار کامیابی:

☆ سیدہ ماہ نور فاطمہ نے جو سید منور عالم رکن الاقرباء فاونڈیشن کی ہونہار صاحبزادی ہیں

گزشتہ کی طرح اس سال بھی جماعت ششم کے سالانہ امتحان میں پہلی پوزیشن حاصل کی ہے انہوں نے ۷۰۰ میں سے ۶۵۹ نمبر حاصل کیے ہیں۔

☆ سیدہ تزئین منصور نے جو سید فرحان منصور رکن الاقرباء فاؤنڈیشن کی صاحبزادی اور جناب سید منصور عاقل کی پوتی ہیں گرائمر اسکول لاہور میں Maths کے مقابلے میں اول پوزیشن حاصل کی ہے۔

ادارہ ان دونوں ذہین اور ہونہار طالبات اور اُن کے اہلِ خانہ کو مبارکباد پیش کرتا ہے اور آئندہ کی کامیابیوں کے لیے دعا گو ہے۔

نعیم فاطمہ علوی

برطانیہ کی سیاحت۔۔ تہذیبوں کے درمیان فاصلے

ائر بلیو کا جہاز اڑتے ہی اندھرا چھانے لگا۔ ہوا کے دوش پر مختلف شہروں کی روشنیاں یوں لگ رہی تھیں جیسے آسمان سے ستارے زمین پر اتر آئے ہیں۔ جہاز تیزی سے اپنی منزلیں طے کرتا ہوا جا رہا تھا میں نے کھڑکی سے باہر دیکھنا شروع کر دیا۔ ائر بلیو ترکمانستان، افغانستان، آذر بائیجان، جارجیا سے ہوتا ہوا ترکی کی طرف عازم سفر تھا۔ ایک مدھم سی اورنج رنگ کی روشنی کی لکیر افق پر نظر آ رہی تھی۔ جو کہ ہمارے ساتھ ساتھ ہی ٹھہری ہوئی محسوس ہوئی۔ کچھ دیر بعد یہ روشنی کی لکیر اور روشن ہو گئی۔ اور میں افق کے اس منظر کو اپنی آنکھوں میں جذب کرنے کی کوشش کرتی رہی۔ زمین پر پھیلی ہوئی روشنیاں مختلف ملکوں کی نشاندہی کر رہی تھیں چشم تصور میں یہ منظر دیو مالائی قصوں کی طرح محسوس ہوتے رہے یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی پری پرستان کی سیر کو نکلی ہو۔ مناظر کی تبدیلی میں ایک اور منظر نظر آیا۔ آبنائے فاسفورس میں چودھویں کا چاند مدوجزر بنا رہا تھا کہ اچانک پائلٹ نے اعلان کیا ہم Trabzon Havalimani ائر پورٹ پر اترنے والے ہیں۔ یہ منظر میں نے رات کو چودھویں کے چاند کی روشنی میں بھی دیکھا اور واپسی پر دن کی روشنی میں بھی۔ بلاشبہ ایسا حسین منظر چشم تصور کے لیے قدرت اور انسانی مہارت کا حسین ترین تحفہ ہے۔

مانچسٹر ائر پورٹ سے رشتے داروں کے جھرمٹ میں باہر آئے۔ اب کی بار میں نے اپنے ذہن کو وسعت دیکر ہر تعصب سے پاک کر لیا تھا۔ تعصب کی عینک اتار کر رشتے داروں عزیزوں۔۔ برطانوی لوگوں اور برطانوی تہذیب دیکھنے کا ارادہ بہت پختہ تھا۔ کسی بھی سابقے لاحقے کے بغیر یہ مناظر نکھرے نکھرے سے نظر آنے لگے۔

علوی[1] صاحب کے چھوٹے بھائی ظفر اور رمیضہ کے نرم اور گرم گھر نے آغوشِ مادر کی طرح اپنی آغوش میں لے لیا۔ بیڈروم میں چھت کی کھڑکیوں سے نرم گرم بستر پر لیٹے ہوئے طلوعِ صبح کا منظر میں کبھی نہیں بھول سکتی۔ پہلی نظر آسمان پر پڑی تو طبیعت میں سرشاری کی ایک خاص کیفیت پیدا ہوگئی۔ صبح آنکھ کھلی تو پورا منظر برف سے ڈھکا ہوا تھا۔ باہر وسیع لان پر بچھی ہوئی سفید برف کی چادر، ٹنڈ منڈ درختوں کی شاخوں سے ٹپکتے ہوئے برف کے گولے بہت ہی بھلے لگ رہے تھے میں اس اجلے منظر کو بہت دیر تک دیکھتی رہی۔

یورپ میں ارتقا کے عمل کے دوران خاندانی نظام بھی شاید انسانی آزادی کی راہ میں حائل ہوتا تھا لہٰذا اُس کو بھی توڑ پھوڑ دیا گیا۔ اس نظام میں توانا اور جوان جسموں کی روح اور بدن کے لئے تمام سہولیات ہیں مگر بڑھاپے کے لیے اولڈ ہوم۔۔۔ اولڈ ہومز میں بھی ہر قسم کی سہولیات مہیا کی گئی ہیں۔ مگر مجھے تو یہ زندوں کا خوبصورت قبرستان محسوس ہوا جہاں تن آسانی کے لیے سب کچھ ہے۔ مگر انسانوں کے جذبوں کی کوئی قدر نہیں۔۔۔ بت پرستی کی حد تک بچوں کی تصویریں رکھ کر پوجنے والے بوڑھے دروازے کی طرف دیکھتے رہتے ہیں۔ کاش کہیں سے کسی بچے کی آواز آجائے۔ میں نے اولڈ ہوم کے مختلف کمرے دیکھے جہاں بوڑھے بات کرنے کے لیے ترس رہے تھے۔ اُن کے چہروں کی چمک میری موجودگی سے دوچند ہو جاتی۔ وہ مسکرا مسکرا کر ہاتھ ہلا رہے تھے۔ اور میں اُن کے لہجوں سے نابلد اُن کے چہروں کے اتار چڑھاؤ کی زبان سمجھ رہی تھی۔ دل چاہتا تھا کاش میں ان کے پاس بیٹھ کر اُن سے باتیں کر سکتی، پوچھ تو لیتی۔ آپ کا زندگی کے بارے میں کیا خیال ہے۔؟

مہد سے لے کر لحد تک انسان کو انسان کی ضرورت ہوتی ہے ان سے دوری ناقابلِ برداشت ہوتی ہے۔ مگر جہاں اپنے اپنے نہ رہیں بیگانوں کا روپ دھار لیں۔ اُن میں احساس، محبت، الفت، شفقت اور ہمدردی نہ رہے تو اُن اپنوں سے تو وہ بیگانے اچھے جن میں ہمدردی کا

---

[1] مصنفہ کے شوہر

جذبہ تو ہوتا ہے۔ مصنوعی ہی سہی۔۔ ملازمت کا تقاضا ہی سہی۔۔۔

مجھے علوی صاحب کے کزن افتخار بھائی نے ایک انگریز عورت کا قصہ سنایا جس نے اپنے پوتے کی مشرف بہ اسلام ہونے کی خواہش کا اظہار کیا۔ اس معصوم خواہش کی تفصیل پوچھنے پر پتہ چلا کہ اس انگریز عورت کے اڑوس پڑوس میں مسلمان رہتے تھے اور وہ دیکھتی مسلمان بزرگوں کے پوتے پوتیاں انگلی پکڑ کر اپنے دادا دادی کو روز شام کو سیر کرواتے اُسے بہت اچھا لگتا۔ لہٰذا اُس نے اس تہذیب کو پسند کیا اور خواہش کا اظہار کیا کہ کاش میرا پوتا بھی اسلام قبول کر لے اور اسی طرح بڑھاپے میں میرا عصا بن جائے۔

یہاں پاکستانی نژاد لوگوں میں احساس برتری (یہ بھی احساسِ کمتری ہی کی ایک شکل ہے) بہت پایا جاتا ہے جس گھر میں بھی گئے کسی نہ کسی طریقے سے لوگوں کو یہی کہتے سنا پاکستان کی نسبت برطانیہ میں رہنا اعزاز کی بات ہے۔ اُن کی کڑوی کسیلی باتیں پاکستان سے اُن کے باقیماندہ تعلق کی عکاس تو تھیں مگر اُن کی اپنی نسل کے لیے پاکستان سے محبت کے جذبے میں دراڑیں ڈال رہی تھیں۔

ہم نے ہولی ہل اور برمنگھم کے علاقے دیکھے دور دور تک پھیلا ہوا سبزہ۔ ہرے بھرے کھیت کھیتوں میں گھومتی پھرتی بھیڑیں کہیں بھی گندگی کا کوئی نشان نہیں۔ ایک پارک میں گھومتے ہوئے میرے دیور ظفر نے میری توجہ ایک انگریز میاں بیوی کی طرف مبذول کروائی جو اپنے کتے کو گھمانے لائے تھے پارک میں کتے کی غلاظت کو انہوں نے ٹشو پیپر میں لپیٹ کر جیب میں ڈال لیا۔ تاکہ پارک گندا نہ ہو اس منظر نے کئی دن تک میری طبعیت کو مکدر کیے رکھا۔

اگلے ہفتے ہم اپنی بیٹی سائرہ سے ملنے لندن چلے گئے جو ہرٹ فورڈ شائر (Hertford shire) یونیورسٹی میں زیر تعلیم ہے۔ لندن میں چند دن کا قیام سرسری جائزہ ہی تھا۔ واپسی پر ہم نے کیمبرون اور کیمبرج یونیورسٹی دیکھی۔ کیمبرون کا علاقہ بھی بہت ہی خوبصورت تھا۔ ایک چھوٹا سا قصبہ ہے جو کیمبرج یونیورسٹی کے مضافات میں ہے۔ اتنا اجلا نکھرا، صاف شفاف قصبہ میں نے

پہلی دفعہ دیکھا یہاں بھی بڑے شہروں کی طرح ہر سہولت تھی۔ خرید و فروخت کے لیے اسٹور، سکول، تفریحی مقامات پارک وغیرہ۔ یہاں علوی صاحب کی ایک کزن سے ملنے گئے جو بہت ہی خوبصورت فائیو سٹار ہوٹل کی طرح سجے گھر میں اکیلی رہتی ہیں۔ وہ کافی بیمار تھیں اور زیادہ چل پھر بھی نہیں سکتی تھیں، اُن کا گھر ہر قسم کی سہولتوں سے آراستہ تھا۔ تین بیٹیوں میں سے دو بیٹیاں دائیں بائیں رہتی ہیں، داماد بیٹیاں اور نواسی ہر طرح کا خیال رکھتیں ہیں۔ ان کا اکیلے رہنا اُن کی اپنی خواہش کا تقاضا تھا۔ جنہیں بچوں نے پورا کیا۔ مگر وہ ہر وقت بچوں کے قرب میں تھیں وہ اپنے ہر مہمان کو خوش آمدید کہتیں اور اُن سے کہتیں فریج کھولو۔ جو جی چاہتا ہے کھاؤ اور برتن دھو کر رکھ دو۔ انہوں نے بتایا میری بیٹیاں فریج بھر جاتی ہیں اور میرے مہمان اپنی مدد آپ کے تحت کام کرتے ہیں۔ وہ اپنے گھر میں تھیں اور مکمل آزاد بھی تھیں۔ بلاشبہ مغربی اور مشرقی تہذیب کے امتزاج کا یہ بڑھاپا قابل رشک تھا۔

میرا دیور ظفر اقبال اپنی دفتری مصروفیات سے فارغ ہوا تو لندن کی تفصیلی سیر کا منصوبہ بنایا انٹرنیٹ پر ہیتھرو ہوٹل کے قریب کمرے بک کروائے اور مختلف جگہوں کے ٹکٹ خرید کر گھر بیٹھے ہی پوری تفریح کا انتظام کر لیا گیا۔

ایک آرام دہ ہوٹل میں سامان رکھنے کے بعد ہم نے گاڑیاں پارک کیں دن بھر کے لیے پاس خریدے مختلف بسوں۔ ٹیوب اسٹیشنوں اور کہیں پیدل چل کر سب سے پہلے مادام تصاؤ گئے۔ ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ موسم بھی ٹھنڈا تھا۔ مگر پیدل چل کر لندن گھومنے کا لطف ہی کچھ اور ہے۔ مادام تصاد کے اندر داخل ہوئے تو میں واقعی کچھ دیر کے لیے مبہوت ہو گئی۔ انسان کے ہاتھوں سے بنائے ہوئے حسین مجسمے جنہیں دیکھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ انسان کچھ دیر کے لیے سانس لینا بھول جاتا ہے۔ مجسموں کے چہروں پر تأثرات لاجواب۔ اللہ روح ڈال دے تو وہ اُسی وقت اٹھنا بیٹھنا چلنا پھرنا شروع کر دیں انہیں دیکھ کر انسان سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ مجسمہ سازی کا یہ ہنر جب اللہ نے انسان کو ودیعت کیا ہوگا اور جب انسان نے پہلا مجسمہ تراشا ہوگا تو خود بھی حیران ہو گیا ہوگا۔ اور اُسی

حیرت کے کسی پہلو میں اُس مجسمے کو خدا بنا بیٹھا ہو گا۔ مجسمے کے ساتھ تصویر کھنچوانے والا ہر جیتا جاگتا شخص مجسمہ لگ رہا تھا۔ بعض اوقات تصویر کھنچوانے والا شخص اچانک حرکت میں آتا تو ساتھ کھڑا ہوا انسان چونک اُٹھتا۔

اُس کے بعد ایک ڈراؤنا سکیشن تھا جہاں جانا اور پھر وہاں سے بغیر خوفزدہ ہوئے گزر جانا بڑے دل گردے کا کام تھا۔ اس کے بعد ٹرین میں برطانیہ کی ترقی کے سو سال کا سفر بہت ہی خوبصورتی سے دکھایا گیا تھا۔ مادام تصاد سے نکل کر پیدل چلتے ہوئے ویسٹ منسٹر، کووینس گارڈن، اور آکسفورڈ سٹریٹ کی طرف گھومتے رہے ان سڑکوں پر لوگوں کا بے تحاشا ہجوم تھا۔ ہر شخص اپنی منزل کی طرف رواں دواں کسی کو کسی سے کوئی سروکار نہیں۔ ٹریفک بھی رواں دواں پیدل سڑک کراس کرنے والے اپنے حقوق سے آگاہ گاڑیاں اپنے فرائض سے باخبر خاموشی کی زبان، قانون کی عملداری۔۔۔ گلیوں میں گھوم پھر کر اندرون لاہور میں گھومنے پھرنے کا احساس ہو رہا تھا یہاں صرف فرق یہ تھا کہ لوگ سلجھے ہوئے اپنے کام سے کام رکھنے والے، قانون کے رکھوالے، بے فکر مطمئن، پرسکون، ہر رنگ ہر نسل مذہب اور ہر زبان کے بولنے والے تعصب یا اونچ نیچ کے تصور سے بیگانہ ہو کر سکون سے گھوم رہے تھے۔ لگتا تھا انہوں نے اپنے راستے کے ہر کانٹے کو پلکوں سے چن کر یہ نگر آباد کیا ہے۔ سڑکوں پر کوئی ایکسیڈنٹ نہیں دیکھا۔ لوگ پی پلا کر سڑکوں پر آتے ہیں۔ مگر دوسروں کو نقصان نہیں پہنچاتے شراب کی بدبو سے متعفن سانسیں لندن کی فضا کو مکدر نہیں کرتیں۔ خدا بھی مہربان ہے بارش سے باقی ماندہ گندگی دھل جاتی ہے۔ سڑکیں صاف ہو جاتی ہیں۔

آرام دہ ہوٹل میں قیام کے بعد ہمارا قافلہ پھر سے رواں دواں تھا۔ آج بھی ہلکی پھلکی بارش ہو رہی تھی۔ مگر یہ بارش کسی طرح بھی ہماری راہ میں حائل نہ ہوئی۔ یہاں آکر احساس ہوتا ہے کہ اپنے ملک میں اچھا خاصا رہتے رہتے اچانک آپ غریب ہو گئے ہیں۔

یہاں سڑکوں پر تنہا نوجوان جوڑوں کو بے لگام دیکھا۔ یہاں مسلمان اور خصوصاً ایشین

تہذیب کے علمبردار اپنی جوان بیٹی کے ساتھ سڑک پر گھوم رہے ہوں تو گردوپیش سے چشم پوشی کرنا پڑتی ہے۔ جنسی آزادی کے لحاظ سے تو یہ پتھر کے زمانے کے لوگ لگتے ہیں۔ بلکہ جانوروں سے بھی بدتر۔۔ بے لگام جسمانی آزادی۔۔ سڑکوں پر بے حیائی اور بے غیرتی کے عریاں نشان۔۔ ہمارے ایشین جو اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلستان جاتے ہیں وُہ بھی اس بے راہ روی کا شکار ہو جاتے ہیں اور ڈگری کے ساتھ بے شمار اخلاقی برائیاں لے کر واپس لوٹتے ہیں۔ کاش ہم اپنی تہذیب کی بہتری کا سوچیں۔ یہاں مجھے علوی صاحب کی کزن صائمہ اور اظہر جیسے کردار بھی نظر آئے جو اپنے گھر سے نکل کر کمیونٹی اور چیرٹی کے بہت سے کام کرتے ہیں ڈہ لوگ نوجوان مسلمان بچوں کو ان اخلاقی برائیوں سے بچانے کے لیے بہت کام کر رہے ہیں۔ نہ صرف انگلستان میں بلکہ پاکستان سے بھی گہرا تعلق رکھے ہوئے ہیں۔ میں سلام پیش کرتی ہوں ایسے لوگوں کو جن کے اندر معاشرے کی اصلاح کا پہلو ہمیشہ غالب رہتا ہے۔ مختلف راستوں سے ہوتے ہوئے دریائے تھیمز (Thames) پر پہنچے تو تہذیب سے بے نیاز کبوتروں کی بھرمار نے سڑک کو آلودہ کیا ہوا تھا۔ میرے پاس کھڑی عورت نے ایک کبوتر کو تھوڑی سی بریڈ ڈالی۔ کبوتر نے فوراً اٹھالی اور کھالی اور اُس عورت کے اور قریب آ گیا۔ اتنے میں ایک اور کبوتر قسمت آزمائی کے لیے اُس خاتون کے قریب آیا تو پہلا کبوتر جو استفادہ کر چکا تھا اُسے اپنا مفاد خطرے میں محسوس ہوا اور اُس نے پہلے کبوتر کو چونچیں مارنا شروع کر دیں۔ اتنے میں بہت سارے اور کبوتر بھی ہلا گلا دیکھ کر قریب آ گئے۔ اور بریڈ کے چھوٹے سے ذرے کا حصول ان کے لیے لڑائی جھگڑے اور چھینا جھپٹی کا باعث بن گیا۔ میرے دیور کی برگر فیملی نے بالآخر دریائے تھیمز کے کنارے میکڈونلڈ ڈھونڈ لیا۔ اور ہم دریائے تھیمز کے کنارے پیدل چلتے چلتے بے شمار سوغات کی دکانوں کے قریب سے گزرے یہاں سڑکوں پر جگہ جگہ سٹریٹ پرفارمرز کے دلچسپ کردار بھی نظر آئے جو دلچسپ بھی تھے اور حیرت انگیز بھی دریا میں گھومتے پھرتے چھوٹے چھوٹے جہاز اور کشتیاں توجہ کا باعث بن رہی تھیں اتنے میں جنید چھوٹے جہاز کے ٹکٹ لے آیا اور کچھ ہی دیر بعد ہم اس جہاز کے عرشے پر بیٹھے

گردو پیش کی عمارتوں اور دریا کی اچھلتی کودتی لہروں سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ ڈھلتی شام میں اتنا خوبصورت نظارا میری آنکھوں نے کبھی نہیں دیکھا، یہاں ہر سال لاکھوں سیاح آتے ہوں گے اور اپنے حصّے کا لطف کشید کرتے ہوں گے میں بھی اُس حسن کو چشم تصور میں محفوظ کر لینا چاہتی تھی۔ مگر پھر بھی یہ حسن سنبھالے نہیں سنبھلتا تھا۔ ناپائیدار انسان یہ پائیدار حسن تخلیق کر کے امر ہو گئے۔

دوسری طرف ہم ملکہ کے ٹاور آف لندن کی طرف اتر گئے جہاں سات سو سال تک ملکہ کی کئی پشتیں بکنگھم پیلس بننے سے پہلے رہیں۔ سڑکیں ناپتے ہوئے ہم اُس پل کی طرف چلے گئے جو بڑے بڑے بحری جہاز آنے پر اپنی جگہ سے سرک کر راستہ دے دیتا ہے۔

یہیں ایک عجیب واقعہ ہوا میری بیٹی سائرہ اپنی کزن دانیہ کے ساتھ قافلے سے ذرا پیچھے رہ گئی چیخنے کی آواز پر جب ہم لوگ متوجہ ہوئے تو پتہ چلا اس کے پاس کیمرے کا بیگ تھا جو اُس نے کمر پر لٹکایا ہوا تھا۔ ایک گورے لڑکے نے ہاتھ ڈال کر کیمرہ نکالنے کی کوشش کی وُہ تو خدا کا شکر ہے اُس وقت بیگ سے تمام کیمرے نکال کر سب لوگوں نے گلے میں ڈالے ہوئے تھے۔

لندن میں زیرِ زمین ٹیوب اسٹیشنوں کا بچھا ہوا جال دیکھ کر انسان حیران رہ جاتا ہے۔ لوگ اپنی دُھن میں مگن بھاگے جا رہے تھے۔ نہ شور نہ ہنگامہ نہ چھینا چھپٹی نہ افراتفری، نہ ٹریفک جام، نہ پیدل گھومنے والوں کو کوئی پریشانی سب کے چہروں پر سکون، اطمینان اور ٹھہراؤ۔

ہمارا اگلا دن ہاؤس آف پارلیمنٹ میں گزرا جو ہفتے کو سیاحوں کے لیے کھول دیا جاتا ہے۔ عمارت کو دیکھ کر ہیبت طاری ہو جاتی ہے۔ اونچی چھتیں۔ کوریڈورز اور ملکہ کا دربار جو کہ ۲۲ کیرٹ سونے کا بنا ہوا ہے۔ ساتھ سونے کی ہی چھوٹی کرسیاں شہزادوں کے لیے بھی رکھی ہوئی ہیں۔ اُن بنچوں کو دیکھنے کا اتفاق ہوا جہاں لوگوں کی قسمتوں کے فیصلے ہوتے ہیں۔ یہاں گائیڈ ہمارے ہمراہ تھے یہاں سے نکلے تو پارلیمنٹ کے پیچھے چلتے چلتے بکنگھم پیلس پہنچے ڈاؤننگ سٹریٹ دیکھی۔ اور بنگالیوں کے علاقے Brick Lane میں کھانا کھایا۔

جسمانی تھکاوٹ اور ذہنی آسودگی کے اس سفر کے بعد اگلے دن ہم لوگ ہائی وے کم گئے لندن

کے قریب یہ بھی ایک خوبصورت قصبہ ہے جو پہاڑوں میں گھرا نسبتاً اونچائی پر بسا ہوا ہے۔

ائر بلیو میں واپسی کا سفر طے کرتے ہوئے میں نے ایک ہم سفر کو دیکھا جو ایک سیٹ چھوڑ کر کھڑکی کے پاس بیٹھا سو رہا تھا۔ وہ ٹانگیں پسار کر اس انداز میں بیٹھا تھا کہ اُس کا پیٹ نمایاں ہو کر ایک غبارا سا بن رہا تھا۔ تھوڑی دیر کے لیے اُس کی آنکھ کھلی تو میں نے اپنے لہجے میں شائستگی بھر کر کہا محترم اگر آپ نے سونا ہی ہے تو مجھ سے سیٹ بدل لیجیے میں کھڑکی میں
سے باہر دیکھنا چاہتی ہوں وہ کچھ دیر خاموش رہا پھر کہنے لگا میڈم مجھے سانس کی تکلیف ہے اس لیے میں ہمیشہ ونڈو کے پاس سیٹ لیتا ہوں۔ میں نے جہاز کا راؤنڈ لیا اور ایک سیدھی سادی لڑکی کے پاس بیٹھ گئی جو ڈھائی سال تک اپنے شوہر سے شادی نبھانے کے شوق میں جلتی بجھتی ناکامیوں اور محرومیوں کے ساتھ واپس میر پور جا رہی تھی۔ اُس کی دکھ بھری داستان بھی یورپ کی بے لگام آزادی۔۔۔اور نکاح کے تقدس کو ریزہ ریزہ کر کے ہوا میں تحلیل کر رہی تھی۔

بیگم طیّبہ آفتاب

''گھریلو چٹکلے''

○ **چہرے کے غیر ضروری بال صاف کرنے کے لیے:** جو کا آٹا پانی سے گوندھ کر اس کا پیڑہ بنالیں اور روزانہ چہرہ اور پیشانی پر ملیں۔ چند دن تک یہ عمل دہرانے سے بال انشاء اللہ دوبارہ نمودار نہیں ہوں گے۔

○ **بال کمزور ہوں تو:** کمزور بالوں کو مضبوط بنانے کے لیے سرسوں کے تیل میں دو چمچ تارا میرا کا تیل، تین چمچ پسا ہوا آملہ، دو چمچ کسٹرڈ آئیل اور دو چمچ دہی ملا کر رات بھر کے لیے رکھ دیں اور صبح بالوں پر لیپ کرلیں۔ انشاء اللہ بال مضبوط اور چمکیلے ہو جائیں گے۔

○ **کھٹی چیز کھانے سے دانت کھٹے ہو جائیں تو:** فوراً ہی گرم روٹی کا ٹکڑا کھالیں انشاء اللہ فوراً دانتوں کا کھٹا پن دور ہو جائے گا۔

○ **گردے کی پتھری کے لیے:** گردے کی پتھری نکالنے کے لیے مولی کے نرم پتے کھانے سے بڑا فائدہ ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ مکّی کے بال پانی میں ابال کر اس کا پانی پئیں۔ انشاء اللہ پتھری نکل جائے گی۔

○ **امراضِ قلب، ہائی بلڈ پریشر اور بے شمار بیماریوں کے لیے:** سیب قدرت کا انمول تحفہ ہے۔ جس کا استعمال انسان کو بہت سی بیماریوں سے بچاتا ہے۔ اس میں پوٹاشیم اور فاسفورس کی مقدار زیادہ جب کہ سوڈیم کی مقدار نہ ہونے کے برابر ہوتی ہے۔ لہٰذا یہ دل کی بے قاعدگی کو معمول پر لاتا ہے۔ خالص شہد کے ساتھ سیب کا استعمال ہائی بلڈ پریشر کو کم کرتا ہے۔

گردوں کو آرام پہونچاتا ہے۔اور یورک ایسڈ خارج کر کے گٹھیا کے مرض کو دور کرنے میں مدد دیتا ہے۔

O نزلہ کا بہترین علاج : اگر نزلہ ہو اور حلق میں بندش محسوس ہو رہی ہو تو ایسا کریں کہ ایک مگ پانی گرم کر کے اس میں لیموں اور شہد ملا کر پی لیں۔آپ کو فوراً ہی افاقہ محسوس ہوگا۔

O ناخن پر اگر لمبے لمبے نشانات پڑ جائیں تو: دراصل یہ جسم میں جست کی کمی کی وجہ سے ہوتا ہے۔اس کمی کو دور کرنے کے لیے Multy Vitamins کا استعمال مفید ہوتا ہے۔

O ٹی بی کے مرض کے لیے: اگر خدانخواستہ کسی کو ٹی بی کا مرض لاحق ہو جائے تو اسے چاہیے کہ وہ معمول کی دواؤں کے ساتھ ساتھ دودھ ہلدی ملا کر ضرور پیئے۔اس سے انشاءاللہ جلدی صحت یابی کا امکان بڑھ جائے گا۔

O خدانخواستہ پیشاب بند ہو جائے تو: ایسی صورت میں لیموں کو دو حصوں میں کاٹ کر اس کے بیج نکال دیں اور دونوں ٹکڑوں میں قلمی شورا بھر کر انہیں آگ پر گرم کریں۔جوش آنے پر آگ سے اتار لیں اور ٹھنڈا کر کے ناف کے آس پاس لیپ کر دیں۔انشاءاللہ فوراً ہی پیشاب آ جائے گا۔۔۔

O چوٹ لگنے پر ہلدی کا استعمال موثر ہوتا ہے: چوٹ لگ جائے تو دودھ میں ہلدی ملا کر پینے سے فوری افاقہ ہوتا ہے۔

O ہائی بلڈ پریشر فوری کم کرنے کے لیے: ایسی صورت میں ایک عدد لیموں میں شکر ملا کر روزانہ استعمال کریں۔۔بے حد فائدہ ہوگا